جرمن
ادب
پارے
مرتّبہ : ولف گینگ لینجن بوشر
ترجمہ : محمّد اسلم فرخی

جرمن ادب پارے

مُرتّبہ

ولف گینگ لینجن بوشر

ترجمہ و تلخیص

ڈاکٹر محمد اسلم فرخی

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور ، راولپنڈی ، پشاور ، حیدرآباد ، کراچی

This is an authorised, abridged Urdu translation of "Classical Readings from German Literature" compiled by Wolfgang Langenbucher, and published in collaboration between FEROZSONS LIMITED LAHORE (PAKISTAN) and HORST ERDMANN, VERLAG, TUBINGEN (GERMANY) and BASEL (SWITZERLAND).

پہلی بار ——— ۱۹۷۱
تعداد ——— ۶۰۰۰
قیمت ——— ۹٫۵۰

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ ۔ لاہور ● باہتمام عبدالحمید خان پرنٹر و پبلشر

فہرست

دیباچہ

◉

اس کتاب کا مقصد پاکستانی قاری کو جرمن ادبیات سے متعارف کرانا ہے اس میں قرونِ وسطیٰ سے موجودہ عہد یعنی بیسویں صدی کے وسط تک جرمن ادب کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ دراصل اسے جرمن فکر اور ادبی تخلیق کی چودہ سو سالہ کاوشوں کا جائزہ سمجھنا چاہیئے لیکن یہ محض ادبی تاریخ نہیں بلکہ اس کا مقصد و منشا یہ ہے کہ قاری جرمن ادب کے اعلیٰ نمونوں سے مناسب تراجم کے ذریعے پوری طرح واقف ہو سکے اور اسے زندہ حقیقت کی طرح محسوس کر سکے۔

چودہ سو سال کے طویل عرصے پر محیط تخلیقی ادب کے اس گراں بہا سرمائے سے ہم نے تقریباً ایک سو نمائندہ مثالیں منتخب کی ہیں۔ جن کا آغاز ہلڈی برنیڈ کے اس رزمیہ نغمے سے ہوتا ہے جو ساتویں صدی میں لکھا گیا تھا۔ اس نغمے میں عوامی ہجرت کے عہد کے دو افراد کے المناک مقابلے کی داستان ہے۔ انتخاب میں عہد جدید کے مشہور نمائندے مثلاً گوٹ فرائیڈ بین، بریحیٹ، فرانز کافکا اور ٹامس مان بھی شامل ہیں۔ اس میں متعدد کلاسیکی تخلیقات اس خیال سے شامل کی گئی ہیں کہ ان سے واقفیت عالمی قاری کی عام تعلیم کا جزو ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض ایسی تخلیقات بھی شامل کی گئی ہیں، جنہیں عام طور سے نظر انداز کیا جاتا ہے حالانکہ جرمن ادب کے مکمل اور بھرپور جائزے کے سلسلے میں یہ بھی صحیح نقطۂ نظر سے دیکھے جانے کی مستحق ہیں۔ اس مقصد کے لئے فلسفیوں، سیاست دانوں اور ماہرینِ قانون کو بھی شاعروں، ڈرامہ نویسوں اور رزم نگاروں کے پہلو میں جگہ دی گئی ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے بہت سے افراد کو حقیقی معنوں میں پہلی بار جرمن ادبیات سے واقف ہونے کا موقعہ ملے گا۔ اس وجہ سے عہد جدید کی تخلیقات پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور تاریخ ادب کی توضیحی تفصیل بھی شامل کی گئی ہے۔ لیکن یہ

انتخاب ان حضرات کو بھی نئی معلومات فراہم کرے گا جو جرمن ادبیات سے کسی قدر واقفیت رکھتے ہیں ۔

کتاب کا پہلا حصّہ ۷۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک کے ادبی جائزے پر مشتمل ہے اس میں قرونِ وسطیٰ کے ادب، انسان دوستی اور دورِ اصلاح کے ادب اور دورِ انتشار کے ادب کا جائزہ ہے ۔ دوسرے حصے میں ۱۷۰۰ء تا ۱۷۰۹ء کے روشن خیالی کے ادب کی تفصیل ہے ۔ اسی ادب نے کلاسیکیت کی راہ ہموار کی ۔ تیسرا حصّہ گوئٹے (۱۷۷۰ء تا ۱۸۴۰ء) پر مشتمل ہے ۔ "طوفان اور خروش" کلاسیکیت اور رومانیت اس عہد کے اسلوب کے خصوصی عناصر ہیں ۔ چوتھے اور پانچویں حصے میں انیسویں اور بیسویں صدی کے ادب کا جائزہ ہے ۔ ان میں شاعرانہ حقیقت پسندی سے اظہاریت اور رزمیہ تھیٹر تک کے تمام ادبی رجحانات کی تفصیل ہے ۔ ہر عہد کے ابتدا میں ایک تعارفی نوٹ ہے جس میں اس عہد کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں ۔ ہر مصنف کے سلسلے میں بھی توضیحی نوٹ شامل کیا گیا ہے اور منتخب ادب پاروں کا اجمالی تعارف بھی پیش کیا گیا ہے ۔ یہ توضیح و تعارف مِل جُل کر ادبی تاریخ کا ایک خاکہ مرتب کر دیتے ہیں ۔

انتخابات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جرمنی ادب کی طویل اور نمایاں روایت کا حامل ہے ۔ انسان دوستی، معاشرتی تنقید، جارحانہ اور انقلابی انداز اس روایت کی نمایاں خصوصیات ہیں ۔ "ودگل ویڈ سے لے کر برجیٹ یا کرٹ ٹوکونسکی تک ہم ایسے متعدد کرداروں سے روشناس ہوتے ہیں جنہوں نے حوصلہ مندی اور غور و فکر کے ساتھ اپنی قوت و صلاحیت، اپنے ملک کی ترقی، حالات کی بہتری اور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دی ہے اور وہ اس ضمن میں ہر نوع کی ذاتی تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں ۔

اس انتخاب میں پچھلی صدیوں کی وہ دستاویزیں شامل کی گئی ہیں جن سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ ادیب ابتدا ہی سے آزادی کے انقلابی

تصوّر اور بنی نوع انسان کے سلسلے میں ذمہ دارانہ احساسات کے حامل رہے ہیں ۔ بعد کے ادب پاروں سے وہ کش مکش پوری طرح ظاہر ہوتی ہے جو طبقۂ اُمرا اور ابھرتے ہوئے عوام میں جاری رہی ۔ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ عہد روشن خیالی کے مصنفین نے ایسا اندازِ فکر اختیار کیا تھا جو مستقبل کا نقیب تھا۔ انیسویں صدی میں سماجی عدل اور جمہوری حق خود اختیاری کے تقاضے واضح شکل اختیار کر لیتے ہیں اور آج بھی ادیب خاص طور پر اسی نکتے کو نمایاں کر رہے ہیں کہ ہر انسان کو صحیح زندگی گزارنے کا حق ملنا چاہیئے ۔

بحیثیت مجموعی یہ ادب جرمنی کی تاریخ، روح، ثقافت اور معاشرتی تغیر و تبدل کا شاہد ہے ۔ حقیقی ادب کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ اپنے عہد کے تمام مسائل و حقائق کو واضح کرتا ہو اور جمالیاتی و فنّی وجود کے گنبد عاج میں پناہ گزیں نہ ہو ۔

آج کے دور میں اقوام عالم ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتی جا رہی ہیں ۔ فاصلوں کے روایتی تصورات مٹتے جا رہے ہیں ۔ مختلف قوموں کے مزاج تاریخ اور ثقافت کو سمجھنے سمجھانے کی کوششیں تیز تر ہوتی جا رہی ہیں ۔ ہمیں اُمید ہے کہ ان حالات میں یہ کتاب پاکستانی قاری کی خصوصی دل چسپی کا سبب ہوگی اور ایک ایسی قوم کی ذہنی کیفیات اور ذہنی عمل کو سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی جو فلسفہ اور سائنس ہی میں نہیں حوصلہ مندی میں بھی خصوصی شہرت رکھتی ہے ۔

مرتب

۷۰۰ء

تا

۱۷۰۰ء
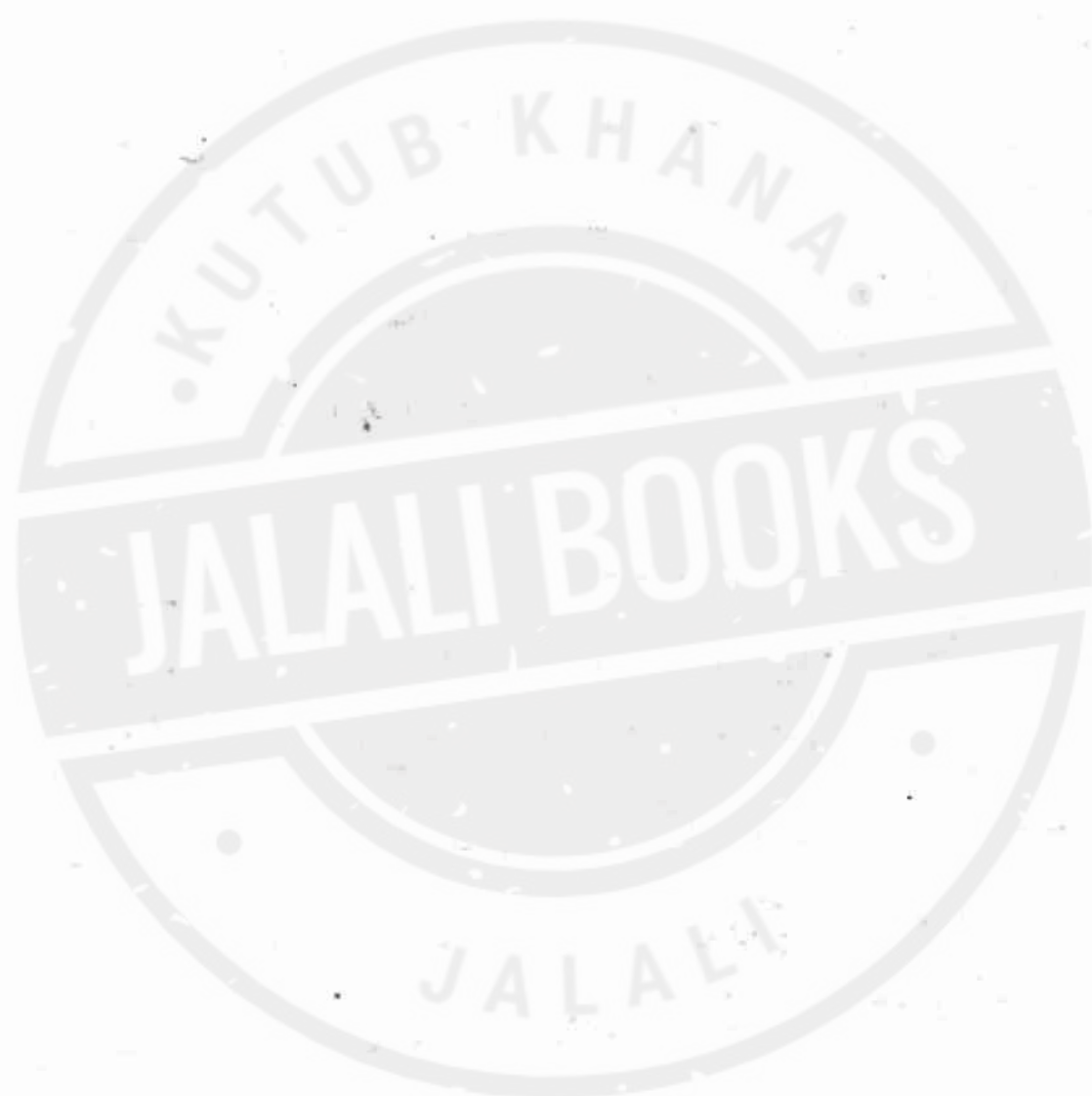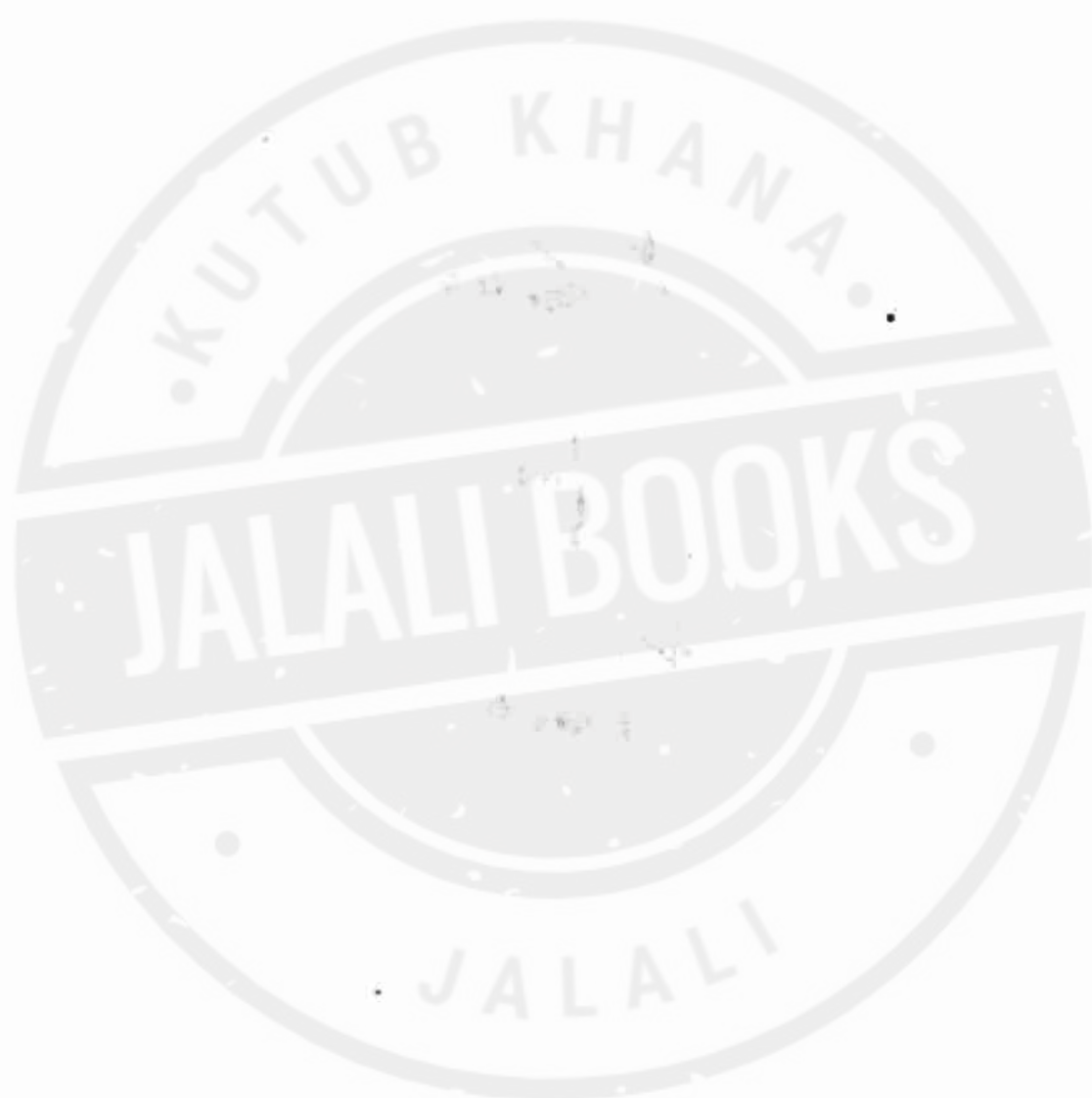
جرمن شاعری کی ابتدا آٹھویں صدی کے طیوطانی دور سے تعلق رکھتی ہے جو مسیحیت کی اشاعت سے پہلے کا دور ہے۔ اس عہد کے جرمن شاعرانہ ادب کی کوئی دستاویز محفوظ نہیں کیونکہ اس ادب کی اشاعت زبانی ہوتی تھی بعد کے زمانے میں اس کا کچھ حصّہ معرضِ تحریر میں لے آیا گیا تھا۔

اس زمانے میں جرمانوی قبیلے یورپ کے بڑے بڑے علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے اور ان کی کوئی سیاسی وحدت نہیں تھی ہاں یہ ضرور ہے کہ مشترک زبان اور تہذیب کی وجہ سے ان قبیلوں میں ہم آہنگی تھی۔ جرمانوی تصورِ حیات بہت سے دیوتاؤں پر مشتمل تھا۔ یہ دیوتا زندگی کے مختلف پہلوؤں اور عمل کا مظہر تھے لیکن ان دیوتاؤں سے بھی بلند تر وہ سخت گیر اور ناقابلِ فہم تقدیر تھی جسے قبول کرنا اور جس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا انسان کے لئے ضروری تھا۔

جرمانوی قبیلے داری نظام میں سب سے زیادہ نمایاں کردار اس شخص کا سمجھا جاتا تھا جسے مہم جُو کہنا مناسب ہے۔ اس مہم جُو کی اعلیٰ ترین خوبیاں ہمّت، قبیلے کے سردار سے وفاداری، ذاتی عزت کا احساس اور مصائب میں صبر وتحمل سے کام لینا تھیں۔ یہ مذہبی اور اخلاقی تصورات ابتدائی جرمن شاعری کی مختلف اصناف میں بہت نمایاں ہیں۔ خواہ وہ دیوتاؤں کی تعریف میں لکھے جاتے والے بھجن ہوں، شہزادوں کی مدح کیلئے ہوں یا شاندار کارناموں اور تقدیر کی نیرنگیوں کے بیان پر مشتمل رزمیہ نظمیں ہوں، یہ تصورات ہر جگہ نمایاں ہیں۔ پہلی صدی سے پانچویں صدی تک رزمیہ نظمیں خاص طور پر بہت مقبول تھیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب جرمانوی قبیلے پورے یورپ میں چکر لگا رہے تھے اور ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل ہو رہے تھے۔ اس سلسلے میں

بعض غضب ناک قبیلوں سے جنگ بھی کرنا پڑی - ان قبیلوں میں مشرق کی طرف سے زبردستی داخل ہونے والے ہن قبیلے کے لوگ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں - اس عہد کے نمایاں اشخاص کی فتح اور شکست کی روایتی داستانیں جن میں تاریخی حقایق اور روایتی شوکت وحشمت کا امتزاج پایا جاتا ہے بہت مقبول ہوئیں - یہ روایتی داستانیں بہت سے قبیلوں میں عام تھیں اور صدیوں بعد بھی رزمیہ شاعری کا موضوع بنیں - ابتدائی عہد کی جرمن رزمیہ نظم جو دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہی "ہلڈی برنیڈ کا نغمہ" ہے - اس نغمے کے کچھ حصے ہی محفوظ ہیں یہ نظم دو راہبوں نے نویں صدی کی ابتدا میں لکھی تھی - اس کی زبان کسی حد تک گنجلک ہے -

نغمے کا موضوع یہ ہے کہ ہلڈی برنیڈ برسوں بعد ایک لشکر کی سربراہی کرتا ہوا اپنے ملک واپس آرہا ہے - سرحد پر اس کی ملاقات اپنے اکلوتے بیٹے ہیڈو برنیڈ سے ہوتی ہے - جب ہلڈی برنیڈ سفر پر روانہ ہوا تھا تو ہیڈو برنیڈ بچہ تھا لیکن اس نے اپنے بیٹے کو پہچان لیا مگر ہیڈو برنیڈ جو ملک کی حفاظت پر مامور تھا باپ کو نہ پہچان سکا اور باپ کی ساری باتوں کو جھوٹ اور دھوکے بازی سمجھا - نتیجہ یہ ہوا کہ ہلڈی برنیڈ کو اپنی عزت کے تحفظ کے لئے بیٹے کو للکارنا پڑا - دونوں میں مقابلہ ہوا اور باپ نے بیٹے کو قتل کر دیا - تقدیر نے اُسے اخلاقی قدروں کی ایک الم انگیز کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا - لیکن اس نے جراتمندانہ فیصلے سے اُسے حل کر لیا - اپنی عزت کے تحفظ اور فرمانروا سے وفاداری کا احساس بیٹے کی محبت پر سبقت لے جاتا ہے - الم انگیز کش مکش کو اس طرح اور بڑھایا گیا ہے کہ ہیڈو برنیڈ اپنے انجانے باپ کے احساس عزت اور حوصلہ مندی کی بہت تعریف کرتا ہے - اس نظم میں معاف کر دینے والی عیسائی تعلیم کا کوئی سلسلہ نہیں ملتا اور نہ کسی خوشگوار انجام کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے -

آٹھویں صدی میں مشنریوں نے بڑے قاعدے قرینے سے جرمانوی لوگوں

میں عیسائیت پھیلانا شروع کی۔ شہنشاہ شارلمین (۷۶۸ - ۸۱۴) اور اس کے جانشینوں نے عیسائیت کی تبلیغ کو حکومت کی طرف سے پورا پورا سہارا دیا۔ اسی زمانے میں قبیلوں کے آباد ہو جانے اور سیاسی حد بندیوں کی وجہ سے جرمن قوم اور زبان کا تصوّر بیدار ہوا اور جرمانوی زبانوں کے مزید ارتقا سے اسے تقویت حاصل ہوئی۔ چونکہ عیسائیت اور قدیم جرمانوی تصوّرات اور اخلاقی اقدار میں نمایاں تضاد تھا۔ لہٰذا قدیم جرمانوی عہد سے سارے رشتے منقطع کر لیئے گئے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عیسائیت بڑی تیزی سے اور بعض اوقات قوت کے استعمال سے ترقی کر رہی تھی۔

وہ ادب جسے صحیح معنوں میں جرمن ادب کہنا چاہیئے اس کا آغاز مذہبی ادب کی حیثیت سے ہُوا اور اسے راہبوں نے رواج دیا۔ یہ خانقاہ نشین راہب ہی لکھنے کے فن سے واقف تھے اور اسی وجہ سے ان لوگوں کو تہذیب کا معمار سمجھا جاتا تھا (دوسرے لوگوں میں شاید ہی کوئی اس کو جانتا ہو) اِن لوگوں نے قدیم اور ثقیل جرمن زبان کو لاطینی تراجم کی مدد سے ادبی زبان میں تبدیل کر دیا اور یہ زبان مقبول مذہبی تحریروں کا سرچشمہ بن گئی۔ انجیل کے اقتباسات مرتب کیئے گئے، دعائیں لکھی گئیں، مذہبی مضامین لکھے گئے۔ اس نوع کا بہترین کارنامہ راہب آٹ فرائڈ فون ویزن برگ کی تصنیف اونجیلی این ہارمنی ہے جو ۸۶۳ اور ۸۷۱ کے مابین لکھی گئی، لیکن جرمن ادب کی یہ ابتدائی ترقی دیرپا ثابت نہ ہوئی اور ۹۰۰ء میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کی وجہ لاطینی کا فروغ تھا۔ بعد کی دو صدیوں تک کلیسا کے اربابِ علم جرمن شہنشاہوں کے تعاون سے لاطینی تہذیب کی تعمیر میں مشغول رہے۔ لاطینی زبان کے استعمال سے کلاسیکی ثقافت کے گہرے اثرات وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ چنانچہ عہدِ عتیق کی مثالوں کے مطابق شاعری میں غیر مذہبی موضوع بھی اُبھرے۔ مذہبی اور غیر مذہبی قوتوں نے اصل اور اعلیٰ معیار کی حامل جرمن تہذیب اور ادب کی بنیادیں اُستوار کر دیں۔

ترقی کی اس کیفیت کے لئے موزوں معاشرتی حالات معاشرے میں ایک اعلیٰ اور غیر مذہبی طبقے یعنی مہم جوؤں کے طبقے کے ظہور میں آنے کی وجہ سے پیدا ہوئے ۔ یہ مہم جو شہنشاہ کے دربار سے منسلک طبقۂ اُمرا سے تعلق رکھتے تھے ۔ ان کی خود اعتمادی صلیبی جنگوں کی وجہ سے بڑھ گئی تھی۔ صلیبی جنگیں فلسطین کو جو عیسائی مذہب کا ابتدائی گہوارہ ہے ، عیسائی اقتدار کے زیر اثر لانے کے لئے گیارھویں صدی کے آخر میں شروع کی گئی تھیں ۔ ۱۱۰۰ء سے غیر مذہبی موضوعات سے تعلق رکھنے والی داستانیں کثرت سے تخلیق ہونے لگی تھیں ۔ اگرچہ ان داستانوں میں تاریخی ترجمانی کے ضمن میں عیسائی نقطۂ نظر یقینی طور پر نمایاں ہے تاہم ان کا مقصد عوام کے لئے تفریح بہم پہنچانا اور مہم جو کی زندگی کی مسرتوں کو اجاگر کرنا تھا ۔

جرمن ادبیات اور ثقافت کے دور متوسطین کی نشو ونما کا آغاز ۱۱۷۰ء کے لگ بھگ ہوا ۔ اس زمانے میں ہوہن اسٹافن خاندان بر سر اقتدار تھا اور جرمن سلطنت اپنی قوت اور شان و شوکت کے عروج پر تھی ۔ مہم جوؤں کا طریقۂ زندگی اور تصوّرِ حیات جو اس عہد میں عام تھا ، کلاسیکی انداز سے موسوم کیا جا سکتا ہے ۔ زندگی نے اپنے آپ کو کلیسا کے اقتدار سے آزاد کرا لیا تھا اور اپنی اقدار کو خود فروغ بخشا تھا ۔ اگرچہ یہ اقدار درباری رسم و رواج اور مہم جوؤں کے نصب العین سے جس پر عیسائیت کا غلبہ تھا پوری طرح متاثر تھیں ۔ یہ نصب العین کیا تھا؟ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جذبات کو قابو میں رکھنا ، ہر موقعے پر تحمل سے کام لینا ، جنگ میں شرافت برتنا ، کمزوروں اور ناداروں کے ساتھ ہمدردی اور فیاضی سے کام لینا ۔ استقلال اور وفاداری ، ضبطِ نفس اور ایسی تعلیم سے بہرہ ور ہونا جو زندگی میں آہنگ اور ابدی مسرت کی خالق ہو ۔ یہ تمام چیزیں اسی نصب العین سے تعلق رکھتی ہیں ۔ اسی عہد میں دورِ متوسط کے ان عیسائی نظریات کے تضادات کو دُور کرنے کی کوشش بھی کی گئی جو دنیاوی تصوّر ، زمین پر زندگی کا وجود اور ازاں بعد

غیر مذہبی اور روحانی نقطۂ نظر، حسن اور معصیت سے متعلق تھے۔ کلاسیکی جرمن شاعری کی طرح اس عہد کی شاعری میں بھی (۱۸۰۰ء کے لگ بھگ) مثالی وجود کا تصور جس انداز سے پیش کیا گیا ہے اُسے جرمن ادبیات کا اہم ترین کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔ حقیقت کو تابناک انداز سے پیش کرنے کی بنا پر اس شاعری نے زندگی کو تخلیقی اور ذوقی اعتبار سے متاثر کر لیا تھا۔

مہم جُوؤں کا پہلا رزم نگار "ہارٹ مان فون آ" تھا، جس نے اپنی تصنیف "ایرک اور آئی ون" میں مہم جوؤں کے مثالی عادات و خصائل، خطر پسندی اور ضبط و تحمل کی کمی سے پیدا ہونے والے ان مصائب کو بیان کیا ہے جن کی وجہ سے ان کے عرق ریزی سے حاصل کئے ہوئے طریقۂ زندگی کو نقصان پہنچتا ہے۔ اسی نوع کی ایک اہم رزمیہ پارزیوال ہے جو ۱۲۰۰ اور ۱۲۱۰ء کے مابین تصنیف ہوئی۔ اس رزمیہ میں ایک مہم جُو کے دنیاوی اخلاق اور اطاعت خداوندی کی کشمکش کو اُجاگر کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی مہم جوؤں کے طریقۂ زندگی کی ایک مکمل تصویر بھی پیش کی گئی ہے۔ یہ نظم گہری مذہبیت کی حامل ہے۔ اس نظم میں یہ دکھایا گیا ہے کہ پارزیوال خداوند تعالیٰ کی جستجو اور عرفانِ نفس کے سلسلے میں ساری دنیا کا سفر کرتا ہے۔ پارزیوال کے اس سفر کی روداد دائمی اہمیت رکھتی ہے۔ آخر آخر میں وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کی زندگی دنیا کے لئے قابل احترام اور خداوند تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب بن جاتی ہے جو مہم جوؤں کی روایت کے عین مطابق ہے۔ اس رزمیہ کا ایک اقتباس یہ ہے۔

دہ سنو۔ شریفانہ جذبات بے معنی ہیں
اگر پاک دامانی تمہاری روح سے رخصت ہو گئی ہے
معصیت سے لبریز دل سے کیا حاصل
اگر اس کی شوکت ختم ہو گئی ہو

جس طرح گریز کرنے والے پرندوں کے پَر جھڑ جاتے ہیں
اور وہ جہنم کا ساتھی بن جاتا ہے
تم اپنے انداز کی وجہ سے منفرد ہو
اور یقینی طور پر سربراہی کے لئے پیدا کئے گئے ہو
تو پھر اپنی شرافت کو ضائع نہ ہونے دو
نہیں ۔ اس کو انتہائی بلندیوں تک جانے دو
ضرورت مندوں پر رحم کرکے
غریبوں کی مصیبتوں میں ان کی مدد کرکے
نرمی اور فیاضی کے ساتھ
ہمیشہ انکساری برتو ''

اس عہد کی ایک اور رزمیہ ''بیلینجن لائڈ'' ہے جو ۱۲۰۰ء کے قریب لکھی گئی ہے لیکن اس کی بنیاد عہد قدیم کی نظموں پر رکھی گئی ہے جس کی وجہ سے اس نظم میں طیوطانی عہد کا جرأت مندانہ لیکن الم انگیز نقطۂ نظر ملتا ہے ۔

پھر بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ مہم جوؤں کا نیا تصورِ حیات اور مسیحی معتقدات اس نظم میں سطحی انداز سے شامل ہیں اور کوئی اہمیت نہیں رکھتے ۔ ایک اور رزمیہ نظم ''ٹرسیٹن اور آئی سولڈے'' (۱۲۰۰ء) میں جو گاٹفرائڈ فون اسٹراس برگ کی تصنیف ہے ہر چیز کا دارومدار عشق کی قوت پر ہے جو مہم جوؤں کے معتقدات کے برعکس ہے اور اسی وجہ سے یہ نظم الم انگیز انجام کی حامل ہے

مہم جوؤں کے معاشرے میں ازدواجی محبت کے علاوہ مرد اور عورت کے تعلقات کو مخصوص اور متعین حدود میں رکھا جاتا تھا ۔ اس محبت کا شاعرانہ اظہار ''منی سینگ'' یا نغمۂ محبت میں ہوا ۔ اس نغمے میں جس عورت کا تصور ملتا ہے وہ معاشرتی اعتبار سے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی ہے ۔ مہم جو اس کی خدمت کو

اپنا مقدس فرض سمجھتا ہے۔ اگر یہ خاتون نگاہِ التفات سے مہم جُو، کی طرف دیکھ لیتی ہے تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا ہے کیونکہ اس کا مقصد اس خاتون کو مسخر کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی خدمت سے عظمت حاصل کرنا ہے چنانچہ اسی وجہ سے یہ خاتون عموماً شادی شدہ ہوتی ہے۔ مہم جو اُسے اپنا آدرش سمجھ کر منتخب کرتا ہے اور خود کو اس آدرش کے قابل ثابت کرتا ہے "نغمۂ محبت" اس اعتبار سے مہم جُو کے لئے تدریسی مقصد کا حامل ہوتا ہے۔ اسے معاشرتی اہمیت دیتا ہے اور ہر چیز مثالی مہم جُو اور درباری کو بروئے کار لانے پر مرکوز ہو جاتی ہے اور اسی نغمۂ محبت کا عوامی اظہار، مہم جُوؤں کے معاشرے اور ذاتی کمالات کی سچی تصویر ہوتا ہے۔

"منی سینگ" نے صنف ادب کی حیثیت سے خاصی شاعرانہ شہرت حاصل کی۔ ازمنۂ وسطیٰ کے عظیم غنائی شاعر والتھر فون ڈر وگل ویڈ (۱۲۲۸-۱۱۶۸ء) نے اپنی شاعری کی ابتدا انہی نغموں سے کی تھی لیکن بعد میں وہ ان نغموں کے حد سے زیادہ پر تصنع انداز سے متنفر ہو گیا اور اس نے حقیقی محبت میں ڈوبی ہوئی نظمیں لکھیں جنکا تخاطب ایک دخترِ جمہور سے تھا۔ ان نظموں میں محبت کے لطف و الم کے ذاتی تاثرات پیش کئے گئے تھے۔ اس نے ایک اور نوع کی شاعری میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ سیاسی نغمہ، جسے اس نے ادبی رنگ و آہنگ عطا کیا اور ادبی شہ کار بنا دیا۔ اس کے معاصرین کے بقول ان نظموں نے سیاسی اعتبار سے کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا۔ یہ سیاسی نغمے کس انداز میں لکھے گئے تھے۔ اس کے لئے ایک مثال کافی ہے۔ ۱۱۹۷ء میں شہنشاہ ہنری ششم کی اچانک موت کے بعد اس کی جانشینی کے سلسلے میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ ان جھگڑوں میں بیرونی قوتوں اور پوپ نے بھی دخل اندازی کی۔ والتھر نے اس نازک موقعے پر سوابیا کے ڈیوک فلپ کا ساتھ دیا اور ایک نظم "میں نے تیزی سے پانی بہنے کی آواز سنی" لکھی جو یہ تھی:

دو میں نے تیزی سے پانی بہنے کی آواز سنی
میں نے مچھلیوں کو تیرتے دیکھا
اور دنیا میں اس کے علاوہ جو کچھ ہے سب دیکھا
کھیتوں میں، جنگلوں میں، پتّیوں میں، نرکلوں میں، گھاس میں
ان تمام چیزوں کو دیکھا جو رینگتی ہیں یا اڑتی ہیں
یا زمین پر چلتی ہیں
میں نے پہچان لیا اور آپ کو آگاہ کرتا ہوں
کوئی مخلوق دشمنوں کے بغیر زندہ نہیں رہتی
وحشی درندے ہوں یا حشرات الارض
سب ایک دوسرے سے بُری طرح لڑتے رہتے ہیں
پرندے بھی یہی کرتے ہیں
لیکن ایک سلسلے میں ان کا شعور بہت نمایاں ہے
وہ اپنے آپ کو بالکل بے حقیقت سمجھنے لگیں
اگر وہ ایک مضبوط نظام حکومت نہ قائم کرلیں
وہ اپنے بادشاہ منتخب کرتے ہیں اور نظام قائم کرتے ہیں
وہ آقا کو برسر اقتدار لاتے ہیں اور ملازم میں ملازمت کا احساس بیدار کرتے ہیں
لیکن اے جرمن عوام تم پر افسوس ہے
تمہارا نظام اور منصب داری کہاں رخصت ہو گئی؟
شہد کی مکھیوں کی ملکہ قائم و دائم ہے
اور تمہارا شاہی نظام انحطاط پذیر ہے
پلٹ پڑو - اپنی اصلاح کر لو
غیر ملکی حکمرانوں کے تاج اب نظر آنے لگے ہیں
باجگزار بادشاہ تمہیں راستے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں

فلپ شہنشاہیت کا تاج اپنے سر پر رکھ لو
اور ان سب کو ان کی جگہوں پر واپس بھیج دو "

۱۲۲۰ء کے لگ بھگ مہم جو درباریوں کا دور عروج ختم ہو گیا۔ تیرھویں صدی میں وہ محدود اعلیٰ طبقہ جو انہیں سہارا دے رہا تھا تیزی سے اپنی اہمیت کھو بیٹھا۔ فریڈرک ثانی (۱۲۵۰-۱۲۱۵) کے عہد سے شہنشاہ کا اقتدار مختلف علاقوں کے شہزادوں میں منتقل ہو گیا اور اس صدی کے نصف آخر میں جرمنی میں تیس چالیس برس تک کوئی شہنشاہ نہیں رہا تھا۔ چونکہ مہم جوؤں کے نقطۂ نظر سے شہنشاہ ہی سلطنت کا جسم و جان ہوتا تھا اور اسی نے ان لوگوں کو صلیبی جنگوں میں حصہ لینے اور درباری خدمات انجام دینے کی وجہ سے اعلیٰ مرتبے پر فائز کیا تھا لہٰذا شہنشاہیت کے زوال کے ساتھ ان لوگوں کا زوال بھی مکمل ہو گیا۔ قدیم معاشرتی نظام میں صرف تین طبقے تھے۔ اہل کلیسا، مہم جو اور کسان۔ لیکن شہروں میں عوامی بیداری کی وجہ سے یہ نظام پارہ پارہ ہو گیا۔ مالیاتی نظام کی نشوونما سے معاشی قوت تاجر پیشہ طبقے کو حاصل ہو گئی اور نئی پیدل افواج نے مہم جوؤں کی فوجی اور سیاسی اہمیت کو ختم کر دیا۔ ورنہر گارڈینیری کی رزمیہ نظم دمیر ہیلم برشٹ میں جو ۱۲۵۰ اور ۱۲۸۰ء کے مابین لکھی گئی تھی قدیم معاشرتی نظام کے اسی انحطاط کو پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم میں مہم جوؤں کو صرف جرائم پیشہ اور ڈاکو امرا کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ بہر حال ازمنہ وسطیٰ کی متروک شاعری کی بیانیہ قوت کا اثر عام طور پر محدود رہا۔ درباریوں کی شاعری کی ظاہری شکل صورت کچھ عرصے برقرار رہی، لیکن اس کی اعلیٰ اخلاقی قدریں برقرار نہ رہ سکیں۔ اس وجہ سے ہر نوع کے صناعانہ فرار اور مبالغے کی گنجائشیں پیدا ہو گئیں۔ موضوعات کے سلسلے کی توسیع ہوئی لیکن کسی بنیادی نصب العین کے تصور کی کمی محسوس ہوتی تھی۔

متوسط طبقے کا زیادہ تر ادب جسے اس دور میں ثقافتی رہنما کی حیثیت حاصل

ہو گئی تھی ۔ روزمرّہ زندگی کے عام موضوعات کی وجہ سے نمایاں ہے ۔ فنّی نزاکتوں کو یا تو نظر انداز کر دیا جاتا تھا یا انہیں محض ایسا تکلّف سمجھا جاتا تھا جس کی خواہ مخواہ پابندی کی جائے ۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ ناصحانہ مقصد پر بہت زور دیا جاتا تھا اس عہد کی اصل کشمکش کا اظہار کلیسائی نظام اور عوامی مذہبی تحریک کے تصادم سے ہوا ۔ عوامی مذہبی تحریک کی بنیاد دنیا کے لاحاصل ہونے کا تجربہ تھا ۔ ۱۳۰۰ء سے ۱۵۰۰ء تک کی دونوں صدیوں کا نقطۂ نظر ماضی کی طرف راجع تھا ۔ یہ ازمنۂ وسطیٰ کی دنیا کے روحانی اور معاشرتی شکست و ریخت کا عہد تھا ۔ اس پورے عہد میں واضح ترقی کی صرف ایک مثال نظر آتی ہے ۔ متوسط طبقے کی شہری تہذیب کی تنظیم اور نشوونما ۔

وہ روحانی قوت جسے عہد جدید کا نقیب کہنا چاہیئے ، نشاۃ الثانیہ تھی جرمنی میں اس کا خصوصی اظہار انسان پسند تحریک کی شکل میں ہُوا ۔ اُس کا آغاز اطالیہ سے ہوا اور اس کی بنیاد یونان اور رُوم کی قدیم تہذیبوں کی از سرِ نو دریافت اور احیا تھی ۔ چنانچہ ازمنی وسطیٰ کا عیسائی نقطۂ نظر جو مابعد کی کیفیات پر مرکوز تھا اپنی خصوصی اہمیت و صحت سے محروم ہوگیا ۔ نشاۃ الثانیہ نے زندگی کو بذاتِ خود ایک قدر قرار دیا ۔ انسان اس احساس سے آزاد ہوگیا جو اُسے مناصب کے ایک خصوصی نظام میں مقید رکھتا ہے اور مذہب کی اجارہ داری قائم کرتا ہے ۔ اس نے اپنی زندگی کو اپنی آرزوؤں ، قوت اور ارادے کے مطابق متشکل کیا اور اپنے آپ کو پہچانا ۔ اس نئے رجحان کی ایک ابتدائی مثال ' بوہیما کا کاشتکار ' ہے ۔ یہ جوہیز فون ٹیپی کی (انہیں جوہیز فون ساز بھی کہا جاتا ہے) تصنیف اور ایک اہم ادبی کارنامہ ہے ۔ یہ موت اور ایک کاشت کار کے درمیان ایک تنازعہ ہے ۔ موت نے کاشت کار کی بیوی کو چھین لیا ہے ۔ کاشت کار زندہ رہنے کے حق اور زندگی کے حسن کا تحفظ کرنا چاہتا ہے ۔ موت زندگی کی لاحاصلی اور انسان کی بدکاری کو ظاہر کرتی ہے ۔ دُنیا کے بارے میں ازمنۂ وسطیٰ کے منفی نقطۂ نظر اور

نشاۃ الثانیہ کے زندگی سے پیار کے رجحان کو ایک دوسرے کے مقابل لایا گیا ہے
آخر میں خداوند تعالیٰ فیصلہ کرتا ہے "تم دونوں نے بڑی مستعدی سے مقابلہ
کیا ہے لہٰذا اعزاز زندگی کو حاصل ہُوا اور فتح موت کو۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ
اپنی زندگی موت کے، جسم زمین کے، اور روح ہمارے سپرد کر دے۔"

۱۴۵۰ء کے بعد انسان دوستی سارے جرمنی میں پھیل گئی۔ اس کا مقصد
دینی تربیت، سائنس اور تعلیم کو اہل کلیسا کی تولیت سے آزاد کرانا تھا۔ انسان
دوستوں نے قدیم متن کا مطالعہ اصل الفاظ میں کیا اور اپنی تصانیف بھی لاطینی
زبان میں شائع کیں۔ چنانچہ یہ تحریک علماء کے حلقے میں محدود رہی اور اطالیہ کی
نشاۃ الثانیہ کی طرح پوری قوم کے لئے ایک نئی ثقافت کو فروغ دینے میں ناکام
رہی۔ بہر حال جرمنی میں کلیسائی رشتوں کو تنقیدی نقطۂ نظر سے پرکھا گیا اور
اصلاح کی گنجائش پیدا ہو گئی۔ اس اصلاح کے سب سے بڑے داعی مارٹن
لوتھر (۱۴۸۳ء - ۱۵۴۶ء) تھے۔ مارٹن لوتھر بھی انسان پسند تھے۔ کلیسا کی
روایات سے متنفر اور انجیل کے اصل متن سے رجوع کرنے کے خواہش مند
لیکن انہوں نے ازمنہ وسطیٰ کی مثال پر عمل کرتے ہُوئے اپنے اصولوں کی بنیاد
ایقان و کشف پر رکھی۔ لوتھر بذاتِ خود راہب تھے لیکن انہوں نے رائج الوقت
کلیسائی نظام کی ان خارجی خامیوں پر تنقید کی جن کی وجہ سے بنیادی نظریات
کی نفی ہوتی تھی اور چونکہ وہ اپنے خیالات سے تائب ہونے کے لئے تیار
نہیں تھے لہٰذا انہیں ۱۵۲۰ء میں کلیسا سے خارج کر دیا گیا۔ ایک سال بعد
شہنشاہ چارلس پنجم نے انہیں دربار میں طلب کیا۔ یہاں بھی لوتھر نے تائب
ہونے سے انکار کر دیا۔ ان کی اٹھارہ اپریل ۱۵۲۱ء کی مشہور تقریر ہمارے
پاس محفوظ ہے۔ اس میں لوتھر نے واضح کیا ہے کہ ان کا ضمیر صرف الفاظ
ربانی کا تابع ہے۔ تقریر کے آخر میں انہوں نے کہا "مجھے پاپائے اعظم اور
مجالس پر کوئی اعتقاد نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ ان لوگوں

سے اکثر غلطیاں سرزد ہوئی ہیں اور انہوں نے متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے
میں اپنے خیالات سے تائب نہیں ہوا اور نہ کبھی تائب ہو سکتا ہوں۔ کیونکہ
اپنے ضمیر کے خلاف کچھ کرنا نہ مناسب ہے نہ شایانِ شان۔ خداوند تعالیٰ میرا
حامی و ناصر ہو"۔

اس تقریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوتھر کو باغی قرار دے دیا گیا لیکن سیکسونی کے
الکٹر نے انہیں پناہ دی اور وہ ۱۵۲۱ء سے ۱۵۳۴ء تک انجیل کے جرمن ترجمے
میں مصروف رہے۔ اس ترجمے نے پاکیزہ جرمن زبان کے ارتقا میں جو ہر شخص
کے لئے قابلِ فہم، غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ لوتھر کی اصلاحی تحریک
روک ٹوک کے بغیر سارے جرمنی میں پھیل گئی اور اس کی وجہ سے قدیم رومن
کیتھولک کلیسا کے مقابلے پر پروٹسٹنٹ کلیسا وجود میں آگیا۔

اصلاحی تحریک کا ایک اور فوری ردعمل کسانوں کی بغاوتوں کی شکل میں
ظاہر ہوا۔ یہ کسان غیر مستحکم سیاسی اور معاشرتی حالات کا شکار تھے۔ علاقائی
رؤسا بلا شرکت غیرے اقتدار کے مالک تھے اور مالیاتی نظام کی نوعیت یہ تھی
کہ اس سے صرف شہریوں کی دولت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کسان آقاؤں کے پنجۂ
غضب سے آزاد ہونا چاہتے تھے۔ ان کے سامنے کسانوں کی اہمیت مجبور و
محکوم خدام کی سی تھی۔ ۱۵۲۵ء میں کسانوں نے ۱۲ نکات مرتب کئے۔ یہ
ہمیں جنوبی جرمنی سے ملے ہیں اور ان میں کسانوں نے بعض معمولی مطالبے
پیش کئے ہیں۔ مطالبوں میں کلامِ ربانی کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ ان مطالبوں
کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ غریب کسان کتنے خوفزدہ تھے۔
انہوں نے کس طرح امید و بیم کے عالم میں مسلسل مشورے کئے اور فیصلہ کن
لمحات میں وہ کس طرح کامیاب و کامراں ہوئے۔ ان مطالبوں میں عیسائی
آزادی کی روح دلکش سادگی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ مطالبوں کے بعض
اقتباسات یہ ہیں:

اوّل یہ کہ ہماری عاجزانہ درخواست اور خواہش ہے اور ہم سب کی مرضی اور رائے ہے کہ اب سے قوت اور اقتدار کے مالک ہم ہوں گے۔
دوم یہ کہ ایک پورا گروہ اپنا پادری خود منتخب کرے گا اور اس گروہ کو یہ اختیار بھی ہو گا کہ اگر پادری صحیح طریقے سے کام نہ کرے تو اُسے علیحدہ کردے، پادری کا کام یہ ہو گا کہ خالص اور سادہ انجیل مقدس کا درس دے جس میں انسانی تحریف، انسانی اصول وضوابط شامل نہ ہوں۔
سوم یہ کہ اب تک یہ دستور چلا آتا ہے کہ ہم لوگ موروثی خادم سمجھے جاتے ہیں۔ یہ دستور بے حد افسوس ناک ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے قربانی دے کر سب کو نجات بخشی ہے۔ غریب چرواہا ہو یا ملک کا سب سے اہم آدمی، اس میں کسی کی تخصیص نہیں۔ چنانچہ انجیل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم آزاد ہیں اور ہم آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بالکل ہی بے قابو ہو جائیں اور ہر قوت کی نفی کردیں۔ یہ منشائے ربانی نہیں ہے۔ ہمیں احکامات خداوندی کے مطابق زندگی گزارنا چاہیئے۔ نفس کی بدلگامی سے بچ کر خداوند تعالیٰ سے محبت کرنا چاہیئے اور اُسے اپنا آقا سمجھنا چاہیئے۔ اپنے ہمسایوں میں اُسی کا پرتو دیکھنا چاہیئے اور ان سے وہی سلوک کرنا چاہیئے جس کی خود ہمیں توقع ہے کہ یہ حکم خداوندی ہے۔
چہارم یہ کہ اب تک یہ رواج ہے کہ کسی غریب کو شکار کرنے یا بہتے ہوئے پانی سے مچھلی پکڑنے کا حق نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بالکل غلط، اخوت کے منافی، خودغرضی پر مبنی اور احکام ربانی کے خلاف ہے۔ وہ صاحبانِ اقتدار جنہوں نے بعض علاقوں میں شکاری جانوروں کو اپنے لئے محفوظ رکھ چھوڑا ہے ان کا مقصد ہم لوگوں کو تنگ کرنا اور نقصان پہنچانا ہے تاکہ ہم لوگ اس ملکیت سے محروم رہیں جو خداوند تعالیٰ نے انسان کے فائدے کے لئے خلق کی ہے۔ عام انسانوں کے فائدے کی یہ چیز چند لوگ ہڑپ

کر لیتے ہیں اور ہم سے خاموش رہنے کو کہا جاتا ہے جو خداوند تعالیٰ اور حق ہمسایگی کے خلاف ہے۔

پنجم یہ کہ ہمیں لکڑی کی وجہ سے بھی بہت تکلیف ہے۔ اُمرا نے سارے جنگلوں پر بلاشرکت غیرے قبضہ کر رکھا ہے۔ جب کسی غریب آدمی کو لکڑی درکار ہوتی ہے تو اسے دُگنی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ کلیسا اور امرا نے جن جنگلوں پر زبردستی قبضہ کر رکھا ہے ان پر پوری قوم کو مالکانہ حقوق حاصل ہونا چاہیئے۔

ششم یہ کہ ہم روز افزوں بیگار کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ اس پر مناسب غور کیا جائے اور ہمیں اس سلسلے میں پریشان نہ کیا جائے بلکہ وہ خوشگوار طریقہ اختیار کیا جائے جس پر ہمارے آباؤ اجداد عمل پیرا تھے اور جو کلام ربانی کے مطابق ہو۔

ہفتم یہ کہ ہم آئندہ کسی امیر کا مزید استحصال برداشت نہیں کریں گے۔ زمیندار کسان کو موزوں اور مناسب شرائط پر زمین پٹے پر دے گا اور شرائط کی پوری پوری پابندی کی جائے گی۔ ان شرائط کے علاوہ زمیندار کسی داب، دھونس اور بیگار سے کام نہیں لے گا تاکہ کسان کسی روک ٹوک کے بغیر کام کر سکے۔ ہاں اگر زمیندار کو کسان کی خدمات درکار ہوں تو کسان کو لازم ہے کہ پوری آمادگی اور اطاعت سے اس کا کام کرے۔ بشرطیکہ یہ کام ایسے وقت اور موقعے پر نہ ہو جس سے خود کسان کو نقصان ہو اور اسے معقول معاوضہ ملنا چاہیے۔

ہشتم یہ کہ ہم میں سے بیشتر پٹہ دار اس وجہ سے پریشان ہیں کہ ہماری زمینیں لگان کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتیں اور ہمیں ان سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں جس کی وجہ سے کسان برباد ہو جاتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ زمیندار، زمین کا جائزہ لے کر مناسب لگان کے تعین کے لیے ایماندار آدمی مقرر کریں تاکہ کسان کی محنت ضائع نہ ہو اور ہر کام کرنے والے کو معاوضہ ملے۔

دہم یہ کہ ہم اس چیز سے بہت پریشان ہیں کہ بعض لوگوں نے ان چراگاہوں اور میدانوں پر قبضہ کر رکھا ہے جو پوری قوم کی ملکیت ہیں۔ ہم اپنی قوم کے لئے ان کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے لیں گے۔ اگر قابضین نے ان کو باضابطہ طور پر خریدا ہے تب تو ٹھیک ہے ورنہ ہم ان کو مناسب اور برادرانہ انداز سے اپنے قبضے میں کرلیں گے۔

یازدہم یہ کہ ہم موت ٹیکس کو بالکل ختم کردیں گے۔ ہم یہ گوارا نہیں کریں گے کہ بیواؤں اور یتیموں کی املاک زبردستی ان سے چھین لی جائے۔ اس پر غاصبانہ قبضہ کرلیا جائے۔ متعدد مقامات پر مختلف طریقوں سے ایسا ہو رہا ہے لیکن یہ خداوند تعالیٰ اور عزّت کے منافی ہے۔

دوازدہم یہ کہ ہمارا فیصلہ اور آخری رائے ہے کہ یہاں پیش کئے جانے والے نکات میں سے کوئی نکتہ اگر کلام ربانی سے مطابقت نہ رکھتا ہو اور یہ ثابت ہوجائے کہ فلاں نکتہ کلام ربانی کے مطابق نہیں ہے تو ہم فوراً انجیل کی تشریح کی روشنی میں اس سے دستبردار ہوجائیں گے۔

(فروری / مارچ ۱۵۲۵ء)

اُمرا نے ان بغاوتوں کو بڑی سختی سے کچلا اور بڑا خون خرابہ ہوا۔ کسانوں کو یہ احساس ہوگیا کہ ان کے حالات بد سے بد تر ہوتے جارہے ہیں۔ مذہبی معاشرتی اور سیاسی تنازعے سب آپس میں گڈمڈ ہوگئے۔ ۱۵۵۵ء میں جرمنی کی مذہبی دوعملی کو قانونی طور پر تسلیم کرلیا گیا مگر اس کی وجہ سے سیاسی افتراق میں اور اضافہ ہوگیا اور یہ کش مکش سارے یورپ میں پھیل گئی۔ اس کشمکش کا نتیجہ سی سالہ جنگ (۱۶۱۸ء - ۱۶۴۸ء) کی شکل میں ظاہر ہوا جس نے جرمنی کے بڑے بڑے علاقوں کو بالکل برباد کردیا اور جرمنی کی تقریباً ایک تہائی آبادی موت کے گھاٹ اتر گئی۔

یہ پُرآشوب دور اس اعتبار سے قابل ذکر ہے کہ اسی دور میں جرمن ادب

کا ایک نیا کارنامہ منظر عام پر آیا۔ اس سے پہلے سولہویں صدی میں مذہبی رسائل اور انسان دوستی کی لاطینی تصانیف کے علاوہ صرف چند سادہ اور مقبول تحریریں وجود میں آئی تھیں۔ سترھویں صدی میں جرمن ادب اس دنیا اور دوسری دنیا کے مابین رُخ بدلتا رہا۔ جنگ کی ہولناکی نے تمام دنیاوی اشیائ کے لاحاصل ہونے کا نیا احساس بیدار کیا لیکن پھر بھی لوگ زندگی ہی سے وابستہ رہے۔ ازمنی وسطیٰ کا وہ تقدس جس کی نگاہ حیات مابعد پر مرکوز تھی، اب اپنے تمام امکانات کھو چکا تھا۔ تقدیر کی نیرنگیوں کو برداشت کرنے، زندگی کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے اور اپنی ہی قوت سے بروئے کار لانے کی وجہ سے انسانی عظمت مسلّم سمجھی جانے لگی تھی اگرچہ اس کش مکش کا آخری فیصلہ اٹھارویں صدی میں ہوا جبکہ عقل انسانی کو مطلق العنان حکمران تسلیم کر لیا گیا لیکن یہی جذبہ اور خیال ہمیں ہنس جیکب کرسٹوفیل فون گرمل شوسن؎ کے ناول "سمپلی سیس سمپلی سمِس"؎ میں ملتا ہے جو سترھویں صدی کا اہم ترین ادبی کارنامہ ہے۔ اس ناول میں ایک دہقانی لڑکے سمپلی سیس کی داستان حیات بیان کی گئی ہے، جس نے بچپن میں اپنے والدین کے کھیتوں کو برباد ہوتے دیکھا تھا۔ ایک نیک دل درویش نے اس کی پرورش کی لیکن درویش کی موت کے بعد جب اس نے دنیاوی معاملات میں دلچسپی لینا شروع کی تو وہ سپاہی بن گیا اور جنگ کے خونی معرکوں میں حصّہ لینے لگا۔ اس نے دنیا دیکھ ڈالی، متعدد سفر کیے، زندگی اور دنیا کی شان و شوکت بھی دیکھی اور اس کے مضر اثرات کا مشاہدہ بھی کیا۔ آخر کار اس نے درویشی اختیار کر لی اور فطرت کی تنہائیوں میں انکساری اور عاجزی کے ساتھ احکام خداوندی بجا لاتا رہا۔ اپنی ذات کو دُنیا میں مدغم کرنے کے موقعے پر سمپلی سیس خداوند تعالیٰ سے بالکل علیحدہ ہو گیا تھا لیکن دنیا کے علم و معلومات نے آخر کار اسے عرفان نفس اور عرفان خداوندی کی منزل تک پہنچا دیا۔ ناول سی سالہ جنگ کے پس منظر میں

لکھا گیا ہے جو دراصل اس دنیا کی بے ثباتی کی علامت ہے۔ ناول میں اس علامت کو بڑی وضاحت اور حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے، اس کا یہ اقتباس قابل توجہ ہے۔ یہاں سمپلی سیس کا ایک خواب بیان کیا گیا ہے۔ درویش کی موت کے بعد اس کی روانگی کا منظر ہے اور سپاہیوں نے جس طرح اس کا خیر مقدم کیا اس کا بیان ہے۔

"میں اب اس خبیث بوڑھے کی شکایتیں سننے کے لئے تیار نہیں تھا مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ جس چیز کا مستحق تھا وہی اسے ملی۔ وہ غریب سپاہیوں کو اس طرح مارتا تھا جیسے وہ انسان نہیں کتے ہوں۔ چنانچہ میں نے دوبارہ درختوں کی طرف رُخ کیا جو سارے علاقے میں بڑی کثرت سے پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے یہ دیکھا کہ وہ حرکت کر رہے تھے اور ایک دوسرے کو ڈھکیل رہے تھے۔ اور آدمی جھومتے لڑکھڑاتے، گرتے پڑتے چلے آ رہے تھے۔ ایک لمحہ پہلے وہ تندرست و توانا تھے مگر اب ایک آدمی کا ایک ہاتھ غائب تھا دوسرے کی ٹانگ غائب تھی، تیسرے کا سر ندارد تھا یہ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ یہ سب جو مجھے نظر آ رہے ہیں الگ الگ نہیں صرف ایک درخت ہیں۔ جلادِ فلک اس درخت کی چوٹی پر بیٹھا ہوا ہے، اس کی شاخیں یورپ کا احاطہ کئے ہیں بلکہ مجھے تو یوں لگا کہ جیسے یہ شاخیں ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہیں۔ حسد، بغض، نفرت، بے اعتمادی، گستاخی، غرور، طمع اور اسی قسم کی دوسری چیزیں کٹیلی شمالی ہوا کی طرح اس درخت کو اڑائے دے رہی تھیں اور وہ خاصا اجاڑ اور بے رونق معلوم ہو رہا تھا چنانچہ کسی نے اس کے تنے پر یہ اشعار لکھ دیئے تھے:

بے رحم ہوا نے اُسے اکھاڑ دیا۔ توانا شاہ بلوط نے
اپنے آپ کو نیچے گرا لیا اور اس کی شاخیں ٹوٹ گئیں
برادر کُش جنگ اور خانہ جنگی بھی
اسی طرح دُنیا کو تہہ و بالا کر دیتی ہے اور زندگی کو اکھاڑ پھینکتی ہے

ان ہولناک ہواؤں کی چیخم دھاڑ اور درخت کی خودکشی نے مجھے جگا دیا۔ میں جاگا تو اپنے آپ کو اپنی کٹیا میں تنہا پایا۔ اب میں پھر یہی سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ جنگل میں رہنا ناممکن تھا کہ ہر چیز چوری ہو چکی تھی اور گزارے کی کوئی صورت نہیں رہی تھی۔ چند کتابوں کے علاوہ جو چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں اور کچھ بھی نہ تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے خداوند تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے صحیح راستہ دکھائے اور میں بکھری ہوئی کتابیں ایک جگہ اکٹھا کرنے لگا۔ اتفاقاً میری نظر ایک خط پر پڑی جو درویش نے اپنی زندگی میں لکھا تھا "عزیز سمپلی سیس جب تمہیں یہ خط ملے تو فوراً جنگل سے چلے جاؤ اور اپنے آپ کو اور بادری کو مصیبت سے بچا لو کیونکہ اس نے میرے ساتھ بڑی بھلائی کی ہے۔ خداوند تعالیٰ کو ہمیشہ مدنظر رکھو۔ دُعا مانگتے رہو اور وہ تمہیں مناسب جگہ پہنچا دے گا۔ ہمیشہ اس کا دھیان رکھو اس کی خدمت میں لگے رہو اور یہ سمجھ لو کہ تم جنگل میں میرے ساتھ رہ رہے ہو۔ میں نے تم سے آخری مرتبہ جو کچھ کہا تھا اُسے ہمیشہ یاد رکھو اور اس پر عمل کرو۔ تمہاری نجات اسی سے ہو گی۔

میں اس خط اور درویش کی قبر کو دیوانہ وار چومتا رہا۔ پھر میں لوگوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور ناک کی سیدھ میں مسلسل دو دن تک چلتا رہا۔ رات کو میں کسی کھوکھلے درخت کے تنے میں پناہ لے لیتا اور دن بھر چلتا رہتا۔ جنگلی پھلوں سے پیٹ بھر لیتا۔ تیسرے دن گلن ہاسن ؒ کے قریب مجھے ایک کھیت نظر آیا۔ یہاں مجھے پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہوا اور میں نے یہ محسوس کیا کہ میں اعلیٰ درجے کا دعوتی کھانا کھا رہا ہوں۔ قصہ یہ تھا کہ اس کھیت میں ہر طرف گیہوں کی بالیاں بکھری ہوئی تھیں۔ لورڈ لنگن کی مشہور جنگ کی وجہ سے کاشتکار انہیں جمع نہیں کر سکے تھے کیونکہ انہیں یک لخت بھاگنا پڑا تھا۔ اور یہ میرے حق میں بہت اچھا ہوا۔ میں نے گیہوں کی انہی بالیوں کو بستر بنایا۔ سردی بہت سخت تھی۔ گیہوں کے دانوں میں مجھے اتنا لطف آیا کہ جیسے میں نے

ان سے زیادہ خوش ذائقہ چیز عرصے سے کھائی ہی نہ ہو۔
صبح کو میں نے پھر گیہوں کھائے اور پھر 'گلن ہاسن' کی طرف چل پڑا شہر کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ان کا کچھ حصّہ جل چکا تھا اور کچھ حصے کو کھاد جمع کر کے ناقابل عبور بنا دیا گیا تھا۔ میں اندر چلا گیا لیکن مجھے کوئی جیتا جاگتا آدمی نظر نہ آیا۔ ہاں سڑکیں نعشوں سے پٹی ہوئی تھیں۔ بعض بالکل برہنہ تھیں اور بعض کے اوپری دھڑ پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ اس بھیانک منظر سے میرے ہوش اُڑ گئے۔ میں اپنے سیدھے سادے ذہن کی مدد سے یہ نہ سمجھ سکا کہ اس شہر کو کس بلا نے اس طرح غارت کر دیا ہے لیکن جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ شاہی فوج نے شہزادہ ویمر کے سپاہیوں پر اچانک حملہ کر دیا اور سب کو تہہ تیغ کر دیا۔ میں شہر میں تھوڑی دور تک گیا اور پھر اس منظر سے حواس باختہ ہو کر پلٹ آیا اور چراگاہوں سے ہوتا ہوا اس راستے پر چلنے لگا جس نے مجھے ہناؤ کے مشہور قلعے پہنچا دیا۔ یہاں مجھے ایک سپاہی نے روکا۔ میں گزرنا چاہتا تھا کہ دو بند وقچیوں نے مجھے پکڑ لیا اور اپنے ہیڈ کوارٹر لے گئے۔
یہاں ہر شخص مجھے تعجب سے دیکھنے لگا جیسے میں کوئی سمندری جانور ہوں۔ سب مجھے دیکھتے رہے اور اپنے اپنے خیال کے مطابق میرے بارے میں رائے زنی کرتے رہے۔ بعضوں نے مجھے جاسوس سمجھا، بعضوں نے پاگل و دیوانہ قرار دیا۔ کسی نے جنگلی اور کسی نے بھوت اور مافوق الفطرت چیز کہا۔ بعضوں کا خیال تھا کہ میں دیوانہ محض ہوں۔ اگر میں خداوند تعالیٰ سے واقف نہ ہوتا تو ان لوگوں کا یہ خیال کچھ ایسا زیادہ غلط نہ ہوتا۔

۱۷۰۰ء

تا

۱۷۹۰ء
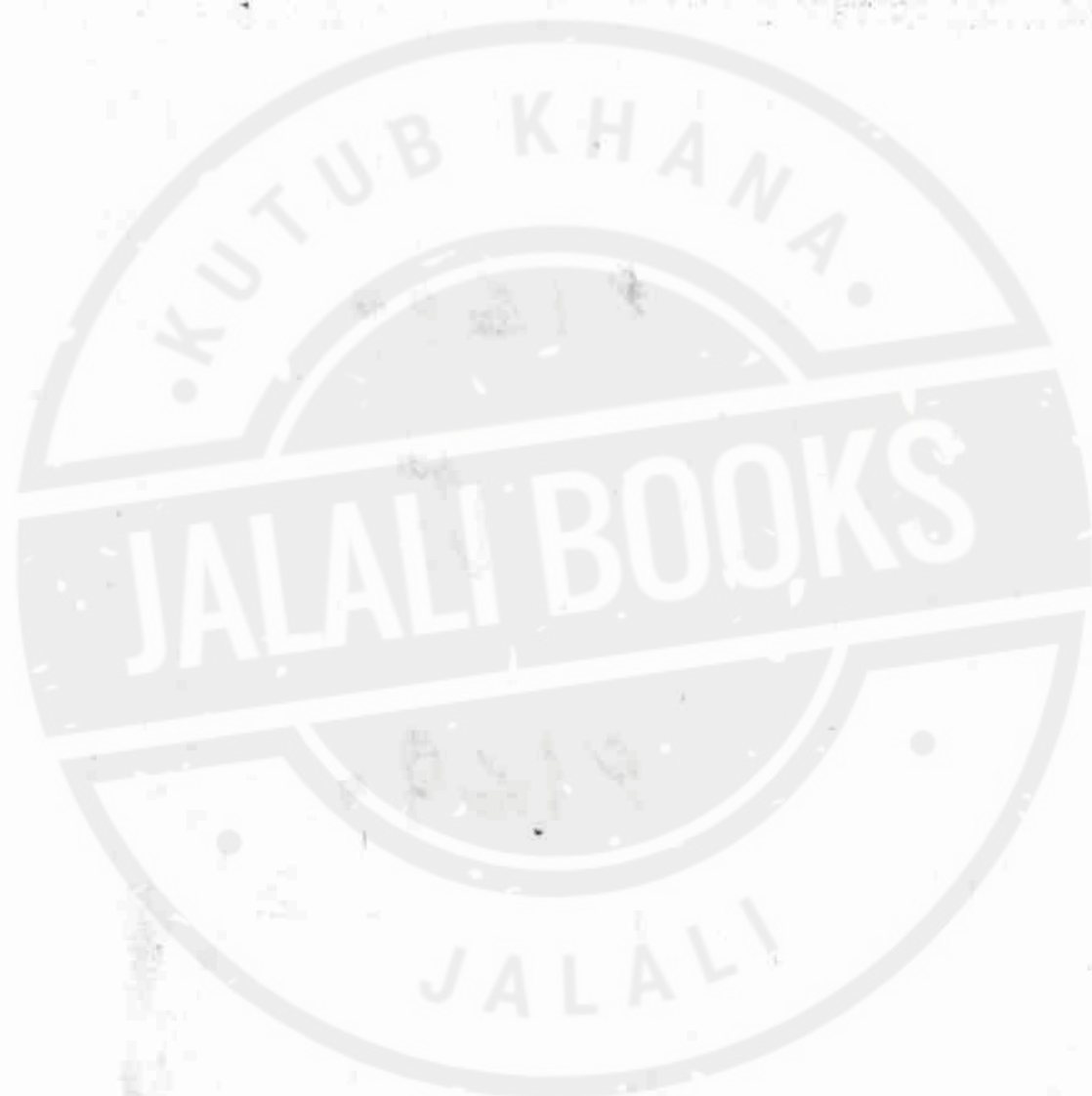
اٹھارھویں صدی کے نصف اوّل میں جرمنی کی ذہنی زندگی پوری طرح روشن خیالی کے فلسفے کی تابع رہی۔ اس عہد میں انسان پر یہ منکشف ہوا کہ وہی ایسی مخلوق ہے جس میں تعقّل کا جوہر ہے۔ اس انکشاف نے انسان کو اس حقیقت سے باخبر کیا کہ اُسے اپنے آپ کو پہچاننا ہے اور وہ روایتی اقدار اور اصولوں سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس روشن خیالی نے ہر اس چیز کو جو تعقّل کے معیار پر پوری نہیں اُترتی تھی انتہائی کڑی تنقیدی نظر سے دیکھا۔ سب سے زیادہ تنقید جامد اصول رکھنے والے مذہبی فرقوں، غیر مستند مناصب اور معاشرتی اختیارات پر ہوئی۔ ماضی کے تاریخی دور کی اہمیت کم ہوگئی کیونکہ عقل پر اعتماد کرنے کی وجہ سے ترقی کی اصطلاح میں حال اور مستقبل کا اُمید افزا تصوّر وجود میں آگیا۔ عقل انسان کو نہ صرف گردوپیش کے حقائق و صداقت سے آشنا کرتی ہے بلکہ عرفان ذات کے مواقع بھی فراہم کر دیتی ہے یعنی عقل اس کے اخلاق اور ضمیر کی تربیت کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ اخلاقی طور پر کیا مناسب ہے اور صداقت کیا ہے؟ چنانچہ اس طرح انسان اپنے وقار اور منزل مقصود کا اپنی ذاتی فکر کی روشنی میں مشاہدہ کرتا ہے اور پابندیوں سے آزاد ہو کر صداقت کی جستجو کرتا ہے۔ یہ جستجو سچّے اخلاق سے وجود پانے والے صحیح روّیہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انسان اس کی حقانیت کو خود ہی تسلیم کر لیتا ہے اور اُسے ماننے کے لئے کسی کلیسائی اشارے کا منتظر نہیں رہتا۔

جرمنی میں روشن خیالی کو عام کرنے والے شہری لوگ تھے جو اس زمانے میں معاشرتی معیار کے اعتبار سے ایک طبقے کی حیثیت سے اُبھر رہے تھے۔ اس طبقے نے روشن خیالی کے اصولوں کو قبول بھی کر لیا اور انہیں عام بھی کر دیا۔

عقل کو بنیاد بنانے والے اخلاقی رجحان کے تصوّر نے ایک قابلِ قبول اور سہل شہری اخلاق کو فروغ بخشا اور اپنا فیصلہ خود کرنے کی نئی حاصل شدہ صلاحیت نے ایک مبالغہ آمیز مسلک عقل کو عام کر دیا۔

جرمنی کی ذہنی زندگی میں روشن خیالی کی یہ لہر بہر صرف اٹھارویں صدی کے وسط تک جاری رہی اور کلیسائی اصولوں پر شدید حملے کرتی رہی۔ اسی زمانے میں ایک اور نیا ذاتی مذہبی رجحان وجود میں آیا۔ یہ "احیائے تقویٰ" کا رجحان تھا۔ اس کے ماننے والوں نے اپنے ذاتی احساسات پر اس رجحان کی بنیاد رکھی۔ جذباتی قوتوں اور مذہبی احساسات پر زور دینے کا نتیجہ روشن خیالی کے تحت وجود میں آنے والے ادب کے خلاف ایک ردعمل کی صورت میں رونما ہوا۔ شاعر کلاپ اشٹاک (۱۸۳۰ - ۱۷۲۴ء) اس ردعمل کا ترجمان تھا۔ اس نئے طرز تحریر کی نظری بنیاد جوہون گاٹ فرائڈ ہرڈر کی تصانیف نے مہیا کی۔ لیکن اس تحریک کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ روشن خیالی بھی لیسنگ اور کانٹ کے علمی تبحر کی وجہ سے مرتبۂ کمال کو پہنچ گئی۔ اس طرح اٹھارھویں صدی کا نصف آخر آنے والے عہد کی تیاری کا دور قرار دیا جاسکتا ہے جو کلاسیکی ادب اور مختلف سچائیات کے امتزاج کا دور تھا۔

"تنقید عقل محض" کے خالق کانٹ کے بعد گاٹھولڈ افراہیم لیسنگ (۱۷۸۱-۱۷۲۹ء) اپنے ڈراموں، ادبی تنقید اور مذہبی فکر کی وجہ سے جرمن روشن خیالی کا سب سے اہم ترجمان سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اپنی عمر کا بڑا حصّہ شمالی جرمنی میں گزارا اور مختلف کام کرتا رہا۔ اخبار کا مدیر رہا، پرائیویٹ سیکرٹری رہا، تھیٹر کا مینجر رہا اور لائبریرین کی خدمت انجام دی لیکن اس نے اپنا بنیادی تحریری کام آزاد مصنّف کی حیثیت سے کیا۔

لیسنگ کے ڈرامے "مینا فون برن ہلم"، "ایمیلا گیلوٹی" اور "داناناتھن" اگرچہ وقتی موضوعات پر لکھے گئے ہیں تاہم جرمن ادبیات اور ثقافت کے ارتقا میں

ان کا مرتبہ اس کے ادبی تنقید کے مبسُوط کارناموں سے کسی طرح کم نہیں ان سب میں وہ بنیادی اہمیّت رکھنے والے کسی نہ کسی نتیجے پر ضرور پہنچا ہے۔

روشن خیال مفکّر کی حیثیت سے وہ کبھی سطحی عقلیت کا دلدادہ نہیں رہا اور کسی عظیم فکری نظام کو بروئے کار لانے کے بجائے پُروقار اخلاقی رویّے کے تصوّر پر زور دیتا رہا۔ ذاتی طور پر وہ اپنے عہد کے تمام جامد اصولوں رجحانات اور عصبیتوں کا نڈر اور دیانت دار مخالف تھا اور ہمیشہ ان کے خلاف جہاد کرتا رہا۔ ثقافتی اختلافات میں وہ ہمیشہ اپنے نتائج خود اخذ کرتا تھا۔ اس بنا پر اس کی تحریریں تعمیری تنقید کا بہترین نمونہ ہیں۔ مذہبی مسائل میں وہ سطحی نتائج سے ہمیشہ کنارہ کش رہتا تھا۔ آزاد خیالی اور آزادہ روی کی وجہ سے کوئی پارٹی اُسے تمام وکمال اپنا رکن قرار نہ دے سکی۔

لیسنگ کا آخری عظیم کارنامہ "بنی نوع انسان کی تعلیم" تھا جو اس کے انتقال سے ایک سال پہلے یعنی ۱۷۸۰ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس تصنیف میں تاریخ اور مذہب کے فلسفیانہ تصوّر کا وہ اجمال ہے جو لیسنگ کی روشن خیالی کا صحیح مظہر ہے۔ اس کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ دنیا کے مختلف الہامی مذاہب صرف ایسے راستے ہیں جنہیں عقل انسانی نے ہر جگہ فروغ بخشا ہے اور مزید فروغ بخشے گی۔ لیسنگ نے اس تاریخی ارتقا کی تین خاص منزلیں متعین کی ہیں جنہیں وہ صیہونیت، عیسائیت اور روشن خیالی کی تمثیل سے ظاہر کرتا ہے اور بچوں کی تعلیم، نوجوانوں کی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم سے تعبیر کرتا ہے۔ بچوں کی تعلیم کا تصوّر اس کے بقول یہودیوں سے ظاہر ہوتا ہے جو عہد نامۂ عتیق کے مطابق اسی دنیا میں صلہ حاصل کرنے کے لئے نیکی کرتے ہیں۔ دوسری منزل جو بنی نوع انسان کی نوجوانی ہے جو عہد نامۂ جدید کے مطابق دوسری دنیا میں صلہ حاصل کرنے کے لئے نیکی کو اختیار کرتی ہے تیسری منزل

منزلِ کمال، منتہائے علم اور انسان کے تاریخی ارتقا کا نقطۂ عروج ہے جہاں ابھی حضرتِ انسان کی رسائی نہیں ہوئی۔ یہ روشن خیالی کی تکمیل کی منزل ہے۔ یہاں انسان نیکی کو کسی صلے کی تمنا کے بغیر اس لئے اختیار کرتا ہے کہ وہ نیکی ہے۔ جب بنی نوع انسان انسانیت کے مرتبۂ کمال پر فائز ہو جائے گا تو پھر عقل و خرد نیکی اور صداقت کو خود بخود ظاہر کر دیں گی اور مذہبی رہنمائی کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

یسنگ کا ڈرامہ "دانا ناتھن" جس کا پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے ۱۷۷۹ء میں لکھا گیا تھا۔ اس ڈرامے میں انسان دوستی کے رجحان کو شاعرانہ انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ انسان دوستی کسی مذہبی عقیدے کے بجائے خیر کے عملی اقدام سے وجود میں آتی ہے۔ ڈرامائی عمل کا محل وقوع مشرق اور دور صلیبی جنگوں کا ہے۔ پلاٹ سیدھا سادا ہے جس میں مختلف مذاہب کے نمائندے آپس میں ملتے ہیں۔ ایک بوڑھا یہودی ناتھن ان کا روحانی رہنما بن جاتا ہے اور آخر میں ان سب کو انسان دوستی کے مشترک عقیدے کا پیرو بنا دیتا ہے۔ ڈرامے کی روح "انگوٹھی کی تمثیل" میں ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سلطان صلاح الدینؒ ناتھن سے دریافت کرتا ہے کہ سچا مذہب کون سا ہے۔ ناتھن تمثیلی انداز میں جواب دیتا ہے اور تین انگوٹھیوں کا قصہ بیان کرتا ہے۔ تینوں انگوٹھیوں میں جو اصلی ہے اس کی پہچان ممکن نہیں۔ یہ دراصل دنیا کے تین بڑے مذاہب ہیں جو صحت و حقانیت کے یکساں طور پر مدعی ہیں۔ حل یہ ہے کہ مذاہب کے اختلافات اور کشمکش کو انسانی اخلاق کی درستی میں منتقل کر دیا جائے۔ مذاہب کی صحت اور حقانیت ان کے اصولوں اور خارجی مظاہر سے ظاہر نہیں ہوتی کہ یہ صرف محض اتفاق اور تاریخ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لیکن جس طرح اصلی انگوٹھی انسانوں پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے پہچان لی جاتی ہے، اس طرح مذاہب بھی اپنی عملی انسان دوستی سے پہچانے جاتے

ہیں۔ تمثیل کے آخر میں اسے یوں بیان کیا گیا ہے۔ عشق اختیار کرو، عصبیت سے آزاد ہو کر۔ نرمی، خلوص، تحمل، انسانی ہمدردی اور باری تعالیٰ کے حضور سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے۔ اس ڈرامے کا یہ منظر یہاں نمونے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے:

ایکٹ سوم۔ منظر ہفتم

صلاح الدین۔ ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں ہمیشہ عمدہ کہانیوں کی قدر کرتا ہوں۔

ناتھن۔ مگر عمدہ کہانیاں سنانا میرا خصوصی وصف نہیں ہے۔

صلاح الدین۔ تم پھر غیر معمولی انکسار سے کام لے رہے ہو۔ چلو شروع کردو اور ذرا عجلت برتو۔

ناتھن۔ پرانے زمانے میں مشرق میں ایک آدمی رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک انتہائی بیش قیمت انگوٹھی تھی جو اسے ایک محبوب شخصیت سے ملی تھی۔ اس انگوٹھی کا نگینہ بلوری تھا اور روشنی میں سینکڑوں رنگ اس میں جھلکتے تھے۔ اس میں یہ خوبی تھی کہ جو شخص اسے پہن لیتا وہ خداوند تعالیٰ اور انسان دونوں کا محبوب بن جاتا۔ چنانچہ یہ آدمی اس انگوٹھی کو اپنی انگلی سے کبھی جدا نہ کرتا تھا اور اس کی دلی تمنا تھی کہ یہ انگوٹھی ہمیشہ اس کے خاندان ہی میں محفوظ رہے۔ لہٰذا اس نے یہ انتظام کیا کہ یہ انگوٹھی اپنے سب سے چہیتے بیٹے کے حوالے کردی اور ساتھ ہی یہ وصیت بھی کی کہ بیٹا اپنے سب سے چہیتے بیٹے کو اور وہ اپنے چہیتے بیٹے کو یہ انگوٹھی منتقل کرتا رہے اور انگوٹھی حاصل کرنے والا شخص چھوٹائی بڑائی کے پیدائشی تصورات سے ماوراء ہو کر محض انگوٹھی کی وجہ سے خاندان کا سربراہ سمجھا جائے۔ سلطان عالی میرا مطلب سمجھ رہے ہوں گے۔

صلاح الدین۔ ہم سمجھ رہے ہیں۔ کہانی جاری رہے۔

ناتھن - اس طرح یہ انگوٹھی باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی رہی - یہاں تک کہ آخر کار یہ ایک ایسے باپ کے پاس پہنچی جس کے تین بیٹے تھے تینوں یکساں طور پر باادب، مطیع اور فرمانبردار تھے - باپ بھی ان تینوں کو یکساں چاہتا تھا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ جب کوئی ایک بیٹا اکیلا اس کے سامنے آتا اور اس سے گفتگو کرتا تو وہی یہ سوچتا کہ انگوٹھی اسی کو دے دے اور وہ ذہنی کمزوری کے لمحوں میں، ایک سے وعدہ بھی کر لیتا - کچھ عرصے تو یہ صورت حال برقرار رہی مگر آخر کار باپ کا پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا اور وہ پریشان ہو گیا - اُسے پریشانی یہ تھی کہ جن دو لڑکوں کو انگوٹھی نہیں ملے گی وہ کتنے دل گرفتہ ہوں گے - وہ سوچتا رہا کیا کرنا چاہئیے - آخر کار اس نے ایک سنار کو بلوایا اور دو ایسی انگوٹھیاں بنوانے کے لئے کہا جو ہو بہو اصل کے مطابق ہوں - اس نے سنار سے کہہ دیا کہ پیسے اور محنت کی پروا نہ کرو - بس ایسی انگوٹھیاں بنا دو جنہیں کوئی پہچان نہ سکے کہ یہ اصلی نہیں ہیں - سنار نے بڑی کامیابی سے یہ کام انجام دیا اور جب وہ نقلی انگوٹھیاں لے کر آیا تو خود باپ بھی ان میں اور اصلی انگوٹھی میں کوئی امتیاز نہ کر سکا - وہ بہت خوش ہُوا - تینوں لڑکوں کو علیحدہ علیحدہ بلایا - دعائیں دیں اور ایک ایک انگوٹھی حوالے کر دی - اس کے بعد اس شخص کا انتقال ہو گیا -

سلطان عالی کیا آپ سماعت فرما رہے ہیں -

(صلاح الدین نے پریشان ہو کر اس کی طرف سے رُخ موڑ لیا ہے)

ہاں ہم سُن رہے ہیں - ہم سُن رہے ہیں - بس کہانی کو جلدی سے ختم کر دو ذرا عجلت برتو -

ناتھن : میں اختتام پر ہوں - اس لئے کہ بعد میں جو کچھ ہوا وہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے - باپ کا کفن بھی میلا نہ ہونے پایا تھا کہ تینوں لڑکے اپنی اپنی انگوٹھیاں لے کر آ گئے اور ہر ایک نے خاندان کے سربراہ ہونے کا دعویٰ کیا - پہلے تو تینوں نے تفتیش کی - پھر جھگڑا ہوا اور آخر میں معاملہ عدالت میں پہنچا

مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کیونکہ اصلی انگوٹھی کا کوئی ثبوت نہیں تھا (ناتھن ذرا دیر ٹھہرتا ہے اور وقفے میں سلطان کے جواب کی توقع کرتا ہے) بالکل اسی طرح ناقابل ثبوت جیسے اب حقیقی مذہب کو پہچاننا ہمارے لئے ہے۔

صلاح الدین: کیا؟ تمہارا مطلب یہ ہے کہ یہ میرے سوال کا جواب ہے۔

ناتھن:۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر میں ان انگوٹھیوں میں کوئی فرق محسوس نہیں کرسکتا جو اس باپ نے اس خیال سے بنوائی تھیں کہ کوئی امتیاز نہ کیا جاسکے تو مجھے معاف کر دیا جائے۔

صلاح الدین۔ انگوٹھیاں، مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ جن مذاہب کے نام میں نے تمہارے سامنے لئے ہیں ان میں بہ آسانی امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ لباس، اکل وشرب ہر اعتبار سے۔

ناتھن۔ جی ہاں لیکن بنیادی اعتبار سے نہیں کہ ان سب کی بنیاد تاریخ پر ہے۔ یہ تحریری تاریخ ہو یا سینہ بہ سینہ منتقل ہوئی ہو اور بہر حال تاریخ کو خوش اعتقادی کے ساتھ قبول کرنا چاہیئے۔ اور ایسا ہی ہے۔ ہم اپنی تاریخ کو اسی طرح قبول کرتے ہیں اور اُن لوگوں کی تاریخ کو بھی جو ہمارے عزیز ہیں۔ ان لوگوں کی تاریخ جو ہمارے بچپن سے اب تک اپنی محبت کا ثبوت دیتے چلے آئے ہیں۔ جنہوں نے ہمیں کبھی دھوکا نہیں دیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ اپنے والد کی بات کو جس حد تک تسلیم کرتے ہوں میں اپنے والد کی بات کو اس سے کم سمجھوں یا آپ اپنے والد کی بات کو میرے والد کی بات سے کم سمجھیں۔ کیا میں آپ سے یہ درخواست کرسکتا ہوں کہ آپ میرے آباؤ اجداد کی تردید نہ کرکے اپنے آباو اجداد کو دروغ گو قرار دیں یا میں تردید نہ کرکے اپنے باپ دادا کو جھوٹا سمجھوں۔ یہی اصُول عیسائیوں پر بھی صادق آتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے۔

اس اقتباس سے لیسنگ کی فکری اور فنّی صلاحیتوں کا اندازہ ممکن ہے۔
اس نے حکائتوں کو بھی ادبی آب و رنگ عطا کیا۔ اس کے بقول حکایت ادبی اظہار کا ذریعہ اس وقت بنتی ہے جب ہم ایک عام اخلاقی بیان کو کسی مخصوص کیفیت پر منطبق کریں۔ اس مخصوص کیفیت کو حقیقی انداز بخشیں اور اس کے گرداگرد ایک کہانی کا جال بُن دیں جس سے وہ عام بیان واضح طور پر سامنے آجائے۔ رہ گئی یہ بات کہ زیادہ تر حکایات جانوروں سے متعلق ہیں جو انسانوں کی طرح عقل و نطق کے حامل ظاہر کئے گئے ہیں۔ اس ادبی اظہار کو حقیقت کا رنگ رُوپ دینے میں ممد و معاون ثابت ہوئی ہے۔ لیسنگ نے اس خامی یا خوبی کو حیوانات کے اس انفرادی کردار سے واضح کیا ہے جس سے عام طور پر سب واقف ہیں۔ اس نے بجا طور پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ عام طور پر ہر جانور کا ایک مخصوص کردار ہوتا ہے اور اسی مخصوص کردار کی وجہ سے قاری کے لئے اخلاقی نتیجے پر پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔ سبق آموز پیرائے کی وجہ سے روشن خیالی کے دور میں حکایت شہری طبقے میں مقبول ہوئی۔ یہاں لیسنگ کی دو حکائتیں پیش کی جا رہی ہیں جن سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ وہ اپنی بات کس طرح واضح کرتا تھا اور معمولی اور غیر نمایاں خامیوں پر بھی کس طرح تنقید کرتا تھا۔

(۱) تقدّم کے سلسلے میں جانوروں کا جھگڑا

جانوروں میں تقدّم کے سلسلے میں بڑا زبردست جھگڑا ہوا۔ گھوڑے نے جھگڑا ختم کرنے کی نیت سے کہا "آدمی سے مشورہ کرنا چاہیئے وہ اس جھگڑے میں فریق نہیں ہے لہٰذا وہ زیادہ غیر جانب دار ہوگا۔
کورموش کی آواز سنائی دی۔" اس میں اتنی عقل بھی ہے، ہماری خوبیوں کا جائزہ لینے کے لئے جو اکثر بے انتہا چھپی ہوئی ہوتی ہیں، بہترین دماغ کی ضرورت

ہو گی۔

"بڑا معقول خیال ہے" ــــــــ نے کہا

"ہاں ہاں بالکل" خار پشت بولا "مجھے تو یقین نہیں آتا کہ آدمی میں اتنی عقل ہے۔"

"خاموش" گھوڑے نے حکم دیا۔ "ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ جس کا معاملہ کمزور ہوتا ہے وہی سب سے پہلے فیصلہ کرنے والے کی عقل پر شبہ کرتا ہے۔"

(۲)

آدمی کو حکم بنا دیا گیا۔ شاہی دبدبہ رکھنے والے شیر نے پکار کر کہا "فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بات سن لو۔ ہماری خوبیاں جانچنے کے اُصول کیا ہوں گے؟"

"اصول کیا؟" آدمی نے جواب دیا۔ بس یہی کہ تم کس حد تک میرے لئے کارآمد ہو۔

"واہ واہ" شیر نے خفا ہو کر کہا۔ اس پیمانے کے لحاظ سے تو میں گدھے سے بھی بہت نیچے درجے پر ہوں گا۔ نہیں تو ہمارا حکم نہیں بن سکتا آدمی یہاں سے اُٹھ جا۔"

(۳)

آدمی چلا گیا

"ہاں تو پھر اب" کورموش نے مضحک انداز میں کہا۔

(اور خار پشت سر ہلاتے رہے) بھائی گھوڑے تم نے سُن لیا۔ شیر کا بھی یہی خیال ہے کہ آدمی ہمارا حکم نہیں بن سکتا۔ شیر ہمارا ہم خیال ہے۔"

"ہاں تمہارے دلائل کے مقابلے میں زیادہ بہتر دلائل کی وجہ سے۔" شیر نے ان پر حقارت سے نظر ڈال کر کہا۔

شیر کہنے لگا "جب میں تقدّم کے اس جھگڑے کے بارے میں صحیح صحیح غور کرتا ہوں تو یہ مجھے اپنے رُتبے سے گرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ تم مجھے اپنے درمیان سب سے زیادہ شان و شوکت والا سمجھو یا انتہائی کم مرتبہ۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ بس یہ کافی ہے کہ میں اپنے آپ کو پہچانتا ہوں اور وہ جلسے سے چلا گیا۔

دانا فیل نے اس کی تقلید کی۔ حوصلہ مند چیتا، مستعد بھالو، چالاک لومڑی اور شریف گھوڑے نے بھی یہی کیا۔ مختصر یہ کہ وہ سب جو اپنے مرتبے سے واقف تھے یا سمجھتے تھے کہ ان کا مرتبہ کیا ہے چلے گئے۔

جو سب سے آخر میں گئے اور جلسہ درہم برہم ہونے پر سب سے زیادہ بڑبڑائے، وہ بندر اور گدھا تھے۔

لڑکا اور سانپ

ایک لڑکا ایک پالتو سانپ سے کھیل رہا تھا۔ کھیلتے کھیلتے وہ سانپ سے کہنے لگا "پیارے سانپ۔ اگر تمہارا زہر نہ نکلا ہوتا تو میں تم سے بے تکلف کیسے ہوتا۔ تم بڑی بے ہودہ اور احسان فراموش مخلوق ہو۔ میں نے پڑھا ہے کہ ایک غریب کسان نے جھاڑی میں ایک سانپ دیکھا غالباً تمہارا کوئی پُرکھا ہوگا۔ یہ سانپ سردی سے جم گیا تھا۔ کسان کو اس پر رحم آیا اور اس نے سانپ کو گرمی پہنچانے کے خیال سے اُٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ بیہودہ سانپ نے گرمی پاتے ہی اپنے محسن کو ڈس لیا اور وہ رحمدل آدمی مر گیا"۔

سانپ نے جواب میں کہا "مجھے تعجب ہے کہ تمہارے وقائع نویس کتنی جانب داری برتتے ہیں۔ تمہارے رحمدل آدمی نے سانپ کو بالکل مردہ سمجھا تھا اور چونکہ وہ رنگ برنگا تھا۔ لہٰذا کھال اتارنے کے خیال سے اُسے

اٹھایا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ گھر لے جا کر اس کی خوبصورت کھال اتار لے۔ اب تم ہی بتاؤ یہ بات جائز تھی؟"

"چپ ہو جاؤ" لڑکے نے کہا "احسان فراموش ہمیشہ کوئی نہ کوئی عذر تلاش کر لیتے ہیں۔"

"بیٹا تم بالکل ٹھیک بات کہہ رہے ہو" لڑکے کے باپ نے جو یہ ساری گفتگو سن رہا تھا، درمیان میں بولتے ہوئے کہا "لیکن جب تم احسان فراموشی کا کوئی غیر معمولی واقعہ سنو تو کسی شخص کو ملزم گردانتے سے پہلے حالات کی پوری چھان بین کر لو۔ حقیقی محسن شاذ و نادر ہی احسان فراموشوں کے ساتھ مہربانی برتتے ہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ شاید کبھی نہیں، اور بنی نوع انسان کے اعزاز کے لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ ایسا کبھی نہ ہو۔ جو لوگ کسی غرض، مطلب یا لالچ کی وجہ سے مہربانی کرتے ہیں۔ وہی شکریے کے بجائے تکلیف اور پریشانی کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔"

لیسنگ کے مزاج کو پوری طرح واضح کرنے کے سلسلے میں ہم یہاں اس کے کچھ خطوط پیش کر رہے ہیں۔ یہ خطوط اس کی شفقت اور ہمدردی کی دستاویز قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ لیسنگ نے یہ خطوط اپنے بھائی کارل کا تعلق اور شیکسپیئر کے مترجم جوہان جوشم ایشنبرگ کو اس موقعے پر لکھے تھے جب اس کا لڑکا پیدائش کے فوراً بعد مر گیا تھا اور کچھ دن کے بعد اس کی بیوی کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ یہ خطوط معقولی لینگ کے عمیق جذبات ہی کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لیسنگ نے اپنے غم، تلخی اور غیر معتدل رجحان کے خلاف جو اس عظیم صدمے سے پیدا ہو چلا تھا کس طرح نبرد آزمائی کی۔ اگرچہ اس کا اطمینان ختم ہو گیا تھا تاہم اس نے عقل کی سکون بخش آواز سننے کی کوشش کی اور جن حالات سے وہ گزرا تھا ان میں نئے معنی تلاش کرنے کی جدوجہد کی۔

(۱)

ولفین بوٹیل

دسمبر ۳۱، ۱۷۷۷ء

جوہان جوشم ایشنبرگ کے نام

میرے پیارے ایشنبرگ

اس وقت میری بیوی بالکل بے سُدھ پڑی ہیں۔ اتنا وقت ہے کہ خط لکھ کر تمہاری مہربانی اور ہمدردی کا شکریہ ادا کر دوں۔ میری خوشی بہت مختصر تھی۔ مجھے اپنے بچّے کے انتقال سے بڑا صدمہ ہوا کیونکہ وہ بہت دانش مند تھا، بے حد دانش مند۔ یہ مت سوچنا کہ چند گھنٹوں کے لئے صاحبِ اولاد ہونے کی وجہ سے میں روایتی باپ بن بیٹھا ہوں بلکہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اُسے اچھی طرح سمجھتا بھی ہوں۔ یہ دانش مندی نہیں تو پھر اور کیا تھا کہ بچّہ دنیا میں آنے کے لئے قطعی تیار نہیں تھا۔ اور اُسے لوہے کے چمٹوں سے گھسیٹ کر دنیا میں لایا گیا؟ پھر یہ کہ اُسے یہاں کی خرابیوں کا فوراً اندازہ ہوگیا اور وہ موقعہ ملتے ہی یہاں سے واپس چلا گیا۔ مصیبت یہ ہے کہ اب یہ جھنڈولا ننھا اپنی ماں کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹ رہا ہے۔ اب تک اس بات کی اُمید بہت کم ہے کہ میں انہیں اپنے ساتھ رکھ سکوں گا۔ میں بھی دوسرے انسانوں کی طرح خوش ہونا چاہتا تھا مگر میں بدقسمت رہا۔

لیسنگ

(۲)

جنوری ۳، ۱۷۷۸ء

میرے پیارے ایشنبرگ

اب میں پھر تھوڑا تھوڑا سا پُر امید ہو رہا ہوں۔ کل سے ڈاکٹر مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ شاید اس دفعہ میری بیوی کی رفاقت برقرار رہے گی۔ مجھے اس سے جو سکون ہوا ہے اس کا اندازہ تم اس امر سے کر

سکتے ہو کہ میں اپنے مذہبی تنازعات پر پھر غور کر رہا ہوں اور اگر تم مجھے وہ مخصوص گزٹ بھیج دو تو میں بے حد ممنون ہوں گا۔

لیسنگ

(۳)

وُلفن بوٹیل

۵ جنوری ۱۷۷۸ء   کارل گاتھلف لیسنگ کے نام

پیارے بھائی!

میری غم خواری کرو، کیونکہ اس عرصے میں تم نے میرے سوتیلے بیٹے کے ساتھ جس غیر معمولی مہربانی کا برتاؤ کیا ہے اس کے باوصف تمہیں خط نہ لکھنے کا بہت معقول جواز میرے پاس ہے۔ گزشتہ پندرہ دن میری زندگی کا انتہائی غم انگیز دور تھے۔ اس بات کا خدشہ تھا کہ میں اپنی بیوی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاؤں۔ یہ ایسا نقصان تھا جو میری باقی زندگی کو یاس انگیز بنا دیتا۔ ان کے یہاں ایک بھولا بھالا لڑکا پیدا ہوا تھا جو تندرست اور توانا تھا لیکن وہ صرف چوبیس گھنٹے ہی تندرست رہا اور پھر اس بے رحم طریقے کا شکار ہو گیا جس کے ذریعے اُسے دنیا میں گھسیٹا گیا تھا، یا یوں سمجھو کہ اسے اس دعوت سے کوئی خاص توقع نہیں تھی جس میں وہ آتنی زبردستی کے ساتھ مدعو کر لیا گیا تھا اور اسی وجہ سے چپ چاپ کھسک گیا۔ مختصر یہ کہ مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ میں باپ بن گیا ہوں۔ میری خوشی بہت مختصر تھی اور میرے رنج میں پریشانیاں بہت زیادہ تھیں کیونکہ بچے کی ماں نو دس دن تک بالکل بے سُدھ پڑی رہی اور ہر دن ہر رات مجھے اس کے بستر سے اٹھا اٹھا کر بار بار یہ سننا پڑتا تھا کہ میں اس کے آخری لمحے اور زیادہ جانگزا بنا دوں گا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ بے سُدھ ہونے کے باوجود مجھے پہچان لیتی تھی۔ آخرکار

بیماری اپنی حد کو پہنچ گئی اور پھر اس نے رُخ بدلنا شروع کر دیا گزشتہ تین دن سے مجھے واضح طور پر یہ اُمید دلائی گئی ہے کہ وہ زندہ رہے گی۔ وہ جو اپنی موجودہ حالت کے باوصف ہر لمحے میرے اور قریب آتی جا رہی ہے۔

گزشتہ چودہ دن تک خط نہ لکھنے کے لئے تم مجھے معاف کر دینا اور اس وقت بھی تم نے یقیناً مجھے معاف کر دیا ہو گا کہ میں زیادہ نہیں لکھ سکا۔ مجھے یہ سوچ کر بڑی تکلیف ہو رہی ہے کہ ہمارے سوتیلے بیٹے نے تمہیں پریشان کیا۔ خداوند تعالیٰ تمہیں ان حالات میں خوش و خرم رکھے۔

گاتھولڈ

جوہان جوشم الیشن برگ کے نام — ولفین بوٹیل

۱۲ر جنوری ۱۷۷۸ء

میرے پیارے الیشن برگ

کل صبح میں نے آخری بار اپنی بیوی کو دیکھا۔ کاش بقیہ زندگی کا آدھا حصّہ مجھ سے لے لیا جاتا اور اس کے بدلے آدھا حصّہ اپنی بیوی کے ساتھ گذارنے کا موقع مل جاتا تو مجھے کتنی خوشی ہوتی مگر یہ ناممکن ہے اور اب مجھے زندگی کی راہ پر پھر سے چلنا ہے۔ سکونِ خاطر کے لئے ادبی اور دینی تصانیف سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کروں گا اور دن گزاروں گا۔ اس سلسلے میں ملتمس ہوں کہ جانسن کی انگریزی لغت سے ثبوت کا موضوع والا پورا مقالہ مع حوالوں کے نقل کرا کر مجھے بھیج دو۔ یہ تو مجھے یاد ہے کہ میں نے اسے پڑھا تھا مگر ذہن میں محفوظ نہیں۔ اس کی نقل اُسی سے کراؤ جس نے پہلے مقالہ کی نقل کی تھی۔ مَیں جب برنسوک آؤں گا تو دونوں کی اُجرت ادا کر دوں گا۔

جارج کرسٹوف لِشن برگ

جارج کرسٹوف لِشن برگ (۱۷۴۲-۱۷۹۹) ماہر طبیعات اور مصنّف تھا اس نے روشن خیالی کے تصور کے لئے سائنس داں کی حیثیت سے یوں کام کیا کہ توہم کے خلاف چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھیں۔ اس کی شہرت اس کے "اقوال" پر مبنی ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے جملے ہیں جن کو بڑی خوبی سے تصنیف کیا گیا ہے۔ ان سے ناقدانہ ذہن کا اظہار ہوتا ہے جو شدّت کے ساتھ رسمی طرزِ فکر کا مخالف ہے اور اس شعور کو بیدار کرنا چاہتا ہے جس سے عوام آج بھی محروم ہیں۔

اقوال

یہ کوئی اہم بات نہیں ہے کہ سورج کسی بادشاہ کی حکومت میں جیسا کہ ایک زمانے میں اسپین کا دعویٰ تھا غروب نہیں ہوتا۔ اہم بات یہ ہے کہ سورج کو اس حکومت میں اپنا روزانہ کا سفر طے کرنے میں کیا کیا نظر آتا ہے۔

اگر کوئی مسافر کسی دور دراز کے جزیرے میں ہر مکان میں بھری ہوئی بندوقیں لٹکی دیکھے اور آدمیوں کو پہرہ دیتے ہوئے پائے تو وہ ضرور یہ نتیجہ نکالے گا کہ اس جزیرہ پر ڈاکوؤں کا قبضہ ہے۔ کیا یہی عالم یورپ کی مختلف قوموں کا نہیں ہے؟ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان آدمیوں پر جو قانون کا احساس نہیں رکھتے مذہب کوئی اثر نہیں رکھتا۔ یا یہ کہ ہم سچے مذہب سے کس قدر دُور ہیں۔

میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کارنامے کس کے لئے انجام دئے گئے تھے جن کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ مادرِ وطن کے لئے انجام دئے گئے تھے۔

سوال یہ ہے کہ جب ہم کسی قاتل کو دار پر چڑھاتے ہیں تو ہم اس بچّے کی سی غلطی تو نہیں کرتے جو اس کرسی کو مارتا ہے جس سے وہ ٹکرا جاتا ہے۔

جب تم کسی مشہور مجرم کا قصہ پڑھو تو اس کو بُرا کہنے سے پہلے خدا کا شکر ادا کرو کہ خدا نے تمہیں ان حالات میں نہیں ڈالا جن میں تم بھی یہ جرم کر بیٹھتے۔

فریڈرک دوم

ردّ میکاولی

فریڈرک اعظم (۱۷۸۶ - ۱۷۱۲) جو ۱۷۴۰ء میں پروشیا کا بادشاہ ہوا روشن خیالی کے تصورات کی وجہ سے اپنے معاصرین میں محترم سمجھا جاتا تھا اس نے اپنی سیاسی فراست اور متعدد جنگی فتوحات کی وجہ سے پروشیا کو یورپ کی ایک اہم قوت تسلیم کرالیا۔ اس نے مُلکی معاملات میں قانون، زراعت اور تجارت کو متعدد اصلاحات سے ترقی دی۔ وہ مطلق العنان بادشاہ تھا مگر اپنے آپ کو ظل اللہ کہنے کے بجائے اس نے خود کو حکومت کا پہلا خادم قرار دیا۔ اس نے "ردّ میکاولی" تخت نشین ہونے سے ایک سال قبل ۱۷۳۹ء میں لکھی تھی۔ یہ نکولو میکاولی کی "دی پرنس" کی جو ۱۵۱۳ء میں شائع ہوئی تردید تھی۔ میکاولی (۱۵۲۷ - ۱۴۶۹) اطالوی نشاۃ الثانیہ کا سیاست داں اور مورخ تھا اور اس کی تصانیف کی بابت یہ رائے عام ہوگئی تھی کہ وہ فرماں رواؤں کو اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے غیر اخلاقی طریقے بھی استعمال کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ فریڈرک اعظم کا مقالہ روشن خیالی کے انسانیت پسند نصب العین پر مبنی ہے اگرچہ اس نے میکاولی کے اقوال کی سختی سے تردید کی ہے۔ تاہم وہ میکاولی کے عہد سے وہی مؤرخانہ واقفیت رکھتا ہے جو اُسے اپنے عہد سے حاصل تھی لیکن وہ اپنی نوجوانی کی اس تصنیف کے نصب العین پر ہمیشہ قائم نہیں رہا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے قوت حاصل کرنے کے لئے جنگیں شروع کردیں۔ تاہم اس کی داخلی پالیسی اور اس کے ذہن کی علویت نے اسے ایک روشن خیال بادشاہ بنا دیا۔

ردّ میکاولی

(اقتباس باب سوم)

پندرھویں صدی جس کا ایک فرد میکاولی تھا وحشت و جہالت سے پُر تھی۔ اس وقت فاتحین کی شہرت اور ان کے غیر معمولی کارنامے جو اپنی عظمت کی وجہ سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں رحم دلی، انصاف اور نیکیوں سے بہتر مانے جاتے تھے۔ اب نیک دلی کو فاتحین کی تمام صلاحیتوں پر ترجیح دی جاتی ہے کیونکہ اب لوگ اتنے احمق نہیں ہیں کہ وہ ان وحشیانہ جذبات کو اُبھاریں جو دُنیا کی تباہی کا سبب بنتے ہیں۔

میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کون سی چیز انسان کو بڑا بننے کی ترغیب دے سکتی ہے؟ وہ کون سا سبب ہے جو دوسرے لوگوں کو برباد کرکے اپنی قوت بڑھانے پر آمادہ کرتا ہے حالانکہ دوسروں کو تباہ و برباد کرنے کے بعد وہ نیک نامی کی توقع کیسے کرسکتا ہے؟

نئی فتوحات کسی فرماں روا کے پُرانے مقبوضات کو مالدار نہیں بنائیں، اس کی رعایا کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ ان فتوحات سے اسے زیادہ مسرت حاصل ہوئی تو وہ غلطی پر ہے۔ ایسے بھی فرماں روا ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے سرداروں کے فتح کئے ہوئے صوبے دیکھے بھی نہیں۔ لہٰذا یہ صرف خیالی فتوحات ہوئیں جن کا وجود فاتح فرماں روا کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک شخص کی، جو تعریف کے قابل ہی نہیں، صرف مرضی پوری کرنے لئے بے شمار لوگوں کو تکلیف پہنچائی گئی۔

فرض کیجئے کہ یہ فاتح تمام دنیا کو تسخیر کرلیتا ہے تو کیا وہ اس پر حکومت بھی کرسکتا ہے؟ وہ کتنا ہی بڑا فرماں روا کیوں نہ ہو انسانی حدود سے تجاوز نہیں

کر سکتا۔ اسے اپنے مقبوضات کے نام بھی یاد نہیں ہوتے اور اس کی بڑائی عام لوگوں پر یہی ظاہر کرتی ہے کہ وہ کس قدر چھوٹا آدمی ہے۔

کسی ملک کے طول و عرض سے وہاں کے فرماں روا کو عزت حاصل نہیں ہوتی اور زیادہ علاقہ حاصل کرنے سے بادشاہ کی شہرت نہیں ہوتی۔ ورنہ وہی لوگ سب سے زیادہ مشہور ہوتے جن کے پاس سب سے زیادہ علاقہ ہوتا۔

فاتحین کی شہرت کے ضمن میں میکاولی کی غلط فہمی اس کے زمانے کی عام غلط فہمی تھی مگر اس کی بدنیتی عام نہیں تھی۔ مفتوحہ ملکوں پر قبضہ رکھنے کے جو طریقے اس نے بیان کئے ہیں وہ یقیناً بدترین ہیں۔

ان طریقوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی عقل اور انصاف پر مبنی نہیں ہے۔ اس بدطینت آدمی کا کہنا ہے کہ مفتوح بادشاہ کے خاندان کو بالکل ختم کر دینا چاہیئے۔ کوئی بھی ان طریقوں کو غم و غصہ کے بغیر نہیں پڑھ سکتا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ دنیا کی تمام مقدس چیزوں کو پیروں تلے کچل دیا جائے اور خود غرضی کے لئے تمام برائیوں کے دروازے کھول دئے جائیں۔ اگر ایک حوصلہ مند آدمی نے کسی فرماں روا کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے تو کیا اسے یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ اس فرماں روا کو قتل کرا دے یا زہر سے ختم کرا دے؟ مگر یہ فاتح ایسی ہی روایت قائم کرتا ہے جو آخر کار اسے بھی برباد کر دیتی ہے۔ کوئی اس سے زیادہ حوصلہ مند آدمی جو اس سے زیادہ ہوشیار ہوگا اس کو اسی کے اصول پر سزا دے گا اس کی زمین پر قابض ہوگا اور اس کو بھی اسی بے رحمی سے ختم کرے گا جس بے رحمی سے اس نے اپنے پیش رو کو ہلاک کیا۔ میکاولی کا دور ہمارے سامنے ایسی بہتری مثالیں لاتا ہے۔ کیا پوپ الگزنڈر ششم اپنی برائیوں کی بنا پر خطرہ میں نہیں پڑا۔ کیا اس بدمعاش لڑکے سیزر بورجیا سے تمام مفتوحہ ملک نہیں چھن جاتا اور وہ حسرتناک موت نہیں مرتا؟ گیلیاز و سنورزا کو میلان کے گرجے کے وسط میں نہیں مارا گیا؟ اور غاصب لوڈ ویکو سفورزا کو فرانس میں ایک آہنی پنجرے میں موت نصیب نہیں ہوئی۔

یارک اور لنکاسٹر کے شہزادے ایک دوسرے کو برباد کردیتے ہیں۔ یونانی شہنشاہ ایک دوسرے کو قتل کرتے رہے یہاں تک کہ ترکوں نے ان کے مظالم سے فائدہ اٹھا کر ان کی کمزور حکومت کو ختم ہی کر دیا؟ اس وقت اگر عیسائی حکومتوں میں بغاوتیں کم ہوگئی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ صالح اخلاق کی اہمیت بڑھ رہی ہے۔ آدمیوں کے ذہن زیادہ پختہ ہو چلے ہیں، بہیمیت کم ہوگئی ہے اور شاید ان عالموں کی وجہ سے کم ہوئی ہے جنہوں نے یورپ کی اصلاح کی ہے۔

میکاولی کا دوسرا اصول یہ ہے کہ فاتح کو اپنا مستقر نئے مقبوضات کے درمیان بنانا چاہیئے۔ یہ بات ظالمانہ نہیں ہے اور بعض حالات میں عمدہ معلوم ہوتی ہے مگر یہ واضح رہے کہ فرماں رواؤں کے زیادہ علاقے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ رعایا کو متاثر کئے بغیر اپنے مستقر سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔
وہ اپنی حکومت کا متحرک مرکزی نقطہ ہوتے ہیں اور مرکزی نقطے کی جگہ بدلنے سے دور دراز کے علاقے کمزور پڑ جاتے ہیں۔

میکاولی کے بقول حکومت کا تیسرا اصول نئے فتح کئے ہوئے علاقوں میں نوآبادیاں قائم کرنا ہے تاکہ اطاعت و فرماں برداری حاصل ہو۔ مصنف اہلِ روم کے اصولوں کی طرف اشارہ کرتا ہے مگر وہ یہ غور نہیں کرتا کہ اگر رومی نئے علاقوں میں نوآبادیاں قائم کر کے وہاں اپنے سپاہی نہ بھیجتے تو جلد ہی ان علاقوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ وہ اس پر بھی غور نہیں کرتا کہ رومی یہ جانتے تھے کہ ان کالونیوں میں اپنے دستوری دوست کیسے بنائیں۔ رومی جمہوریہ کے دور میں یہ رومی سب سے زیادہ ذہین ڈاکو تھے۔ جو چیز وہ ظلم سے حاصل کرتے تھا سے ذہانت سے اپنے قبضے میں رکھتے تھے۔ آخر کار یہ قوم بھی فاتحین کے معینہ انجام کو پہنچی یعنی تباہ ہوگئی۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ نوآبادیاں جن کے لئے میکاولی ہر ظلم جائز رکھتا ہے ایسی ہی مفید ثابت ہوتی ہیں جیسی کہ اسے توقع ہے۔ نئے مقبوضات میں یا تو طاقتور لوگ بھیجے جاتے ہیں یا کمزور۔ اگر طاقتور لوگ جائیں گے تو حکومت کی آبادی

نمایاں طور پر کم ہو جائے گی۔ بہت سی نئی رعایا بھاگ جائے گی اور حکمران کی قوت کم ہو جائے گی۔ اگر کمزور لوگ بھیجے جائیں گے تو نظم ونسق کمزور ہو گا رعایا کو خواہ مخواہ تکلیف ہو گی۔ لہذا تکلیف اٹھانے والے لوگ کم ہو جائیں گے اور اس سے کسی کو کوئی فائدہ نہ ہو گا۔

مناسب یہ ہے کہ نئے مقبوضات میں سپاہی بھیجے جائیں۔ جو اپنی فوجی تربیت کی وجہ سے رعایا کو پریشان اور مقبوضہ شہروں کو ویران نہ کریں۔ یہ پالیسی بہتر ہے مگر میکاولی کے زمانہ میں اس کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس وقت فرماں رواؤں کے پاس طاقتور فوج نہیں ہوتی تھی۔ سپاہی زیادہ تر ڈاکو ہوتے تھے جو لوٹ مار پر زندگی بسر کرتے تھے۔ اس وقت تک یہ احساس نہ تھا کہ امن کے زمانے میں فوج رکھنے سے کیا فائدہ ہے، ان کو چھاونیوں کے قائم کرنے کا کوئی تجربہ نہ تھا اور یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ زمانۂ امن میں فوج رکھنے سے پڑوسیوں اور کرائے کے فوجیوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

فرماں روا کے لئے لازم ہے کہ وہ پڑوس کے چھوٹے چھوٹے حاکموں کو اپنا مطیع بنائے رہے اور ان میں نا اتفاقی کے بیج بوتا رہے تاکہ وہ حسب منشا انہیں پست و بلند کر سکے۔ یہ میکاولی کا چوتھا اصول ہے۔ جاہلیت کے پہلے حکمران کلاڈوگ نے جو عیسائی ہو گیا تھا دوسرے حکمرانوں نے اس کی پیروی کی۔ مگر ان ظالموں اور اس منصف مزاج حکمران کے درمیان بہت فرق ہے۔ جو ان حاکموں کے جھگڑوں کو امن سے سلجھاتا ہے۔ ایمانداری سے ان کو مطمئن کرتا ہے۔ اور اپنی غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتا ہے اس کی ذہانت اسے پڑوسیوں کا مربی بنا دیتی ہے اور اس کی قوت ان کی حفاظت کرتی ہے۔

یہ بھی صحیح ہے کہ جو حکمران دوسرے حکمرانوں کو قوت کے ذریعہ بڑھاتے ہیں وہ اپنی بربادی کے بانی ہوتے ہیں۔ موجودہ صدی میں اس کی دو مثالیں سامنے ہیں۔ ایک چارلس دوازدہم کی جس نے پولینڈ میں اسٹانسلامی کو بڑھایا اور دوسری بھی قریب

زمانے کی ہے۔

اسی لئے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ فاتح کبھی نیک نام نہ ہوگا۔ قتل ہمیشہ انسان کو ناپسند رہے گا۔ جو حکمران اپنی رعایا پر ظلم کریں گے وہ انہیں اپنا دشمن بنا لیں گے۔ ظلم کا جواز ناممکن ہے ایسا کرنے والا میکاولی ہی جیسا فیصلہ کرے گا۔

انسانی فلاح و بہبود کے خلاف تبلیغ کرنا ایسا ہی ہوا جیسے کہ ہم اپنے کو اس تلوار سے زخمی کریں جو ہمیں حفاظت کے لئے دی گئی ہے۔
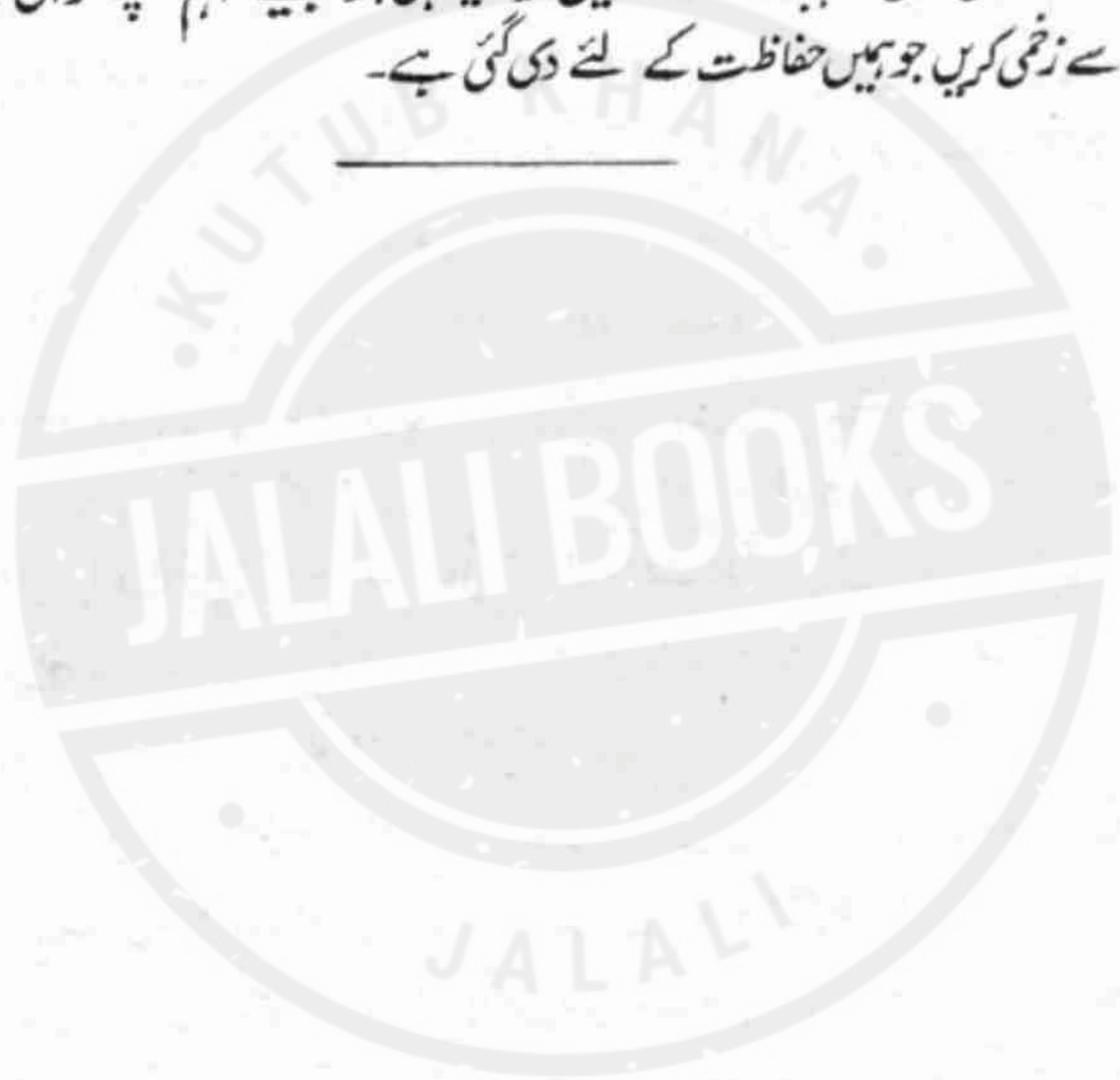
اڈولف فریر فون کینگ

کچھ عوامی رابطے کے بارے میں

اڈولف فریر فون کینگ (۱۷۹۶ - ۱۷۵۲) نے بہت سی کتابیں لکھیں مگر جو کتاب آج بھی نمایاں ہے وہ ۱۷۸۸ء میں لکھی گئی۔ اس کا نام "کچھ عوامی رابطے کے بارے میں" ہے۔ یہ کتاب دیکھتے ہی دیکھتے مقبول ہوگئی۔ جرمنی کا بچہ بچہ اس کے نام سے واقف ہے۔

یہ کتاب ہر طبقہ کے لوگوں کے باہمی تعلقات پر ہے۔ یہ خاندان سے شروع ہوکر معاشرے کے ہر طبقہ کے بارے میں ہدایت کرتی ہے۔ اس میں عام کلیے ہیں اور خاص مواقع پر عمل کی ہدایات بھی ہیں۔ اخلاقی اصولوں کے ساتھ دنیا کی دانائی سموئی ہوئی ہے۔ روشن خیالی کے دور میں عوام تک پہنچنے کی یہ اچھی مثال ہے۔ کینگ کے کلیئے ان امراء پر تنقید بھی ہیں جو اپنی دولت کی بناء پر بدکار ہو جاتے ہیں۔ یہ صرف اسی ریاکار طبقے پر حملہ نہیں بلکہ آسمانی حق کے خلاف روشن خیالی کی اہمیت بھی ظاہر کی گئی ہے۔ اور عوام کی حکومت کے بارے میں بھی ایسے خیالات ظاہر کئے گئے ہیں کہ جمہوری نظام کا تصوّر صاف سامنے آجاتا ہے۔

دُنیا کے طاقتوروں، حکمرانوں، خاندان والوں اور دولتمندوں سے تعلقات کے بارے میں یہ کہنا بے انصافی ہوگی کہ فرماں روا، خاندانی لوگ اور دولت مند ایسی خرابیاں رکھتے ہیں جو انہیں اکھل کھرا، سخت دل اور دوستی کے ناقابل بنادیتی ہیں۔ مگر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ رائے ان میں سے زیادہ تر لوگوں کی بابت صحیح ہے ان لوگوں کی تعلیم صحیح نہیں ہوتی۔ بچپن ہی سے وہ چاپلوسی سے بگاڑ دیئے جاتے ہیں اور خودپسندی انہیں خراب کردیتی ہے کیونکہ ان کی حیثیت انھیں ہر ضرورت سے بالاتر بنادیتی ہے وہ کسی تکلیف یا غم میں مبتلا نہیں ہوتے۔ وہ یہ نہیں محسوس کر پاتے کہ انسان کو ایک دوسرے کی کس قدر ضرورت ہے ۔ تکالیف کو اکیلے

برداشت کرنا کتنا مشکل ہے۔ ہمدرد لوگوں کی دوستی کتنی اطمینان بخش ہوتی ہے۔
دوسروں کا خیال کرنا یوں اہم ہے کہ ایک دن ہمیں ان کے پاس پناہ ملے گی۔ وہ
خود آگاہی سے باز رہتے ہیں کیونکہ ان کے ساتھی خوف یا امید کی وجہ سے ان کی
خامیوں کے بُرے نتائج کو ان پر روشن نہیں ہونے دیتے۔ وہ اپنے کو اعلیٰ قسم کی
مخلوق سمجھتے ہیں۔ جو قدرت کی طرف سے حکومت کے لئے تخلیق کی گئی ہے اور
ادنیٰ درجے کے لوگ محض ان کی خود پرستی اور غرور کے سامنے سر جھکانے، ان
کے احکام کی تعمیل کرنے اور ان کے خوابوں کو حقیقت بنانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

یہ طے کرنے کے بعد کہ اعلیٰ طبقے کے زیادہ تر لوگ اسی طرح کے ہیں، ہم
ان سے تعلقات پیدا کرنے کے طریقے سوچتے ہیں۔ ان میں اگر ایسے لوگ ملیں جو
نیکیوں کے ساتھ ایک خاندانی زعم، بہتر تہذیب، فیاضی اور شائستگی یعنی وہ
سب صفات رکھتے ہیں جو مناسب تعلیم سے پیدا ہوتی ہیں تو وہ بہت دلچسپ
ہو جاتے ہیں۔ میں یہ بات زور دے کر کہتا ہوں کہ حکمرانوں میں بھی ایسے لوگ
ہیں مگر کم۔ اور جو ہیں وہ زیادہ تر غیر معروف رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں زیادہ
خوش فہم نہ ہونا چاہیئے۔ اور نہ صحافیوں کی بات ماننا چاہیئے۔ میں نے اکثر دیکھا
ہے کہ جن رئیسوں کی بتوں کی طرح پرستش کی جاتی ہے، عوام کا محبوب
بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ انسان کا محسن، نیکی اور عظمت کا مجسمہ قرار دیا جاتا ہے،
جب انھیں قریب سے دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ؏

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

بہترین بڑے لوگ وہ نہیں ہیں جن کی بابت لوگ زیادہ تر باتیں کرتے ہیں خواہ
یہ گفتگو تحسین کے سلسلے میں ہو یا مذمت میں ہو۔ ایسے رئیسوں اور ان کے
بچوں کو برباد کرنے میں حصہ نہ لو۔ ان کے زعم، ان کی بے راہ روی، ان کی خود بینی
اور ان کے عیش میں منہمک ہونے کی تعریف نہ کرو۔ ان کی نام نہاد پیدائشی صلاحیتوں،
حقوق، مذہبی اہمیت وغیرہ کی تائید نہ کرو۔ ریاکار نہ بنو، حق کو نہ چھپاؤ چاہے

وہ کتنا تلخ کیوں نہ ہو۔ تمیز کے ساتھ بے باک ہو جاؤ اور اپنے کو نقصان سے بچاؤ۔
مظلوم نیکی۔ بدنام عزّت۔ باعزّت شخص جس کی شہرت دربار کی چالوں سے برباد ہو گئی
ہو ان کی طرف داری کرو مگر ایسی ہوشیاری سے کہ دشمن کو زیادہ غصہ بھی نہ آئے اور
اپنی عزّت بھی نہ جائے۔ جہاں تک عقلمندی کے موافق ہو ان لوگوں کی خواہشوں،
نیک نامی اور صحیح التجاؤں کی حمایت کرو جو کمزور، غریب یا پست ہیں
اور اسی وجہ سے محلوں کے قریب نہیں پہنچ سکتے۔ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ کسی معقول
آدمی کی رائے بڑے آدمیوں پر اثر کر سکتی ہے۔ بڑے لوگ ہر بات کو اپنے فائدے
کے مطابق سمجھتے ہیں۔ اور کسی شخص کی رائے سے متاثر نہیں ہوتے۔

اگر تمہاری خوشگوار بدقسمتی یہ ہے کہ کسی کمزور بُت کے منظور نظر بن گئے ہو تو یہ
نہ سمجھو کہ یہ خوشی قائم ہی رہے گی۔ کوئی اور چاپلوس تم کو تمہاری جگہ سے ہٹا دے گا۔
اپنے سلطان پر یہ ظاہر کر دو کہ تم اس کے کرم پر پورا اعتماد نہیں کرتے۔ لوگوں کو بھی
یہ سمجھا دو کہ تم خواہ مخواہ کے فائدوں کی پروا نہیں کرتے اور ایسے وقتی فائدے اخلاقی
زندگی کے لئے کس قدر بے معنی ہیں۔ اب اگر تم بربادی میں پڑ جاؤ گے تو تم سے بہتر
لوگ تم سے نہیں کریں گے اور ظالم بھی یہ محسوس کرلے گا کہ ایسے لوگ ہیں۔ جو
اس کی مدد کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں۔ امرا کی دوستی اور وفاداری پر بھروسہ نہ کرو
وہ تمہاری اس وقت تک عزّت کرتے ہیں جس وقت تک انہیں تمہاری ضرورت
ہے۔ وہ ڈھلمل یقین ہوتے ہیں۔ وہ بُرائی میں اچھائی سے زیادہ یقین رکھتے ہیں۔
اور ہر اس آدمی کی بات مان لیتے ہیں جو انہیں آخر میں پٹی پڑھا دے۔ ان رئیسوں
کی نگاہِ کرم سے فائدہ اٹھا کر ان میں انصاف پسندی، وفاداری اور عوام دوستی کے
جذبے کو فروغ دو ۔ ان کو یہ نہ بھولنے دو کہ عوام کی مرضی ہی میں ان کا فائدہ ہے
اور اگر انہیں ناراض کر دیا جائے گا تو یہ فائدہ ختم ہو جائے گا۔ انہیں یہ نہ بھولنے دو
کہ جو کچھ ان کے قبضہ میں ہے وہ ہمارا ہے۔ ہم ہی نے انہیں حیثیت، عزت اور تحفظ
عطا کیا ہے۔ اور ہم ہی ان کی تفریح کے لئے رقم مہیا کرتے ہیں اور آخری بات یہ

کہ انہیں نہ بھولنے دو کہ روشن خیالی کے اس دور میں یہ یقین برقرار نہیں رہ سکتا کہ ایک فرد جو شاید سب سے زیادہ کمزور ہے پیدائشی حقوق کا دعویٰ کرکے اپنے سے ہزاروں بہتر لوگوں کو بیوقوف بناتا رہے گا ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر احسان مند عوام جن کے وہ صحیح معنوں میں خادم ہیں ان کا خیال کریں۔ اور ان کی نجات کے طلبگار ہوں تو پھر یہ رؤسا کسی حفاظت کے بغیر چین سے پیر پھیلا کر سو سکتے ہیں۔

یہ بات مناسب ہے کہ طبقۂ امراء کے کچے کانوں تک پہنچانے کے لئے حقائق کو کسی حد تک گوارا انداز میں پیش کیا جائے ورنہ ان کا اچھا اثر نہیں ہوگا۔

جوہان گاٹ فرائڈ ہرڈر

صرف ابتدائی تنقیدی مضامین کی وجہ سے جوہان گاٹ فرائڈ ہرڈر (۱۷۴۴-۱۸۰۳ء) کو روشن خیالی کا نمائندہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کی فلسفیانہ تصانیف میں جو خیالات ملتے ہیں ان سے روشن خیالی کے فلسفہ کو عام ہونے میں مدد ملی۔ اس کے کچھ خیالات جیسے "تاریخ انسانیت کی طرف آدمی کی راہ" ہے اسی فلسفہ سے ہم آہنگ ہیں۔ مگر دوسرے خیالات جیسے تہذیب کا تاریخ پر مبنی ہونا اور شاعری کا نیا تصوّر اس فلسفہ کے مخالف ہیں۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اس نظام کے خلاف جو عقل پر مبنی ہونے کی وجہ سے غیر جذباتی ہے، جذبات کو قوت دینا ضروری ہے۔ ہرڈر کی رائے میں شاعری انسان کے فطرت سے ربط رکھنے کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے۔ یہ طبعزاد ہوتی ہے اور اسی لئے کسی خاص صنف سے بے نیاز ہوسکتی ہے۔ چنانچہ ہرڈر نے لوک گیتوں کی طرف توجہ دلائی اور ہر دَور کے عوامی گیت خود بھی جمع کئے۔

شاعری اور زبان کے بارے میں ہرڈر کے نظرئے کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے "سچے شاعر کو اپنی زبان میں لکھنا چاہیئے"۔ زبان، شاعری اور فکر ایک قبیل کی چیزیں ہیں اور انہیں الگ نہیں کیا جاسکتا۔ زبان محض خیالات کی ترسیل کا ایک ذریعہ نہیں۔ اگرچہ اسے محض ابلاغ سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی الگ قوت رکھتی ہے جذبات اور خیالات کی تشکیل کرتی ہے۔ زبان کا سرمایہ اس کی صفائی اور عقلی صفات ہی نہیں بلکہ اس کی قوت اور وہ معروضی انداز ہے جو اُسے قدرت سے وابستہ رکھتا ہے۔ ذیل کی مثال ثابت کرتی ہے کہ ہرڈر نے فلسفیانہ زبان نہیں استعمال کی۔ بلکہ اس نے جذبہ کے ساتھ تخیلی طرز اختیار کیا۔ اس کی ایک حکایت "دائمی بوجھ" اور کافسیگ کی حکایات سے مقابلہ کرکے اسے روشن خیالی کے عہد سے وابستہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ اس کا پس منظر دیار غیر ہے۔

ہر چند کہ اس میں یورپ کے حالات کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

سچّے شاعر کو اپنی ہی زبان میں لکھنا چاہیئے

میں ایک قدم آگے جاکر یہ کہوں گا کہ اگر شاعری میں خیالات اور طرزِ ادا اسی طرح ایک دوسرے سے اتنے ہم آہنگ ہیں تو مجھے یقیناً اسی زبان میں لکھنا چاہیئے جس کے الفاظ کی بابت مَیں رائے دینے کا سب سے زیادہ اہل ہوں۔ جن الفاظ پر مجھے سب سے زیادہ قدرت حاصل ہے جن کی بابت مجھے پورا علم ہے یا کم از کم یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرا زعم مجھے بے اصولی کی طرف نہیں لے جا سکتا۔ یقیناً یہ زبان میری مادری زبان ہی ہو سکتی ہے۔ یہی وہ زبان ہے جو میرے ذہن پر سب سے پہلے جمائی گئی۔ بچپن کے زمانے میں جب ہم الفاظ کے ذریعہ سے خیالات اور تصوّرات کی دنیا کو جذب کرتے ہیں۔ یہی دنیا شاعر کے لئے ایک خزانہ بن جاتی ہے۔ اپنی مادری زبان میں شاعر بڑی آسانی سے سوچ سکتا ہے اور ان تصوّرات اور رنگوں تک پہنچ سکتا ہے جو اس کے لئے لازمی ہیں۔ یہیں اسے وہ گرج چمک میسر آئے گی جس سے وہ دیوتاؤں کے سفیر کی حیثیت سے اہلِ دنیا کو متاثر کر سکتا ہے۔ ہمارے طریق کی بنیاد اسی زبان میں ہوتی ہے۔ ہماری روح ہماری سماعت اور ہمارے اعضائے گویائی اسی سے بنے ہیں لہٰذا میں اپنی مادری زبان کے سوا کسی اور ذریعہ سے اپنے مطالب ادا نہیں کر سکتا ہوں۔ جیسے ہمارا وطن سب ملکوں سے بہتر معلوم ہوتا ہے، اسی طرح یہ زبان ان لوگوں کی نگاہ میں جو اس کے لختِ جگر ہیں اس کا دودھ پی کر جوان ہوئے ہیں اور اس کی آغوشِ تربیت میں پلے ہیں سب زبانوں سے زیادہ حسین ہے۔ یہ زبان پختہ عمر پر خوشی کا ذریعہ ہے اور وقت آنے پر بڑھاپے میں امید اور عزّت کا ذریعہ بن جائے گی۔

بچے کا قاعدہ ہے کہ نئے حاصل ہونے والے تصوّرات کا مقابلہ معلوم شدہ پرانے تصوّرات سے کرتا ہے اسی طرح ہمارا دماغ کبھی لاشعوری طور پر دوسری زبانوں کو اپنی زبان

کے موافق بنالیتا ہے۔ پہلے غیر زبان کو حاصل کرتا ہے بعد میں اپنی اور اس زبان کے فرق پر غور کرتا ہے۔ غیر ملکی زبانوں کے گہرے مطالعہ سے وہ ان زبانوں کی خامیوں کوتاہیوں یا خوبیوں سب کا جائزہ لیتا ہے۔ اور پھر اپنی زبان کے سلسلے میں ان سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کرتا ہے اور خامیوں کو دُور کرتا ہے۔ مادری زبان وہ رہبر ہے جس کے بغیر دماغ غیر زبانوں کی بھول بھلیاں میں گُم ہو جاتا ہے۔ یہ مادری زبان وہ جہاز ہے جو دماغ کو غیر زبانوں کے بحر بیکراں میں ڈوبنے سے بچاتا ہے۔ یہ زبانوں کی مبہم افراتفری میں اتحاد بہم پہنچاتی ہے۔ میں غیر زبانیں اس لئے نہیں سیکھتا کہ اپنی زبان بھول جاؤں جیسے کہ میں غیر ممالک میں اس لئے سفر نہیں کرتا کہ ان طریقوں اور رواجوں کو بھول جاؤں جو میرے ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں کسی غیر ملک کا شہری اس لئے نہیں ہو جاتا کہ اپنے ملک کے شہری حقوق چھوڑ دوں کیونکہ ایسا کرنے سے میرا نقصان نفع سے کہیں زیادہ ہوگا۔ میں غیر ملکوں کے باغوں میں اس لئے پھرتا ہوں کہ اپنی زبان کے لئے پھول چنوں۔ وہ میرے خیالات کے طرز ادا کی بھی محبوبہ ہے۔ میں غیر ممالک کے طریقوں کا مطالعہ اس لئے کرتا ہوں تاکہ ان طریقوں کو غیر ممالک میں پکے ہوئے پھلوں کی طرح مادرِ وطن کے سامنے پیش کروں۔

حقیقت یہ ہے جو شاعر طرز خصوصی کا مالک ہونا چاہتا ہے اسے اپنی سرزمین سے وفادار ہونا چاہیئے۔ یہاں وہ پُر اثر الفاظ کی کاشت کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ زمین سے واقف ہوتا ہے۔ یہاں وہ پھول چُن سکتا ہے کیونکہ زمین اس کی ہے۔ یہاں وہ زمین کو گہرا کھود کر سونا تلاش کر سکتا ہے، پہاڑوں کو اُکھاڑ سکتا ہے اور دریاؤں کے رُخ بدل سکتا ہے کیونکہ جو کچھ بھی اسے نظر آتا ہے وہ ان سب کا مالک ہے۔ وقت کے کسی لمحے کی خاص کیفیت مادری زبان ہی کے ذریعہ ادا ہو سکتی ہے۔ اور میں اپنی اس کمزوری کا اظہار کرنے میں بالکل نہیں شرماتا کہ میں نے خود کو اپنی زبان کے علاوہ کسی اور زبان کو پوری طرح

سمجھنے کا اہل نہیں محسوس کیا۔ پورے طور سے سمجھنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ فرانسیسی، اطالوی اور انگریزی بولنے والے تین جوان اور لاطینی، یونانی اور کوٹھک کے تین ماہر معلم میری تردید نہیں کر سکتے۔ میں ان لوگوں کو مبارک باد دوں گا اگر ان میں سے کوئی تینوں زبانوں میں یکساں روانی اور زور کے ساتھ وہی بات دہرا دے۔ جو پہلے ایک زبان میں کہی گئی ہے تو میں اسے ہدیۂ تبریک پیش کروں گا اور پھر ان کو چھوڑ کر سقراط کی روح کو بلاؤں گا اور اس سے پوچھوں گا کہ کوئی شخص ایک سے زیادہ زبانوں میں ہومر کا سا کمال حاصل کر سکتا ہے۔ کسی مردہ زبان میں پنڈار اور ہورِس ہو سکتا ہے یا شکسپیئر کا سا صاحبِ کمال ہو سکتا ہے اس کے بعد برڈس کی طرح دھم سے گر کر زمین سے لپٹ جاؤں گا جو میری ماں ہے اور اس کی زبان میری دیوی ہے۔

دائمی بوجھ

خلیفہ حکم جسے شان و شوکت پسند تھی اپنے محل کے باغوں کی توسیع کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے آس پاس کی سب زمین مالکوں کو منہ مانگی قیمت دے کر خرید لی۔ مگر ایک بیوہ نے اپنی زمین جو اُسے آبا و اجداد سے ورثے میں ملی تھی بزرگوں کی یادگار سمجھ کر بیچنے سے انکار کر دیا۔ اس عورت کی ضد سے میرِ عمارات بڑا برافروختہ ہوا اور اس نے زبردستی بیوہ کی زمین پر قبضہ کر لیا۔ وہ بیوہ اپنی فریاد قاضی کے پاس لے گئی

اس وقت ابن بشیر شہر کا قاضی تھا اس نے مقدمہ سُنا مگر فیصلہ نہ دے سکا کیونکہ قانون کی رو سے بیوہ حق پر تھی پھر بھی ایک حکمران کو جو اپنی رائے کو انصاف سمجھتا تھا یہ یاد کرانا کہ حقیقی قانون کیا ہے ذرا مشکل تھا۔

انصاف پسند قاضی نے کیا کیا؟ اس نے اپنا خچر تیار کیا۔ خچر کے گلے میں ایک بڑا سا بورا لٹکایا اور فوراً محل کے باغات کی طرف روانہ ہوگیا۔ اتفاقاً خلیفہ اسی وقت اس خوبصورت عمارت میں پہنچا تھا جو بیوہ کی زمین پر بنائی گئی تھی۔

قاضی کے اس طرح آنے پر خلیفہ کو تعجب ہوا اور پھر جب قاضی اس کے قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا "مجھے اجازت دیجئے کہ اس بورے کو یہاں کی مٹی سے بھرلوں" تو خلیفہ کو اور زیادہ تعجب ہوا اس نے اجازت دی۔ جب بورا بھر گیا ابن بشیر نے خلیفہ سے کہا اس بورے کو خچر پر لادنے میں میری مدد کیجئے۔ حکم کو یہ بات اور بھی عجیب معلوم ہوئی مگر یہ دیکھنے کے لئے کہ قاضی کا مقصد کیا ہے اس نے بورے کو ہاتھ لگایا مگر بورا اُٹھ نہ سکا۔ اور خلیفہ نے کہا "قاضی بہت بھاری ہے" ابن بشیر نے شائستہ بے باکی سے کہا "آپ کو یہ بوجھ بہت بھاری معلوم ہوتا ہے حالانکہ یہ اسی زمین کا جو بیوہ سے زبردستی حاصل کی گئی ہے، ذرا سا حصہ ہے۔ قیامت کے دن جب خداوند تعالیٰ اس پوری زمین کا بوجھ آپ کے کندھوں پر رکھے گا تو آپ کیسے اٹھا سکیں گے۔ خلیفہ بہت خفیف ہوا اس نے قاضی کی دانائی اور ہمت کی تعریف کی اور غریب بیوہ کو اس کی زمین نئی تعمیر شدہ عمارت کے ساتھ واپس کر دی۔

امینول کانٹ

امینول کانٹ (۱۸۰۴ - ۱۷۲۴) نے اپنی پوری زندگی کونگز برگ میں گزاری جہاں وہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ وہ دنیا کے عظیم ترین فلسفیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے "روشن خیالی" کی روحانی بنیادوں کو کامل کیا اور پھر ان سے بالاتر پہنچ گیا۔ اس کی خاص فلسفی تصانیف 'تنقید عقل محض'[1] (۱۷۸۱)، 'عملی شعور' (۱۷۸۸) اور 'تنقید فیصلہ' (۱۷۹۰) ہے۔ ہم یہاں دو ایسے اقتباس پیش کر رہے ہیں جن سے اس کے فلسفے کے بنیادی تصورات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ایک سوال کا جواب: "روشن خیالی کیا ہے؟" کی ابتدا میں اس نے روشن خیالی کی معروف ترین تعریف بیان کی ہے۔ اور اس کے حالات اور امکانات کا مختلف روحانی دائروں میں جائزہ لیا ہے۔ یہاں کانٹ "روشن خیالی" کو انسان کا دائمی عمل قرار دیتا ہے۔ لیسنگ کی طرح انسانی ترقی کی آخری منزل روشن خیالی کی طرف مسلسل بڑھتے رہنا ہے۔ اس طرح "روشن خیالی" کی اصطلاح بڑی معنی خیز ہو جاتی ہے اور یہ صرف اس روحانی تحریک ہی کا احاطہ نہیں کرتی جو اٹھارویں صدی کے جرمنی میں عام ہوئی بلکہ انسان کی عام ترقی کی علامت بن کر جو جدید دور کی ابتدا میں ایک واضح حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور آج بھی مستقبل کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔

پہلا اقتباس "میرے ذہن میں دو چیزیں ہیں" اس کی کتاب 'عملی شعور' کے خاتمہ سے لیا گیا ہے۔ یہ کانٹ کے فلسفے کا وہ پہلو واضح کرتا ہے جس سے وہ اٹھارہویں صدی کی "روشن خیالی" سے بالاتر چلا جاتا ہے۔ اس سے یہ کلیہ سامنے آتا ہے کہ انسان کی عقل حقائق تک نہیں پہنچ سکتی۔ مگر انسان کی ناکافی قوت اس کے اندرون کے لئے ناکافی نہیں ہے۔ اس کی عقل "اخلاقی قانون" کو پہچاننے میں ضرور اس کی مدد کرتی ہے۔ اور اس طرح اس کا عقلی وجود صحیح ثابت ہو جاتا ہے۔ کانٹ نے اخلاقی

[1] "تنقید عقل محض" کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے۔

قانون کی تشکیل یوں کی " اسی طرح عمل کرو تمہارے ارادوں کی حسن ترتیب کسی وقت بھی ہدایت کے عام راستوں کی مثال بن سکے"۔ اس لئے کانٹ مذہب کو بھی وہ عمل قرار دیتا ہے جو اخلاقی صحت کے عین مطابق ہے اور جس کے قوانین عقل سے پرکھے جا سکتے ہیں۔ جرمنی میں عینیت کا فلسفہ کانٹ کے نظام خیال سے وجود میں آیا۔ بڑے شاعروں میں شیکر پر کانٹ کے فلسفہ کا گہرا اثر ہوا۔

میرے ذہن میں دو چیزیں ہیں

میرے ذہن میں دو چیزیں ہیں۔ میں ان کے بارے میں جتنا سوچتا ہوں اتنا ہی ان کی عظمت اور نئے پن میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ پہلی تاروں بھرا آسمان ہے جو میرے سر پر ہے۔ دوسری وہ اخلاقی قانون ہے جو میرے باطن سے متعلق ہے۔ مجھے ان چیزوں کو نہ ڈھونڈھنا پڑتا ہے اور نہ ان کے بارے میں اس طرح قیاس کرنا پڑتا ہے جیسے کہ وہ تاریکی میں نہاں یا اس مابعد الطبیعاتی حد میں ہوں جہاں میری رسائی نہیں ہے۔ میں انہیں اپنے سامنے دیکھتا ہوں اور اپنے وجود کے شعور سے ملا ہوا پاتا ہوں۔ اوّل الذکر وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں احساسات کی خارجی دنیا میں میں موجود ہوں۔ اور بڑھتی ہوئی مناسبتوں کے اس نظام کا احاطہ کر لیتی ہے جن میں میں ہوں۔ دنیاؤں پر دنیائیں نظاموں پر نظام اور اس کے آگے لاانتہا ادوار کی وقتی حرکت میں اس کی ابتدا اور سلسلہ جاری رہتا ہے۔ دوسری میری پوشیدہ خودی میری شخصیت سے شروع ہوتی ہے۔ میری ہستی سے ایک حقیقی لاانتہا کی دنیا میں میری نمائش کرتی ہے شعور ہی اسے پہچان سکتا ہے۔ اسی سے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں محض اسباب کی مناسبتوں میں نہیں ہوں بلکہ ایک زیادہ آفاقی اور ضروری عالم میں ہوں اور اسی کی وجہ سے نظر آنے والی دنیاؤں سے بھی متعلق ہوں اول الذکر نقطۂ نظر جو لاتعداد دنیائیں سامنے لاتا ہے میری اہمیت کو ایک آدمی کی حیثیت سے ختم کر دیتا ہے۔ دوسرا نقطۂ نظر میری قیمت کو حد سے زیادہ بڑھا دیتا ہے کیونکہ

وہ اخلاقی قانون کو میری بہیمانہ فطرت سے بالاتر دکھاتا ہے۔

"روشن خیالی کیا ہے؟"

روشن خیالی انسان کی اپنے اوپر عائد کی ہوئی غلامی سے آزادی ہے۔ غلامی انسان کی نااہلی ہے جس کی بنا پر وہ اپنی سمجھ کسی دوسرے کی مدد کے بغیر نہیں استعمال کرسکتا۔ یہ غلامی خود عائد کی ہوئی ہے۔ کیونکہ اس کا سبب عقل کی کمی نہیں ہے بلکہ ارادہ اور ہمت کی وہ کمی ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے کی مدد کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اپنی عقل کو استعمال کرنے کی ہمت پیدا کرو۔ روشن خیالی کا راز یہی ہے۔

کاہلی اور بزدلی ہی وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر انسانوں کی بیشتر تعداد جسے قدرت نے ہر طرح کی آزادی عطا کی ہے زندگی بھر غلامی میں بسر کرتا ہے اور دوسرے بڑی آسانی سے ان کے رہنما بن جاتے ہیں۔ اگر میرے پاس ایک کتاب ہو جو میرے ذہن پر زور نہ دے اور معلم جو میرا ضمیر بنے ایک حکیم ہو جو میری خوراک مقرر کرے تو مجھے کوئی کوشش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں اگر میں کسی بیڑھے کام کے لئے ملازم رکھ لوں۔

زیادہ تر انسان اہلیت حاصل کرنے کو خطرہ سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ علم کے ٹھیکے دار بن بیٹھے ہیں اور دوسروں کے لئے اس راہ میں خطرہ بتاتے ہیں۔ یہ خطرہ چنداں اہم نہیں کیونکہ ایک دفعہ گرنے کے بعد خود بخود چلنا آجاتا ہے مگر ایک ہی مثال انہیں خوفزدہ بنا دیتی ہے اور وہ آگے کوشش نہیں کرتے چنانچہ اس غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنا جو انسان کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے مشکل ہے آدمی اسے پسند کرتا ہے اور اپنی عقل پر زور نہیں دیتا کیونکہ کوئی اسے ایسا کرنے نہیں دیتا۔ ٹکے بندھے قانون اس غلامی کی بیڑیاں ہیں۔ جو انہیں توڑتا ہے اسے ایک خندق پھاندنا پڑتی ہے۔ اور وہ اس کا عادی نہیں ہوتا۔ چنانچہ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو اپنی عقل استعمال کرکے نااہلیت کے دائرے سے نکل کر ترقی

کرتے ہیں۔

عوام کے اپنے آپ کو روشن خیال بنانے کے امکانات نسبتاً زیادہ ہیں حقیقت میں ایک مرتبہ آزادی مل جائے تو روشن خیالی یقینی ہو جاتی ہے کیونکہ ایسے لوگ ہمیشہ وجود میں آتے رہیں گے جو آزاد خیال ہوں گے اور جو اپنے کاندھوں سے غلامی کا جُوا اتار کر روشن خیالی کو عام کریں گے مگر جو غلامی میں پھنسے ہوئے ہیں ان کا جلد چھٹکارا حاصل کرنا ناممکن ہے۔ چنانچہ عوام بہت دیر میں روشن خیال ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ انقلاب سے ظلم ختم کر دیا جائے۔ مگر شعور کی اصلاح اس طرح ممکن نہیں۔ ہر انقلاب کے بعد پرانی عصبیتوں کے ساتھ ساتھ نئی عصبیتیں بھی نہ سوچنے والے عوام کے ذہنوں میں راہ پا جاتی ہیں۔

روشن خیالی کے لئے آزادی کے سوا اور کچھ نہیں چاہیئے۔ وہ آزادی جو عقل کے عام استعمال کو رواج دے۔ مگر میں ہر شخص کو یہی کہتے ہوئے سنتا ہوں "بحث نہ کرو"، ہر شعبۂ زندگی میں آزادی پر پابندیاں عائد ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کس چیز سے آزادی درکار ہے۔ میں کہتا ہوں کہ عقل کا عام طور سے استعمال آزادی سے کیا جاسکے اور یہی روشن خیالی کو عام کردے گا۔ عام استعمال سے میرا مقصد یہ ہے کہ ایک عالم اپنے آزاد خیالات کو سب پڑھنے والوں تک پہنچا دے حکومت کے قوانین سے آزادی نقصان دہ ہے مگر خیالات کی آزادی کا حق کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔ ایک شہری اگر ٹیکس دینے سے انکار کرتا ہے تو یہ غلط ہے مگر ایک عالم کا ٹیکسوں کے غلط ہونے پر اظہار خیال کرنا صحیح ہے۔ ایک مذہبی آدمی کو گرجے کے قوانین سے منکر نہ ہونا چاہیئے مگر ایک عالم کو ان قوانین پر تنقید کرنے اور بہتر نظام مذہب کا تصور دینے کا ہر حق حاصل ہونا چاہیئے۔

کوئی ایسا نظام جس سے انسان ٹکے بندھے اصولوں کی غلامی میں آجائے، انسانی فطرت پر ظلم ہے۔ صحیح قانون کی کسوٹی یہ ہے کہ کوئی شخص اسے اپنے اوپر عائد کرتا ہے یا نہیں کسی قانون سے وابستہ ہو جانا وقتی چیز ہو سکتا ہے ایک مذہبی ادارہ بنا لینا

جس کے قانون اٹل ہوں انسانی ترقی کی راہ بند کر دیتا ہے کیونکہ یہ روشن خیالی کو التوا میں ڈال دیتا ہے۔

اگر لوگ مجھ سے پوچھیں کہ ہم روشن خیال دور میں ہیں؟ تو میں کہوں گا نہیں روشن خیالی کے دور میں نہیں ہیں" بہت سی چیزوں نے ہمیں روک رکھا ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دکھائی دے رہا ہے۔ روشن خیالی کے لئے زیادہ سے زیادہ میدان صاف ہو رہا ہے۔ انسان غلامی سے آزاد ہو رہے ہیں۔

ایک حکمران جو آزاد خیالی کا حامی ہے یہ ثابت کر رہا ہے کہ روشن خیالی میں امن کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ایک بادشاہ کا یہ رجحان بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس کی مثال اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس کی فوجی طاقت امن قائم کرنے کے لئے کافی ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ جتنی بحث کر سکتے ہو کرو۔ جس مسئلہ پر بحث کر سکتے ہو کرو مگر قانون کے تابع رہو۔ اس وقت یہ محسوس ہو گیا ہے کہ آزاد خیالی فرد اور حکومت دونوں کے لئے مفید ہے۔

۱۷۷۰ء

تا

۱۸۴۰ء
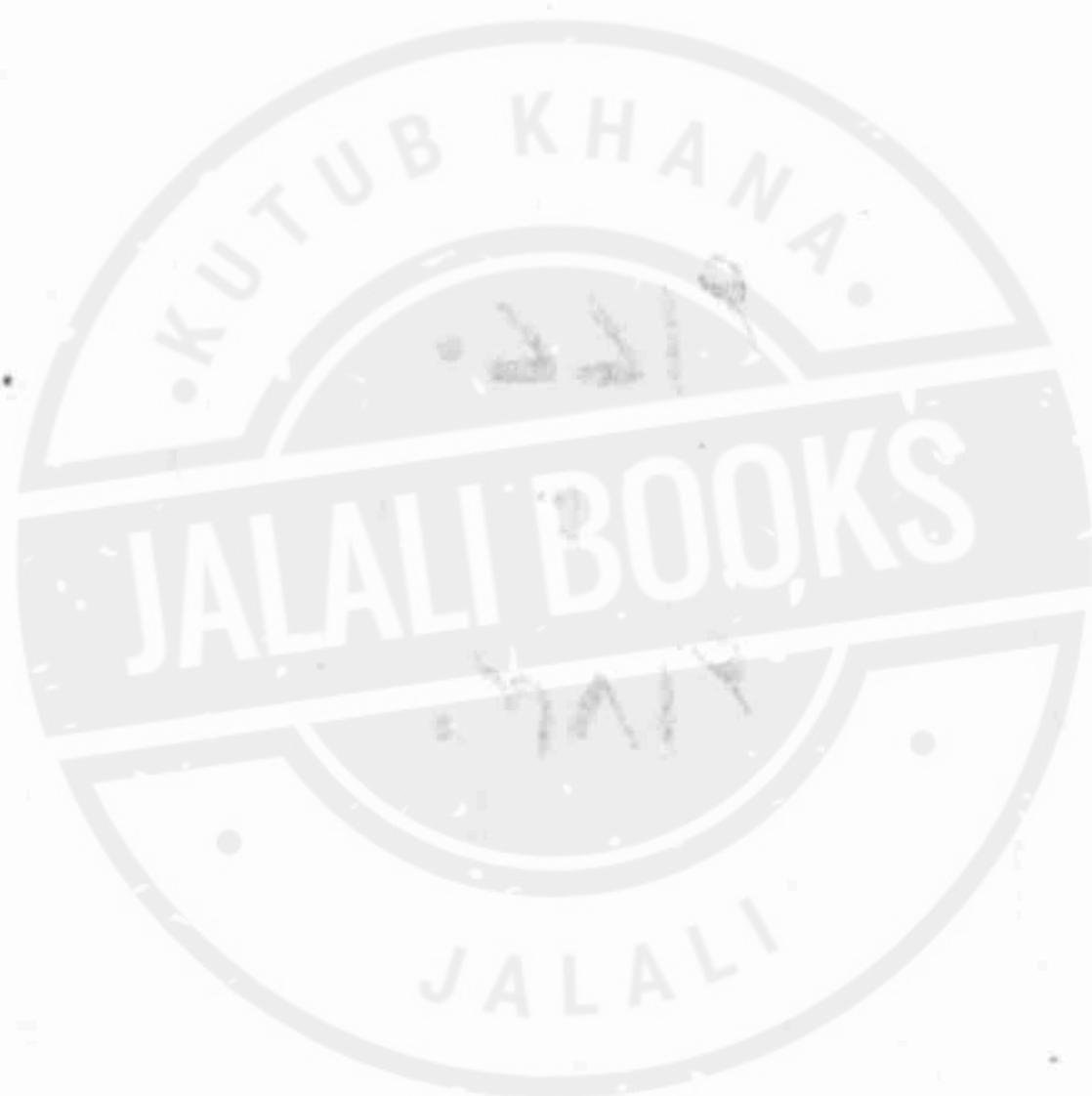
روشن خیالی کے خلاف ردعمل ۱۷۷۰ء میں شروع ہوا۔ ادب اور زندگی کا نیا رجحان ہرڈر کی تصانیف ہی سے ظاہر ہو گیا تھا۔ عقل کی اہمیت کم ہو گئی اور اس کی جگہ جذبات اور غیر عقلی نظریہ نے لے لی۔ ادب نے جدت اور انفرادیت کی راہ اختیار کی۔ اور ایک ایسے نابغہ سے روشناس ہوا جو اس جینیس کی تخلیق تھا جو نہ تو صولوں کو جانتا تھا اور نہ ان کی ضرورت محسوس کرتا تھا ۔ اس کے رہبر محض احساسات اور اس کا باطن تھے۔ توانا اور جذباتی انسان، جو پرانی روایات اور اصولوں کو ٹھکراتا تھا اب نیا نصب العین ٹھہرا۔ قدرتی زندگی کی اس خواہش نے تہذیب کی تکمیل کے سلسلے میں قنوطی نقطۂ نظر کو فروغ دیا۔ تاریخ کو ترقی کے بجائے زوال سمجھا گیا۔ جو قدرت سے علیحدہ ہو کر تصنع، تخریبی صورتوں اور اخلاق کے خاتمہ کی طرف لئے جا رہی تھی۔ یہ تصور فرانسیسی فلسفی ژان ژاکس روسو (۱۷۱۲ - ۱۷۷۸) سے شروع ہوا تھا۔ اس نے جرمنی کی چھوٹی حکومتوں کے سیاسی اور سماجی حالات، سماج کی طبقاتی تقسیم، حکمرانوں کی مطلق العنانی اور اونچے طبقہ کی اخلاقی خرابیوں پر سخت تنقید کی۔ کیونکہ یہ سب چیزیں قدرتی نظام کے خلاف تھیں اس معاملے میں روشن خیالی کے رہبروں کی تنقید کو زیادہ شدت کے ساتھ برتا گیا۔ روشن خیالی کی طرح یہاں بھی انسان کی خودارادیت کو مطمح نظر بنایا گیا۔ روایت سے آزادی اور روائتی عصبیت پر خاص طور سے حملہ کیا گیا مگر روشن خیالی پر مبنی مذہب کی جگہ جذبات کو مذہب کی بنیاد بنایا گیا اور قدرت میں حق کی تلاش کی گئی۔ غیر قدرتی انسانی حالات پر تنقید اور قدرتی آدمی کی تعریف کا خاص میدان جذباتی ڈرامہ ٹھہرایا گیا۔ ایسے ہی ایک ڈرامہ نے جسے فریڈرک میکسیملن کلنگر نے لکھا تھا اور جس کا نام اسٹرم اینڈ ڈرینگ (طوفان اور زور) تھا۔ اس تحریک کو جو ۱۷۷۰ اور ۱۷۸۵ کے درمیان چلی تھی یہی نام

دیا۔ گوئٹے اور شیلر کی شروع کی تصانیف بھی اسٹرم اینڈ ڈرینگ (طوفان اور زور) کا حصہ تھیں مگر یہ دونوں شاعر اس سے بالاتر ہو گئے اور ۱۷۸۵ میں انہوں نے کلاسیکی جرمن ادب کا آغاز کیا جو ادبی اور تہذیبی کارنامے کا حاصل بن گیا۔

کلاسیکی ادب نے روشن خیالی کی واضح معقولیت سے بھی رجوع کیا۔ اور جذبات کی قوت سے اسے مکمل کر دیا۔ اس نے عقل اور جذبات کے امتزاج کو اپنا مقصد بنایا۔ اس دور کا نقطۂ نظر جرمن عینیت کا وہ فلسفہ ہے جس کا بانی کانٹ تھا۔ یہ محسوس ہوا کہ انسان سے بالاتر ایسے نیکی، سچائی اور حسن کے ایسے آدرش اور پُراسرار اخلاقی قوانین ہیں جہاں انسان اپنے آزاد حق خود ارادیت کے ذریعہ سے پہنچنا چاہتا ہے۔ اسی کوشش نے انسان دوستی کو رواج دیا۔ جس کا مسلک انسانی محبت ہے تاکہ سب کا فائدہ ہو۔ سماجی نظام، تشکیل اور توازن کو قدریں مانا گیا۔ کلاسیکی جرمن ڈرامہ جس کا تعمیری آہنگ متوازن ہے بنیادی مسائل سے سروکار رکھتا ہے اور زندگی کے قوانین کی آفاقی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔

اس دور کا فیصلہ کن سیاسی واقعہ ۱۷۸۹ کا انقلاب فرانس ہے جس کے بعد انقلابی جنگیں شروع ہوئیں اور نپولین برسرِاقتدار آیا۔ اس کی فوجیں جرمنی کی ریاستوں سے بھی گزریں۔ گوئٹے اور شیلر، جو جرمن کلاسیکی دور کی نمایاں ترین ہستیاں ہیں ان واقعات سے متاثر ہوئے اگرچہ وہ زیادہ تر فلسفیانہ خیالات میں غرق رہے۔ روحانی تہذیب، انسان کی اخلاقی تعلیم اور آفاقی انسانیت پسندی ان کے لئے وقتی قومی اور سیاسی معاملات سے زیادہ اہم رہیں۔

اٹھارہویں صدی کے آخری برسوں میں جب کہ بہت سی کلاسیکی تصانیف ظہور میں نہیں آئی تھیں ادب اور زندگی کے سلسلے کی طرف ایک نیا رجحان ظاہر ہونے لگا۔ یہ روحانی تحریک تھی یہ باشعور کلاسیکی صفائی اور تشکیل صحت کے خلاف محض اس نوع کا منطقی ردعمل نہیں تھا جیسا کہ اسٹرم انڈ ڈرینگ روشن خیالی کے خلاف تھا۔ یہ درست ہے کہ رومانیت نے اسٹرم انڈ ڈرینگ کے کچھ عناصر استعمال کئے اور

اس نے روشن خیالی کی تنقیدی نظر کو بھی ترک نہیں کیا مگر اس پر جرمن عینیت کا اثر تھا۔ جس کی وجہ سے خارجی سے اخلاقی نظام پر زور کے بجائے تخلیقی قوت اور کامل آزادی آگہی، جو داخلی شعور سے تعلق رکھتی تھی۔ رومانی رجحان، جذبات، الہام، خواب، لاانتہا وغیرہ حاصل کرنے کی خواہش جیسے روحانی ذرائع پر مبنی تھا اسی طرح وہ اسرار، دہشت اور عجائبات کی طرف بھی راغب ہوا۔ رومانی شاعر نے لاانتہا کی خواہش اور کامل آزادی کے احساس میں کسی مستقل تشکیل کو مقصد نہیں بنایا بلکہ کلاسیکی مصنفین کے مقابلہ میں ان کی تصانیف بے ہیئت اور لخت لخت نظر آتی ہیں۔ مختلف اقسام کی شاعری ملی جلی دکھائی دیتی ہے۔ اکثر شعرا خود تنقید کرتے ہیں اور اس طرح اپنی تصنیف کا اثر زائل کر دیتے ہیں تاکہ ہمیشہ بدلنے والے عالم کا اثر قائم ہو۔ جذبہ اور جدید چیزوں کی تلاش میں وہ ہرڈر کی طرح دیہاتیوں کے گیت اور کہانیاں بھی جمع کرنے لگے۔ اپنی تصانیف میں بھی انہوں نے عوامی ادب کا نرم اور سادہ رنگ اختیار کیا۔ رومانی جذبہ جس نے مصوری اور موسیقی کو بھی متاثر کیا' زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہوگیا اور اس نے فسانہ۔ حقیقت، فن اور سائنس کی حدود کو غائب کر دیا۔ فن کی طرف یہ آفاقی رجحان ساری دنیا میں عام ہوگیا اور جرمن عوام کے لئے غیر ممالک کا ادب ترجموں کے ذریعہ حاصل ہونے لگا۔ رُومانی دَور کے خاتمہ تک جذبات اور سادگی کی طرف رجحان اتنا بڑھ گیا کہ اسے عام شہری نے زیادہ سے زیادہ پسند کیا۔

سیاسی واقعات "جو جرمنی سے براہِ راست تعلق رکھتے تھے" رومانی مصنفین کلاسیکی مصنفین کے مقابلے میں زیادہ شدّت کے ساتھ اثر انداز ہوئے۔ نپولین کی پروشیا پر فتح (۱۸۰۷ - ۱۸۰۶) اور اس کے بعد آزادی کی جدوجہد (۱۸۱۵-۱۳-۱۸) نے نظموں، پمفلٹوں اور تقاریر کو متاثر کیا۔ یہ رومانیوں کی حُب الوطنی کی وجہ سے تھا۔ انہوں نے ماضی کو زندہ کیا اور اپنی قوم کی قوت اور اوصاف کا مطالعہ کیا۔

فریڈرک میکسیملین کلنگر

شیطان کی تقریر

فریڈرک میکسیملین کلنگر (۱۸۳۱-۱۷۵۲) غریب ماں باپ کا لڑکا تھا گوئٹے نے اس کی اعلیٰ تعلیم کا خرچہ برداشت کیا کچھ عرصے تک وہ ایک تھیٹر کی کمپنی میں کام کرتا رہا۔ آخر کار وہ فوج میں شامل ہوگیا۔ روس میں جنرل کے عہدہ تک پہنچ گیا۔ اس کی شروع کی تصانیف اسے اسٹرم اینڈ ڈرینگ کا نمائندہ "ڈرامہ نگار ثابت کرتی ہیں۔ اس کی ناولیں ۱۷۹۰ اور ۱۸۰۰ کے درمیان لکھی گئیں۔ ان کی بنیاد فلسفیانہ ہے۔ زندگی کی طرف ان کا رجحان تنقیدی نہیں بلکہ بے یقینی کا ہے۔ "شیطان کی تقریر" کلنگر کی ناول فاؤسٹ کی زندگی، اس کے کارنامے اور جہنم میں داخلہ " کا ایک ٹکڑا ہے۔ فاؤسٹ انسان کا نمائندہ ہے جو قوت اور علم حاصل کرنے کے شوق میں شیطان سے معاہدہ کرتا ہے۔ یہ موضوع قرونِ وسطےٰ کے ادب میں عام تھا۔ کلنگر نے فاؤسٹ کو چھپائی کا موجد دکھایا ہے۔ ناول کا ڈھیلا پلاٹ جس میں شیطان فاؤسٹ کو دنیا کی سیر کراتا ہے اس سوسائٹی کا نقشہ پیش کرنے کا ذریعہ بنتا ہے جو اس وجہ سے اخلاق سے گری اور بدکاری میں پھنسی ہے کہ اس کی تہذیب بہت زیادہ ترقی پر پہنچ گئی ہے۔ یہاں روسو کا اثر صاف نمایاں ہے۔

شیطان، فاؤسٹ کو جہنم میں داخل ہونے پر مبارکباد دینے کے لئے تقریر کرتا ہے۔ اس میں جدید دور کا سچا شیطانی نقشہ ہے۔ اگرچہ شیطان کی نظر سے دیکھا جائے تو کسی حد تک مسخ شدہ لیکن کلنگر کے تاریخی تجربے پر مبنی ہے۔

حکمرانو، عظیم انسانوں اور لافانی روحوں، میں تم سب کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ جب میں تم جیسے لاتعداد سورماؤں کو دیکھتا ہوں تو عیش کے جذبات میرے دل میں

اُبھرتے ہیں۔ ہم لوگ اب بھی وہی ہیں جیسے اس وقت تھے جبکہ اس بے پناہ گڑھے میں جا گرے تھے اور ایک ساتھ جمع ہو گئے تھے۔ یہیں ایک جذبہ غالب ہے جہنم ہی میں اتحاد ہے۔ یہیں ہر شخص ایک مقصد رکھتا ہے۔ وہ جو تم پر حاکم ہے آسانی سے آسمان کی روشنی کو بھلا سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہم نے بہت تکلیف اٹھائی ہے اور اب بھی اٹھا رہے ہیں کیونکہ ہماری قوت کا میدان اسی نے تنگ کر دیا ہے جو ہم سے زیادہ ڈرتا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اس سے ڈریں مگر ہمیں اس تکلیف کے بدلے میں انتقام کا جذبہ حاصل ہے جو ہم ان مٹی کے پتلوں سے لینا چاہتے ہیں جو اس کے مقبولِ بارگاہ ہیں جن کے پاگل پن اور اتحاد پر ہم غور کرتے ہیں تاکہ اس مقصد کو ہر دم ناکام بنا سکیں۔ خوش آمدید تم سب کو جن کے دل اسی خیال سے روشن ہیں۔

اب سنو کہ میں نے یہ دعوت کیوں دی ہے۔ فاؤسٹ ایک بہادر فانی انسان، جسنے ہماری دائمی قوت سے بغاوت کی اور جس کے ذہن کی قوت ایک دن اس کو بھی ہماری طرح جہنم میں رہنے کے قابل بنا دیگی، اس نے کتابوں کو کثرت سے پیدا کرنے کا فن دریافت کیا ہے۔ یہ کتابیں انسان کا خطرناک کھلونا ہوں گی۔ اس کے پاگل پن کو غلطیوں، جھوٹ اور دہشت کو پھیلائیں گی۔ اور اس کے غرور اور تکلیف دہ شک کا ذریعہ بن جائیں گی۔ فی الحال یہ بہت گراں تھیں اور مالدار لوگوں تک ہی پہنچ سکتی تھیں۔ یہ کتابیں ان میں غرور پیدا کر کے اس انکسار سے ہٹاتی تھیں جو خدا نے ان کے دل میں رکھا تھا۔ فتح یہ ہے کہ علم کا خطرناک زہر اب عوام تک پہنچ جائے گا۔ پاگل پن، شک، بے قراری اور نئی ضروریات اُبھریں گی اور مجھے اندیشہ ہے کہ ہماری وسیع سلطنت ان کے لئے جگہ دے سکے گی جو اس زہر سے اپنے کو ملعون بنائیں گے، مگر یہ ایک چھوٹی فتح ہوگی۔ میری نظر دُور دیکھ رہی ہے اور سارے وقت کو گھڑی کا محض ایک چکر سمجھ رہی ہے۔ وہ وقت قریب ہے جب کہ موجودہ کے نئے خیالات پلیگ کی بیماری کی طرح پھیل جائیں گے

اور یہ فاؤسٹ کی ایجاد کی بنا پر ہوگا۔ آسمان اور زمین کے مصلح پیدا ہوں گے اور ان کے خیالات فقیروں تک پہنچ جائیں گے وہ سمجھیں گے وہ غلط چیزوں سے نیکی کر رہے ہیں اور اپنی نجات کی راہیں صاف کر رہے ہیں مگر آدمی نیکی میں کب کامیاب ہوا اور کب تک وہ اس طرف چل سکتا ہے؟ گناہ انسان سے اتنا قریب نہیں ہے جتنا کہ نیکی کرنے کا برا نتیجہ۔ وہ لوگ جن کو خدا اتنا چاہتا ہے کہ ان پر جہنم کو حرام کر دیا ہے، اپنی رائے کے اختلاف پر جنگیں لڑیں گے اور ایک دوسرے کو جنگلی جانوروں کی طرح پھاڑ ڈالیں گے۔ یورپ میں وہ پاگل پن پھیلے گا جس کی کبھی مثال نہ مل سکے گی اور دہشت ناک حالات اسے برباد کر دیں گے۔

تمہارے چہروں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم میری امیدوں کو بہت زیادہ سمجھ رہے ہو۔ سنو یہ نیا پاگل پن جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، مذہبی جنگ کے نام سے آتا ہے۔ یہ مذہبی جنگ جذباتیت، نفرت اور توہم سے پیدا کی ہوئی فطرت اور انسانیت کی تمام حدود ختم کر دے گی۔ اس جنون میں باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو مارے گا۔ بادشاہ اپنی رعایا کا خون بہائیں گے اور جذباتی لوگوں کو وہ تلواریں دیں گے جس سے وہ اپنے بھائیوں کو ہزاروں کی تعداد میں قتل کریں گے۔ یہاں تک کہ دریاؤں کا پانی خون بن جائے گا اور مقتولوں کی آواز جہنم تک کو ہلا دے گی۔ ہم ایسے ظالموں کو آتا دیکھیں گے جن کے لئے نہ جزا ہے نہ سزا۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ وہ پاک حکومت پر جو جعل و فریب سے قائم ہے اور عیش و گناہ سے کھوکھلی ہو چکی ہے، حملہ کر رہے ہیں۔ مذہب جو ہمارے لئے دہشت ناک ہے اس کی بنیادیں لرز جائیں گی اور اگر خدا جلدی سے کوئی معجزہ نہ دکھائے گا تو وہ گر جائیں گی اور ہم عبادت گاہوں میں دیوتا بنا کر پوجے جائیں گے۔ آدمی ان ظالموں کی قبروں پر ناچے گا جن سے وہ پہلے ڈرتا تھا۔ ان مذبحوں کو برباد کر دے گا جن پر ذبیحے دیتا تھا۔ وہ اپنی ذاتی رائے پر چلنے لگے گا اور آدمی ہر چیز کا غلط استعمال کریگا، تمام چیزوں کو برباد کر کے وہ انجان چیزوں کی طرف مڑے گا اور اپنے تخیل میں انھیں بھی برباد کر دے گا۔ آزادی تک کو، جسے وہ سب سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہے

سونے اور عیش کے بدلے بیچ ڈالے گا۔ نیکی کا وہ اہل نہیں ہے۔ بدی سے ڈرتا ہے اور اس سے بچنے کے لئے دہشت پر دہشت کا ڈھیر لگاتا ہے اور اپنی تعمیر کو خود بگاڑتا ہے۔

خونریز جنگوں کے بعد انسان کچھ عرصہ خاموش رہیں گے پھر جعل و فریب میں مشغول ہو جائیں گے۔ کچھ انصاف کے نام پر بہے لینگے، کچھ پُراسرار کرشمے دکھائیں گے اور روشنی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان کے تخیل میں آگ بھڑکے گی۔ وہ نئی ضروریات پیدا کریں گے۔ وہ حق، سادگی اور مذہب کو روند ڈالیں گے تاکہ ایسی کتاب لکھ دیں جو ان کو شہرت اور دولت دے۔ کتابوں کا لکھنا ایسا عام پیشہ ہو جائے گا جس کے ذریعہ ہر کوئی شہرت اور عزت حاصل کرلے گا اور اس کی پرواہ نہ کرے گا کہ وہ اپنی جنس کے دماغ کو معطل کر رہا ہے اور دلوں کو آگ سے بھر رہا ہے۔ وہ ہر معاملے کی تفتیش کرے گا۔ اور ایسا اندھیرا پھیلائے گا جو شک کی روشنی ہی سے ٹوٹتا رہے گا۔ اس وقت میں اُن کا منتظم ہوں گا اور جہنم کے دروازے اُن پر کھول دوں گا۔ پہلا قدم اٹھالیا گیا ہے اور دوسرا قدم یہ ہوگا کہ قدیم دنیا کے لوگ نئی دُنیائیں ڈھونڈھنے نکلیں گے اور مذہبی جذبہ میں کروڑوں کو فنا کر کے سونا حاصل کریں گے۔ اس طرح قومیں کی قومیں ہمارا شکار بن جائیں گی صدیوں تک وہ خدا کے نام پر زمین کو خون سے بھگوتے رہیں گے۔ اس طرح آسمان کے مقبول بندوں کے ذریعہ سے جہنم کی فتح ہوگی۔

یہ خبریں تمہیں سنانا چاہتا تھا۔ اب خوشی مناؤ اور اس فتح کے شادیانے ابھی سے بجاؤ۔ جس کا میں وعدہ کرتا ہوں کیونکہ میں انسانی فطرت سے واقف ہوں۔ فاؤسٹ زندہ باد۔

ہینرش لیوپولڈ ویگنر
بچّے کی قاتلہ

ہینرش لیوپولڈ ویگنر (۱۷۷۹ - ۱۷۴۱) حالانکہ کلنگر اور لنز کے مقابلے میں کم اہم ہے مگر اسٹرم اینڈ ڈرینگ کا اہم ڈرامہ نگار ہے۔ اس کا سب سے زیادہ مقبول ڈرامہ "بچّے کی قاتلہ" (۱۷۷۶) ہے۔ اس کا موضوع ایک لڑکی ہے جو اپنے ناجائز بچّے کو مار ڈالتی ہے۔ یہ موضوع اس دور کے دوسرے مصنفین کے یہاں بھی ملتا ہے۔ اس ڈرامے میں رئیس خاندان کا ایک لفٹننٹ، فون گرونننگ سیک ایک عام آدمی کی لڑکی کو خراب کرتا ہے پھر وہ اپنے ضمیر اور جذبات سے مجبور ہو کر اس لڑکی کی خاطر جس کا نام ایوچن ہے تجارتی سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ ہم نے جو اقتباس منتخب کیا ہے وہ رخصت کا منظر ہے۔ اس کے واپس آنے سے پہلے ایوچن کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنی تنہائی اور بے بسی سے اکتاکر یہ سمجھتی ہے کہ اسے دھوکا دیا گیا اور بچے کو مار ڈالتی ہے۔ ویگنر نے ان تمام واقعات کو بڑی سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان سے طبقہ امرا کے ظلم کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غریب لڑکیوں کو خراب کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وہ عوام کی مبالغہ آمیز اخلاق پسندی پر بھی تنقید کرتا ہے جس کی بنا پر وہ مجبور لڑکی پر رحم نہیں کرتے۔

ایوچن : تم کب واپس ہو گے ؟

فون گرونننگ سیک : سفر میں شاید دو ماہ لگیں گے۔

ایوچن : دو مہینے! میرا دل گھبرائے گا۔ مگر خیر یوں ہی ہوتا آیا ہے اس لئے میں برداشت کروں گی۔ میں تمہیں جلدی کرنے پر زور نہیں دوں گی۔ اگر تمہارا دل نہیں چاہتا تو نہ سہی۔ میں بہرحال برباد ہو گئی۔

فون گ : میرا دل ضرور چاہتا ہے۔

ایوچن : گرونننگ سیک میں تم پر یقین کرتی ہوں مجھے تمہاری بات کا بھروسہ ہے مگر کوئی نہیں جانتا کہ مستقبل میں کیا ہو گا۔ تم ہی نہیں قسمت کی کتاب میں اپنا حال کوئی نہیں پڑھ

سکتا مگر وہ اندرونی آواز جس کو میں دبا نہیں سکتی، یہ کہہ رہی ہے کہ میری تقدیر خون سے لکھی ہے۔

فون گ :۔ کیسی باتیں کرتی ہو؟

ایوچن : کیسی کیا، سیدھی سی بات ہے۔ اگر تم اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے۔

فون گ : مگر یہ ناممکن ہے؟

ایوچن : یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ سُنو فرض کرو کہ تم نے مجھے میری قسمت پر چھوڑ دیا، اس رسوائی پر چھوڑ دیا جو میری منتظر ہے، عزیزوں کے غصّے کی نذر کر دیا۔ تم سمجھتے ہو کہ میں یہ سب برداشت کر سکوں گی اور اس کے باوجود منتظر رہوں گی۔ ہرگز نہیں۔ میں جنگل کی طرف نکل جاؤں گی۔ ہر انسان سے دُور۔ گھنے جنگل میں چھُپ جاؤں گی۔ برسات کا پانی پی کر جیوں گی تاکہ دریا میں مجھے اپنے گنہگار جسم کا عکس بھی نہ دکھائی دے۔ اور اگر خدا نے چاہا کہ میں زندہ بچ جاؤں اور وہ بچہ بھی باپ حاصل کرنے سے پہلے ہی یتیم ہو جائے گا اور جب وہ باتیں کرنے لگے گا تو میں اس کے کانوں میں ماں باپ کی جگہ فاحشہ اور مکاری کے الفاظ سناؤں گی تاکہ وہ ان الفاظ کو دہرانا سیکھ جائے۔ پھر غصّے کے عالم میں اس کے الفاظ مجھے اپنے غم کو ختم کر دینے پر تیار کر دیں گے۔ کیا اس طرح خون نہ بہے گا گرونننگ سیک؟

فون گ : بات صحیح ہے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں سپاہی ہوں۔ میں جوانی سے جنگ کے میدان میں تھا۔ میں نے بڑے خوفناک منظر دیکھے ہیں مگر اس طرح کا منظر۔

ایوچن : اس طرح کے منظر کا وجود میں آنا تم پر منحصر ہے۔

فون گ : خدا تم کو ان سے بچائے۔ مجھے ان کے خیال سے لرزہ ہوتا ہے۔ خدا کے لئے ایوچن ایسے غم ناک خیال نہ کرو۔ انہیں اپنے دماغ سے نکال دو۔ مجھ پر بھروسہ کرو۔ میری عزت پر۔ اور مجھ میں نیکی کی جو قوت ہے اس پر یقین رکھو۔ اور اگر یہ نیکی محض ایک شرارہ ہے تو تم نے اس کو روشن کر دیا ہے۔

ایوچن : اچھا گرونننگ سیک۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔

فون گ : کیا تم یہ بھی وعدہ کرتی ہو کہ میرے لوٹنے تک اطمینان سے انتظار کرو گی۔

ایوچن (سوچ کر) میں ایسا وعدہ نہیں کرتی جو میں پورا نہ کر سکوں۔

فون گ: اگر تم مجھ کو باعزت شخص مان لو تو یہ وعدہ کر سکتی ہو۔

ایوچن: اگر میں اپنے کو دھوکا نہ دوں اور والدین کے دل میں شبہ پیدا کر دوں تو مجھے تم پر اعتبار کرنا ہوگا۔ تم نہیں سمجھتے کہ تم مجھ پر کتنا زور ڈال رہے ہو۔ کئی دفعہ یہ راز میری زبان پر آتے آتے رہ گیا۔ مگر خوف۔

فون گ: اسے اپنے تک رکھو۔ میں التجا کرتا ہوں۔ میں تمہارے باپ کے خیال سے تھرا جاتا ہوں۔ کوشش کرو اپنے کو خوش دکھاؤ تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ کسی کے دل میں کوئی شک پیدا نہ ہو۔

ایوچن: میرا چچازاد بھائی بھی نہیں۔ اس کی عیّار نظروں نے کئی مرتبہ میرا راز اُگلوانے کی کوشش کی۔ کل تم نے جو پیغام دیا تھا وہ ابھی تک اس کے ذہن پر حادی ہے اس کا اندازہ مجھے اس کی نظروں سے ہوگیا۔ حالانکہ میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

فون گ: کیا وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے؟

ایوچن: نہیں گرونننگ سیک، وہ مجھے نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ وہ میری بھلائی چاہتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں، وہ مجھے اپنانا چاہتا ہے اور میری ماں اسی کی طرف ہے۔ یہ گرجا کی ملازمت کے امیدوار ہونے کے باوجود یہ نوجوان اپنے لئے لڑکیاں چھانٹ لینا چاہتے ہیں اور اگر ان کو پندرہ برس کے بعد بھی ملازمت ملے تو اس وقت انہیں ایک بیوی تلاش نہیں کرنا پڑتی۔

فون گ: اس وقت تو ہم اسے ایک لڑکی شادی کرنے کے لئے دے سکیں گے۔

ایوچن: مگر یہ خیال رکھو کہ وہ لڑکی اپنی ماں کی بابت شرمندہ نہ ہو۔ اچھا اب تم چلے جاؤ۔ پڑوسی رات میں میرے کمرے میں روشنی دیکھنے کے عادی نہیں ہیں۔

فون گ: تم کو وہ بھی پریشان کر رہے ہیں۔

ایوچن: جب دل کو اطمینان نہیں ہوتا (اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر) اور جب وہ ملامت کرتا ہے تو ہم اپنے سایہ سے بھی ڈرتے ہیں۔ اب چلے جاؤ۔ کل تم مجھے میری ماں کے

ساتھ دیکھ لو گے ۔ تم ان سے بھی رخصت ہو گے ۔

فون گ : کیا میں تم سے اس وقت بات نہ کر سکوں گا ۔ ؟

ایوچن : میں تمہاری ہر نگاہ کو سمجھ جاؤں گی (وہ دروازے پر جاتے ہیں) تم نے واپسی کے لئے دو مہینے کہے ہیں ۔

فون گ : زیادہ سے زیادہ دو مہینے ۔ میں اس چاند اور ان ستاروں کے سامنے قسم کھاتا ہوں ۔ جب میں کوچ میں بیٹھ جاؤں تو میری آخری نگاہ اس کی تصدیق کرے گی مطمئن رہو ۔ میری پیاری (وہ ایوچن کا ہاتھ دباتا ہے ۔ اور جانے لگتا ہے ۔ ایوچن آدھا دروازہ کھولتی ہے' اپنا ہاتھ باہر نکالتی اور دھیمی آواز میں اُسے بلاتی ہے ')

ایوچن : ایک بات اور گرو ننگ سیک (وہ واپس آتا ہے' ایوچن اسے پیار کرتی ہے) میں تمہیں یہ کل سفر کے وقت نہیں دے سکتی (وہ اس پر جلدی سے دروازہ بند کر لیتی ہے)

جوہان ولفگینگ فون گوئٹے

جوہان ولفگینگ فون گوئٹے (۱۷۴۹ - ۱۸۳۲) فرینک فرٹ اون - مین میں پیدا ہوا۔ جوانی میں وہ اسٹرم انڈ ڈرینگ کے اثر میں آیا۔ ۱۷۷۵ء میں ڈیوک کارل آگسٹ نے اسے اپنے ویمر کے دربار میں داخل کیا۔ اس نے زیادہ زندگی وہیں گزاری۔ اور ذمہ دار سیاسی اور انتظامی عہدوں پر مامور رہا۔ اس کا کلاسیکی زمانہ اس کے اٹلی کے سفر سے شروع ہوتا ہے۔ (۱۷۸۶ - ۱۷۸۸) اس کے نتیجے میں اس نے کمال کی تصانیف پیش کیں۔ جیسے " افگنیا ان ٹاورس " اور " ٹارکیوٹیٹو " اس نے شیلر کی دوستی سے بھی وجدان حاصل کیا۔ ۱۷۹۴ء سے دونوں مصنف اپنے خیالات کا تبادلہ کرتے رہے۔ اپنے فرائض سے سبکدوش ہوکر گوئٹے ویمر کے درباری تھیٹر اور سائنس کے مطالعہ میں مصروف ہوگیا۔ تجربوں سے پُرطویل زندگی گذارنے کے بعد وہ اپنا عظیم ڈرامہ فاوسٹ" ختم کرکے ۱۸۳۲ میں مرگیا۔

آخری عمر میں گوئٹے نے رومانی عناصر بھی اپنی تصانیف میں شامل کرلئے اور اس طرح انیسویں صدی کے رجحانات کا پیشرو بن گیا۔ گوئٹے نے شاعر کی حیثیت سے ہر صنفِ سخن میں کمال حاصل کیا اور اس کی فلسفیانہ تصانیف کی وجہ سے تمام یورپ پر بہت ہی زیادہ اثر رہا۔

" ورتھر کے غم " [۱]

" ورتھر کے غم " (۱۷۷۴) ایک ناول ہے جو گوئٹے نے جوانی میں لکھی۔ یہ اس کے تجربوں اور نظریۂ حیات کا آئینہ دار ہے۔ یہ قصّہ ورتھر کے خطوں سے تشکیل پاتا ہے جو گہرے جذبات اور اعلیٰ روحانی حوصلے رکھتا ہے۔ اور قدرت اور فن میں بڑی دلچسپی لیتا ہے۔ مگر اس کی روح زندگی کے حقائق سے ٹکراتی ہے۔ معاشرہ اور معاشرے سے متعلق افراد اُسے دباتے ہیں اور وہ بار بار ناکام ہوکر غم زدہ ہوجاتا ہے۔ ایک

---

[۱] اُردو میں اس تصنیف کے متعدد ترجمے ہوچکے ہیں۔

ناکام محبت آخر میں اُسے خودکشی پر مجبور کرتی ہے۔ کتاب کا جو اقتباس یہاں پیش کیا گیا ہے وہ خطوط کے ایڈیٹر کی طرف سے ہے۔ اور ناول کے خاتمہ پر آتا ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ورتھر اپنی محبوبہ لوٹ سے آخری بار مل رہا ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے شخص البرٹ سے شادی کر چکی ہے۔ گوئٹے کا یہ ناول شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ کیونکہ چھپتے ہی بڑی کامیاب ہوئی۔ اس کے ہیرو کا کردار اس دور کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔

اسی دن جب ورتھر نے اپنے دوست کو خط لکھا تو کرسمس سے پہلے کی اتوار کا دن تھا۔ جب شام کے وقت وہ لوٹ کے گھر گیا تو وہ اوپر تھی اور کھلونے سجا رہی تھی جو اس نے اپنے بھائی بہنوں کو کرسمس پر دینے کے لئے خریدے تھے۔ ورتھر نے اس مسرت کا اظہار کیا جو بچے اس وقت محسوس کریں گے جب کہ دروازہ اچانک کھلے گا اور موم بتیوں سے سجا ہوا کرسمس کا درخت نظر آئے گا۔ شیرینی اور سیبوں کی وجہ سے وہ خود کو جنت میں محسوس کریں گے۔ لوٹ نے اپنی ندامت کو ایک حسین مسکراہٹ میں چھپانا چاہا۔ اس نے کہا، "تمہارے لئے بھی ایک تحفہ ہے اگر تم نیک بننے کا وعدہ کرو۔ ایک خوبصورت شمعدان اور کچھ اور"
نیکی سے تمہارا کیا مطلب ہے" اس نے کہا۔ "حسین لوٹ میں نیک کیسے ہو سکتا ہوں"
جمعرات کی شام کو کرسمس ہے۔" اس نے کہا" بچے آرہے ہیں اور میرے والد بھی اور اس وقت ان کو تحفے دئے جائیں گے۔ میں چاہتی ہوں تم بھی آؤ۔ مگر اس سے قبل نہیں۔

ورتھر چونکا۔

وہ کہتی رہی" مہربانی کرو۔ یہ سب یوں ہی ہے اور میں اپنے سکون و اطمینان کی خاطر حالات کو یوں ہی نہیں رہنے دینا چاہتی۔ بالکل نہیں۔"
اس نے لوٹ کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔ اور کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا اور نیچی آواز میں خود سے کہنے لگا، "معاملات اس طرح نہیں چل سکتے"۔ لوٹ نے ورتھر

کی اُس ذہنی پراگندگی کا اندازہ کرلیا جو اس کے الفاظ سے پیدا ہوئی تھی اس وجہ سے لوٹ اس خوف کو محسوس کرسکتی تھی جس میں اس کے الفاظ نے اسے ڈال دیا تھا۔ دوسری چیزوں کی بابت سوالات کرکے ورتھر کی توجہ دوسری طرف منعطف کرنے لگی مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔

اس نے کہا "نہیں لوٹ، میں اب تم سے نہیں ملوں گا۔"

"مگر کیوں؟" لوٹ نے کہا "ورتھر تم ضرور ضرور مجھ سے پھر ملنے آؤ۔ اعتدال ہے تو۔ تمہاری طبیعت میں اتنی شدت کیوں ودلیعت کی گئی ہے۔ ہر چیز کے لئے ایسا جوش کیوں ہے۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی " میں التجا کرتی ہوں تم اپنے ذہن اپنے علم، اپنی صلاحیت اور اس مسرت کا خیال کرو جو تمہیں ان چیزوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ آدمی بنو۔ اپنی محبّت اس پر ضائع نہ کرو جو صرف تم پر ترس کھا سکتی ہے ورتھر خاموش رہا اس نے لوٹ کو سنجیدگی سے دیکھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑے رہی۔ لوٹ نے کہا اطمینان سے سوچو ورتھر۔ یہ تو سوچو کہ تم اپنے کو دھوکا دے رہے ہو اور برباد کر رہے ہو۔ مجھے نہیں ورتھر۔ مجھے نہیں۔ کیونکہ میں دوسرے کی ہوں اور میں یہ بھی سمجھتی ہوں کہ میرا ناممکن الحصول ہونا ہی تمہاری خواہش کو بڑھاتا ہے۔

ورتھر نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور اسے غصہ سے دیکھنے لگا۔ "بڑی ہوشیار" وہ بولا "بڑی ہوشیار۔ کیا یہ آلبرٹ کے الفاظ ہیں۔ بڑے مصلحت آمیز ضرور۔"

"کوئی بھی یہ بات کہہ سکتا ہے۔" وہ بات کاٹتے ہوئے بولی "کیا یہ ممکن ہے کہ اس بڑی دنیا میں صرف ایک ہی عورت ایسی ہو جو تمہاری آرزو پوری کرسکتی ہو۔ خود کو سنبھالو اور اسے ڈھونڈ نکالو۔ مجھے یقین ہے۔ وہ تمہیں مل جائے گی۔ ایسے میں عرصے سے تمہارے اور اپنے لئے پریشان تھی کیونکہ تم نے اپنے اوپر کچھ حدیں عائد کرلی ہیں۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو اور کسی سفر پر چلے جاؤ جس سے تفریح ہو۔ اپنی محبت کا ایک عمدہ مرکز تلاش کرلو آؤ اور سچی دوستی کے فائدے اٹھاؤ۔"

گوٹز فون برلیشن جن

گوٹز فون برلیشن جن (آہنی ہاتھ والا گوٹز) (۱۷۷۳) گوئٹے کا وہ ڈرامہ ہے جو "اسٹرم اینڈ ڈرینگ" کے رجحان کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا ہیرو سولھویں صدی کے تاریخی پس منظر میں نظر آتا ہے اپنے دور کے سیاسی انقلاب میں غائب ہوجاتا ہے اور ایک نیا نظام ظہور کرتا ہے اور چھوٹی چھوٹی الگ الگ حکومتیں قائم ہوتی ہیں۔ گوٹز ظالم اور خود غرض امیروں کے خلاف ذاتی آزادی کا علم بلند کرتا ہے۔ وہ ایماندار اور خود پسند ہے، بہادر اور تنومند ہے۔ وہ شہنشاہ کا تابع رہنا چاہتا ہے۔ دھوکا کھانے پر وہ کسانوں کی فوج کا سردار ہوجاتا ہے۔ آخر میں وہ مار ڈالا جاتا ہے مگر اس کا تصوّر ایسے ہیرو کا ہے جو اپنے دور کی خرابیوں سے لڑتا ہے۔ ہم یہاں اس ڈرامے کا جو ٹکڑا پیش کر رہے ہیں اس میں گوٹز کی پیشی ہوتی ہے اور اس کے مقاصد اور اس کے دشمنوں کی چالیں ظاہر ہوتی ہیں۔

کلرک (پڑھتے ہوئے) میں گوٹز فون برلیشن جن اس خط کے ذریعہ پبلک میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے بادشاہ اور سلطنت کی مخالفت کی۔

گوٹز: یہ صحیح نہیں ہے۔ میں باغی نہیں ہوں۔ میں نے جہاں پناہ کے خلاف کوئی جُرم نہیں کیا اور مجھے سلطنت سے کوئی مطلب نہیں ہے۔

کونسلر: چُپ رہو اور آگے سنو۔

گوٹز: میں آگے کچھ نہ سنوں گا۔ کوئی سامنے آئے اور گواہی دے۔ کیا میں نے بادشاہ کے خلاف۔ آسٹریا کے خاندان کے خلاف کوئی قدم اُٹھایا۔ کیا میں نے اپنے اعمال سے یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ جرمنی اور خاص طور پر نائٹ اور آزاد لوگ بادشاہ کے کتنے احسان مند ہیں۔ اگر میں آپ کے نوشتہ پر دستخط کروں تو پھر میں بدمعاش ثابت ہو جاؤں گا۔

کونسلر: ہمارے پاس احکام ہیں کہ تم کو سمجھائیں اور ضرورت پڑے تو تم کو

قید کر دیں۔

گوٹز: مجھے قید کر دیں۔

کونسلر: اگر تم رحم کے لئے تیار نہیں ہو وہاں تم انصاف کا انتظار کر سکتے ہو۔

گوٹز: قید میں۔ تم شاہی قوت کا غلط استعمال کر رہے ہو۔ قید میں۔ یہ بادشاہ کا حکم نہیں ہے۔ پہلے تم نے میرے لئے جال بچھایا۔ تم نے شریفانہ انداز میں قسم کھائی تھی کہ مجھے شرفاء کی طرح نظر بند کیا جائے گا۔ اور اب تم وعدہ خلافی کر رہے ہو دھوکے باز۔

کونسلر: ہم ایک ڈاکو سے شریفانہ برتاؤ نہیں کر سکتے۔

گوٹز: اگر تم بادشاہ کے نمائندے نہ ہوتے جو میرے لئے لائق تعظیم ہے تو میں تمہیں ڈاکو کہنے کا مزا چکھا دیتا۔ میں باعزّت جھگڑے میں مصروف ہوں اگر تم ایک بھی ایسا کام کرتے جس کے لئے میں گرفتار کیا گیا ہوں تو تم خدا کا شکر ادا کرتے اور اپنے کو معزز ثابت کرتے۔

کونسلر: سیکٹر کو اشارہ کرتا ہے جو ایک گھنٹی بجاتا ہے۔

گوٹز: ذلیل مفاد کے لئے نہیں۔ مجبور عوام سے زمین چھین لینے کے لئے میں باہر نہیں آیا۔ خود کو اور اپنے بچّے کو بچانے کے لئے میں نے یہ کیا۔ کیا یہ کوئی جرم ہے؟ بادشاہ اور سلطنت کو ہماری ضرورت نہ محسوس ہوتی۔ شکر ہے خدا کا کہ میرا ایک ہاتھ باقی ہے اور میں نے اسے اچھی طرح استعمال کیا۔

(شہری ہاتھوں میں ڈنڈے لئے اور پہلو میں ہتھیار لگائے آتے ہیں۔)

گوٹز: یہ کیا ہے؟

کونسلر: تم لوگ کچھ نہ سنو اسے لے جاؤ۔

گوٹز: یہی مطلب ہے؟ تم میں سے جو ہسپانوی بیل نہ ہو وہ میرے قریب آئے۔ میں اپنے اس داہنے ہاتھ سے ایسا گھونسا دوں گا جو اسے ہمیشہ کے لئے دردِ سر، دانت کے درد اور ایسے ہی تمام دردوں سے نجات دے دیگا۔ (وہ قریب آتے

ہیں۔ وہ ایک کو زمین پر گرا دیتا ہے۔ اور دوسرے کے ہتھیار چھین لیتا ہے وہ بھاگتے ہیں) آؤ۔ آؤ۔ میں تم میں سے سب سے زیادہ بہادر کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

کونسلر: حکم مانو۔

گوٹز: اسی تلوار سے جو میرے ہاتھ میں ہے۔ میں ان خرگوش پکڑنے والوں کے درمیان سے اپنا راستہ نکال سکتا ہوں مگر میں تم کو وعدہ پر قائم رہنے کا سبق دینا چاہتا ہوں۔ مجھے شریفوں کی طرح نظر بند کرنے کا وعدہ کرو تو میں قید ہونے کے لئے تیار ہوں۔

کونسلر: تم تلوار ہاتھ میں لے کر شہنشاہ سے مقدمہ لڑنا چاہتے ہو۔

گوٹز: خدا نہ کرے۔ صرف تمہارے اور تمہارے ساتھیوں سے۔ تم گھر جاؤ اے نیک لوگو۔ تم نے جو وقت خراب کیا اس کا کوئی صلہ نہیں ہے اور یہاں تمہیں زخموں کے سوا کچھ نہ ملے گا۔

کونسلر: اسے پکڑ لو۔ کیا شہنشاہ کی محبت تمہارا حوصلہ نہیں بڑھاتی۔

گوٹز: بس اتنی ہمت ہے جتنی کہ شہنشاہ ان کو ان کے زخم باندھنے کے لئے پٹیاں دیتا ہے۔ جو ان پر بہادری کی بنا پر لگتے ہیں۔

ہاں بس اتنا حوصلہ ہے کہ ایسی بہادری سے جو زخم لگیں شہنشاہ انھیں ٹھیک کرنے کے لئے پٹیاں دے دیں۔

اگمانٹ

۱۷۷۵ء میں گوئٹے نے اپنا ڈرامہ اگمانٹ شروع کیا اور ۱۷۸۷ء میں ختم کیا اس میں اس کی جوانی کے اثرات ہیں۔ قصہ ان سچے واقعات پر مبنی ہے جو سولھویں صدی میں ہالینڈ کی جنگ آزادی میں پیش آئے تھے۔ اس زمانے میں ہسپانیہ کی فاتح فوجوں نے ہالینڈ پر قبضہ کر لیا تھا لیکن ڈرامے کا مرکز تاریخی واقعات نہیں بلکہ اگمانٹ کی شخصیت ہے۔ یہ شخص تحریک آزادی کا رہنما لیڈر رہا تھا اور عوام اس کی پرستش کرتے تھے۔ اگمانٹ نے اپنی تقدیر پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے جذبات اور خوش مزاجی کو

رہنما بنایا۔ اور حقیقت کے خطروں کو فراموش کرتے ہوئے اپنے دوست آرمنج کے مشوروں کو نظرانداز کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہسپانیوں کے جال میں پھنس گیا۔ یہاں جو اقتباس ہے اس میں وہ ہسپانوی سردار ڈیوک آف البا سے باتیں کرتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ دونوں میں تکرار ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگمانٹ کو پکڑ لیا جاتا اور بعد میں پھانسی دے دی جاتی ہے۔

ایکٹ چوتھا سین دوسرا

اگمانٹ : یہ بے سبب تبدیلیاں، یہ بے پناہ مداخلت، کیا ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ایک شخص نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا ہے جو دوسرے ہزاروں نہیں کرسکتے؟ وہ صرف اپنے لئے آزادی چاہتا ہے تاکہ وہ اپنی ہر خواہش پوری کرسکے اور اپنے ہر خیال کی تکمیل کرسکے۔ فرض کرو کہ اسے نیک اور عقلمند بادشاہ مان کر ہم اس پر اعتماد کرلیں تو کیا وہ اپنے وارثوں کے ذریعہ بھی ہماری بات قائم رکھے گا؟ کیا وہ یہ وعدہ کرسکتا ہے کہ وہ لوگ ظلم نہ کریں گے؟ اس کے ملازموں سے، جو ملک کی ضروریات نہ جانتے ہوئے اپنی مرضی کے مطابق حکم چلاتے ہیں، ہمیں کون بچاسکتا ہے؟ کوئی اس کے خلاف نہیں ہوتا اور وہ خود کو کسی کے سامنے ذمہ دار نہیں سمجھتے۔

آلبا (جو اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا) اس سے زیادہ قدرتی اور کوئی بات نہیں ہے کہ ایک بادشاہ خود حکومت کرے اور حکمرانی کے لئے ایسے لوگ چھانٹے جو اُسے سمجھتے ہیں اور جو اس کے حکم پر چلتے ہیں۔

اگمانٹ : یہ بھی اتنا ہی قدرتی ہے کہ ایک شہری ایسے آدمی کا حاکم مانے جو اس کے ساتھ پلا اور بڑھا ہو۔ اور جو صحیح و غلط کا وہی تصور رکھتا ہو جو اس شہری کا ہے۔ اور اسے اپنا بھائی مانے۔

آلبا : مگر رؤسا نے اپنے بھائیوں سے حصہ بٹا لیا ہے۔

اگمانٹ: یہ صدیوں پہلے ہوا اور اب مانا جاتا ہے۔ لیکن اگر نئے آدمی وہاں بھیجے جائیں جہاں ان کی ضرورت نہیں ہے اور وہ خود کو اس قوم کے مال سے دولت مند بنالیں اور اگر عوام سخت، بے لاگ اور بے شرم لالچ کا شکار بنا لئے جائیں تو ایسا غلغلہ اُٹھے گا جو آسانی سے دب نہیں سکے گا۔

البا: مجھ سے وہ بات کہتے ہو جو میں سُن نہیں سکتا۔ میں بھی یہاں غیر ملکی ہوں۔

اگمانٹ: جو کچھ میں آپ سے کہہ رہا ہوں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میں آپ کے متعلق نہیں کہہ رہا ہوں۔

البا: اسی لئے میں تم سے کچھ سننا نہیں چاہتا۔ مجھے بادشاہ نے یہاں اس لئے بھیجا تھا کہ روسار میری مدد کریں گے۔ بادشاہ اپنے ارادے رکھتا ہے۔ غور وفکر کے بعد اسے معلوم ہوگیا ہے کہ عوام کے لئے کیا بہتر ہے۔ حالات کو ان کے حال پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ بادشاہ کا مقصد عوام کی بہتری ہے اسی لئے ان کو قابو میں رکھنا ضروری ہے۔ اگر ضرورت ہو تو ان کی بھلائی کو قوت کے سہارے بھی پھیلایا جاسکتا ہے۔ بدمعاشوں کو ختم کرنا بہت ضروری ہے تاکہ باقی شہری اطمینان سے رہیں اور عقلمند حکومت کے فائدے اُٹھائیں۔ یہ شہنشاہ کا فیصلہ ہے اور میں روسار کے لئے اس کا اعلان کرتا ہوں۔ ان کی بھلائی کے لئے میں شہنشاہ کے فیصلوں کو عمل میں لاؤں گا اس کے لئے مجھے کسی کی ہدایت درکار نہیں ہوگی۔

اگمانٹ: تمہارے الفاظ عوام کے خوف کو صحیح ثابت کرتے ہیں۔ یہ خوف ہر طرف ہے۔ شہنشاہ نے اس چیز کا عزم کر لیا ہے۔ جو کسی حکمران کو زیب نہیں دیتا۔ عوام کی قوت، ان کی روح اور ان کا تصورِ حیات برباد کیا جا رہا ہے تاکہ ان پر آسانی سے حکومت ہو سکے۔ ان کی باطنی شخصیت کو غلط راہ پر لگایا جا رہا ہے تاکہ ان کو بظاہر خوش رکھا جائے۔ وہ انہیں برباد کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ جو کچھ ہیں اس سے مختلف ہو جائیں۔ اگر اس کے ارادے نیک ہیں تو وہ غلط ہیں۔ ہم بادشاہ کی

قوت کے خلاف نہیں ہیں۔ ہم اُس بادشاہ کے خلاف ہیں جو غلط راہ پر جارہا ہے

البا: اگر تمہارے خیالات ایسے ہیں تو تم سے اتفاق کرنے کی کوشش فضول ہے۔ تم بادشاہ کا خیال نہیں کرتے۔ اور اس کے مشیروں کو اور بھی کم خیال کرتے ہو۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ جو کچھ تم کہتے ہو اس پر اچھی طرح غور نہیں کر لیا گیا تو تم غلطی پر ہو۔ میرا کام اس معاملے میں بحث کرنا نہیں ہے۔ میں عوام کی فرماں برداری چاہتا ہوں اور تم سے جو ان کے لئے مثال ہوئیں ہدایت اور عمل چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم خود کو فرض ادا کرنے کے لئے ذمہ دار بناؤ۔

الگمانٹ: تو ہمارے سر مانگو اور انہیں کاٹ لو۔ روحانی شرافت رکھنے والے کے لئے غلامی کا جُوا کندھے پر رکھنا یا دار پر چڑھ جانا دونوں یکساں ہیں۔ میں نے فضول ہی اتنی گفتگو کی۔ ہوا کو جُنبش دی ہے اور کچھ نہیں کیا۔

ولہلم میسٹر

ولہلم میسٹر (۱۷۹۶-۱۷۹۵) ایک ناول ہے جس میں ایک نوجوان کے کردار کا ارتقار دکھایا گیا ہے۔ یہ ناول گوئٹے کے کلاسکی نظر کا آئینہ دار ہے۔ قصہ مصنّف کے اپنے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ ولہلم میسٹر ایک سوداگر کا لڑکا ہے۔ جو ایک سفر پر جاتا ہے۔ سفر کے دوران اسے بڑے بڑے تجربے ہوتے ہیں۔ جن سے اسے علم اور عقل حاصل ہوتی ہے۔ اس کا اپنا کردار اور ماحول کے اثرات ہم آہنگ ہوکر مفید نتائج مرتب کرتے ہیں۔ فرد اور دنیا کی یہ کشمکش "ورتھر" میں بیان کی ہوئی کشمکش کے متضاد ہے۔ شروع میں ولہلم میسٹر اپنے گھر کے ماحول کی تنگ نظری سے بچنا چاہتا ہے تاکہ اپنی صلاحیت کو تکمیل کرلے۔ اور اسٹیج کے پیشے میں آجائے لیکن زندگی کا تجربہ اور پختہ مزاج دوستوں کی رہنمائی اور بالواسطہ تعلیم کے ذریعہ سے اسے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ زندگی کا مقصد مسرّت معاشرے میں صحیح

مقام حاصل کرنا ہے اور اس کے حصول کے لئے بنی نوع انسان کی خدمت کرنا چاہیئے تاکہ اپنی شخصیت میں عظمت پیدا ہو۔ یہی خیال ایک بعد کی تصنیف میں بھی ملتا ہے۔ جس کا نام "ولہلم میسٹر کا سفر" ہے۔

یہاں جو اقتباس منتخب کیا گیا ہے اس میں ولہلم کے باپ اور اس کے دوست ورنر کو ان کے عوامی ماحول میں دکھایا گیا ہے۔ گوئٹے نے اپنے زمانے کے متوسط طبقہ کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس میں کچھ لوگ متوازن اور مفید زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دوسرے دنیاوی عیش میں پڑے ہیں۔ ولہلم کے فنی رجحان کے لئے یہ زندگی سطحی اور بے معنی ہے۔ اس لئے وہ اپنے لئے کچھ اور منصوبے بناتا ہے۔ مگر اپنی تربیت کے خاتمے پر وہ شادی کے ذریعہ ایسے اوسط طبقے سے متعلق ہو جاتا ہے جو اعلےٰ طبقہ سے ملحق ہے۔

پہلی کتاب کا حصّہ

مناسب ہے کہ اب ہم ولہلم اور ورنر کے والدوں کی بابت کچھ جان لیں۔ ان دونوں کا طریقِ فکر مختلف تھا۔ مگر ان کی رائے اس حد تک ایک تھی کہ دونوں تجارت کو سب سے باعزت پیشہ سمجھتے تھے اور دونوں جملہ تجارتی فوائد کی جانب متوجہ رہتے تھے۔ بڈھے میسٹر نے اپنی دولت کو تصویروں، ڈرائنگ پلیٹوں اور قدیم نادر اشیاء میں خرچ کیا اس نے اپنا گھر بالکل نئے طریقہ پر سجایا اور اپنے سرمایہ کو ہر قسم کے نفع میں لگایا۔ اپنی دولت کا کافی حصّہ اس نے تجارت میں لگایا جو بڑے ورنر کے تصرّف میں تھی۔ بڑا ورنر ماہر سوداگر تھا اور نفع کمانے میں مشہور تھا مگر میسٹر کی یہ خواہش تھی کہ اپنے لڑکے میں وہ صلاحیتیں پیدا کرے۔ جن سے وہ محروم تھا اور اس طرح اپنے بچوں کے لئے وہ سرمایہ ہی کو سب سے اہم سمجھتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اسے شان و شوکت سے خاص لگاؤ تھا۔ اسے وہ اشیاء پسند تھیں جو دیکھنے میں بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ قیمتی اور پائدار ہوتی تھیں وہ اپنے گھر کی ہر چیز کو عمدہ اور

دیرپا دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے خزانوں کو معمور دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا سامان پائدار اور فرنیچر قیمتی تھا۔ وہ مہمان کم ہی بلاتا تھا۔ کیونکہ اس کے یہاں ہر کھانا اتنا قیمتی ہوتا کہ اسے بار بار پیش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کے گھر کا نظام ایک راہ پر چلتا رہا اور اس میں جو چیز بھی تھی مناسب تھی اور کسی طرح دلچسپ نہیں ہوتی تھی۔

بڑا ورنر اپنے تاریک اور شکستہ گھر میں دوسرے قسم کی زندگی بسر کرتا تھا۔ جب اس کی چھوٹی سی دکان کا کام ختم ہو جاتا تو ورنر خوب کھانا کھاتا اور خوب شراب پیتا۔ وہ اچھی چیزوں کو اکیلا کھانا پسند نہ کرتا۔ بلکہ اپنے دوستوں کو مدعو کرتا اور اکثر اجنبی لوگوں کو بلاتا۔ اس کی کرسیاں پرانی اور معمولی قسم کی تھیں مگر وہ روز کسی نہ کسی کو ان پر بیٹھنے کے لئے بلاتا۔ عمدہ کھانے مہمانوں کو مرعوب کرتے اور وہ یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ یہ کیسے برتنوں میں پیش کیا گیا ہے اس کے تہہ خانہ میں زیادہ شراب نہ تھی مگر خالی جگ عام طور پر بہت عمدہ شراب سے بھرے جاتے تھے۔

یہ دونوں اس طرح کی زندگی بسر کرتے تھے اور کبھی کبھی اپنے مشترکہ معاملات پر مشورہ کرنے کے لئے ملتے تھے۔ جس دن کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس دن ولہلم کسی تجارتی کام پر گھر سے باہر بھیجا جا رہا تھا۔

" اسے دنیا دیکھنے دو " بڈھے میسٹر نے کہا " اور ہماری تجارت دور کے شہروں میں پھیلانے دو۔ ایک جوان کے لئے اس سے بہتر کچھ نہیں ہو سکتا کہ اسے آئندہ کی زندگی کے لئے تیار کیا جائے۔ تمہارا لڑکا اپنی پہلی مہم سے خوش واپس آیا اور اپنے کام کو ہوشیاری سے کر کے آیا تھا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ میرا لڑکا کیا کرے گا۔ اس کا تجربہ شاید مہنگا پڑے۔

بڈھے میسٹر کو اپنے لڑکے کی قابلیت پر ناز تھا اس نے یہ بات اس لئے کہی کہ اس کا دوست اختلاف کرے گا اور اس کے لڑکے کی صلاحیتوں کی تعریف کرے گا لیکن اس معاملے میں اس نے دھوکا کھایا۔ بڑے ورنر نے جو ایسے کسی شخص پر اعتماد

نہیں کرنا تھا۔ جو مفید نہ ثابت ہو چکا ہو، صاف جواب دیا " ہم کو ہر چیز کا تجربہ کرنا چاہیئے۔ ہم کو اسے سفر پر بھیجنا چاہیئے۔ ہم اس کو ایک ہدایت نامہ دیں گے بہت سے قرضے وصول کرنا ہیں۔ پرانے تعلقات کی تجدید کرنا ہے۔ نئے تعلقات پیدا کرنا ہیں۔ وہ اس معاملے میں بھی مدد کرے گا جس کی ہم بات چیت کر رہے تھے کیونکہ مقامی حالات سے واقف ہوئے بغیر اس معاملے میں کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

عجیب جوان پڑوسی

گوئٹے کا افسانہ " عجیب جوان پڑوسی " اس کی ناول " وہال وردانڈ سٹ شا وفٹن " (۱۸۰۹) کا ایک حصہ ہے اور اپنے سباق کے حوالہ سے بہتر سمجھا جا سکتا ہے۔ اس ناول میں یہ دکھایا گیا ہے محبت اور ازدواج کے بندھن میں کشمکش ہوتی ہے اور معاشرے کے قوانین جذبات اور تنظیم کے دشمن ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں بھی گوئٹے مفاہمت کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ یہ افسانہ بھی اسی مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے مگر متضاد طریقہ پر۔ یہاں محبت ظاہرا اور وقتی کشمکش پیدا کرتی ہے اور آخر میں شادی پر ختم ہوتی ہے۔

ناول کا تہذیب یافتہ اٹھان مطمئن کردار سے تضاد پیدا کرتا ہے اور قدرت سے ہم آہنگ ہو کر پریوں کے افسانہ کی طرح کا انداز اختیار کر لیتا ہے۔ یہ طریقہ مسئلے کے شادی پر اختتام اور ناول کے تاریک خاتمے دونوں کی اہمیت کو ختم کر دیتا ہے۔ حالانکہ افسانے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسئلے کا خوشگوار حل بھی ممکن ہے۔

ایک جوان لڑکے اور لڑکی کی جو اونچے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور پڑوس میں رہتے تھے تربیت اس طرح ہوئی کہ ایک دن دونوں کی شادی کر دی جائے گی۔ دونوں اس بات پر خوش تھے مگر کچھ ہی دنوں کے بعد یہ دیکھا گیا کہ ان کے درمیان عجیب قسم کی نفرت بڑھنے لگی۔ دونوں جو ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے تھے، اپنے اپنے

خیال میں گم رہنے لگے اور جب آمنے سامنے ہوتے تو لڑنے لگتے۔

یہ نفرت ان کے بچپن کے کھیلوں میں نمایاں ہوئی اور سن کے ساتھ بڑھتی گئی۔ ایک مرتبہ دونوں اپنی اپنی فوج جمع کر کے لڑے۔ لڑکے نے لڑکی کو پکڑ لیا اور رومال سے اس کے ہاتھ باندھ دئے۔

لڑکی یہ واقعہ نہ بھولی اور لڑکے کو نقصان پہنچانے کے وہ وہ طریقے سوچنے لگی کہ ان کے والدین نے دونوں کو الگ الگ کر دیا اور ان کی شادی کی تمام امیدیں منقطع ہو گئیں۔

لڑکا نئے ماحول میں بہت خوش ہوا۔ تعلیم حاصل کی اور فوج کی ملازمت میں آگیا۔ اسے مقبولیت اور عزت حاصل ہوئی۔

لڑکی دوسرے حالات میں پہنچ گئی اور اس کے ماحول میں کوئی چیز ایسی نہیں ہوئی جو اس کی قدیم نفرت میں اضافہ کرتی۔

ایک جوان آدمی جو اس کے پڑوسی سے عمر میں بڑا تھا اور عزت و دولت کا مالک تھا اس سے محبت کرنے لگا۔ اس کے عادات واطوار، لڑکی کے والدین سے اس کا برتاؤ اور اس کا کردار لڑکی کی توجہ کے مرکز بن گئے۔ اکثر کہا جاتا تھا کہ اس کی منگنی ہو چکی تھی مگر اب یہ معاملہ پرانا ہو گیا۔ چنانچہ لڑکی نے اس نئے آدمی کی انگوٹھی چپ چاپ قبول کر لی۔

اس دوران وہ جوان لڑکا چھٹی پر گھر واپس آیا لڑکی نے اسے دیکھا اور پرانی نفرت ختم ہو گئی۔ دونوں ملے اور مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے اور پرانی لڑائی ایک قسم کا مذاق بن گئی۔

جوان کو یہ دوستی اچھی معلوم ہوئی اور اس نے اس کے عاشق کا بھی کوئی خیال نہیں کیا۔ لڑکی کے ساتھ معاملہ مختلف تھا اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ ایک خواب سے جاگی ہے۔ اُسے یہ محسوس ہوا کہ وہ ہمیشہ اسی لڑکے سے محبت کرتی تھی جھگڑوں کے واقعات بڑی دلچسپی سے یاد آئے۔ وہ اپنے جذبات چھپائے رہی۔ ایک طرف وہ اپنے منتخب کردہ شخص سے وابستہ تھی اور دوسری طرف وہ دل ہی دل میں اس جوان پر

فریفتہ تھی۔ اسی کشمکش میں اس نے یہ طے کیا کہ اپنی زندگی کو ختم کردے۔ اور اس طرح اس جوان کو سزا دے جس سے وہ پہلے نفرت کرتی تھی اور جو اب اس سے محبت کرنے پر تیار نہیں معلوم ہوتا تھا۔

جوان نے چھٹی ختم ہونے سے پہلے ایک تفریح کا انتظام کیا۔ اس نے ایک تفریحی جہاز حاصل کیا۔ اور پھر سب لوگ گاتے بجاتے جہاز پر روانہ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد اس جوان نے ناخدا کو الگ کر کے جہاز خود چلانا شروع کر دیا۔ جہاز اتفاقاً ایسے مقام پر پہنچا جہاں دو جزیروں کی وجہ سے راستہ تنگ ہو گیا تھا۔ جوان نے یہاں بھی ناخدا کو سونے دیا۔ اور خود اس تنگ نائے سے جہاز نکالنے لگا۔ اس وقت اس کی حسین دشمن نے آکر اپنے بالوں میں لگا ہوا گجرا اس کی طرف پھینکا اور خود دریا میں کود گئی۔ لوگ چلّانے لگے۔ ناخدا جاگ اٹھا جوان نے جہاز اس کے سپرد کیا خود دریا میں کود پڑا۔ اور اس لڑکی کے پیچھے پیچھے جانے لگا۔ اس نوجوان نے لڑکی کو جلد ہی پکڑ لیا اور ایسی جگہ پہنچا جہاں ایک سبز مقام تھا یہاں آکر اس نے لڑکی کو دیکھا جو ٹھنڈی ہو چکی تھی وہ پریشان ہوا مگر یہاں سے ایک راستہ جاتا دکھائی دیا جس پر وہ اسے لاد کر لے چلا آگے جاکر اسے ایک جھونپڑا نظر آیا جس میں ایک نیا شادی شدہ جوڑا تھا۔ ان لوگوں نے کوشش کی۔ لڑکی نے آنکھیں کھول دیں اور جوان کو دیکھا ان کے کپڑے گیلے تھے۔ اور جھونپڑے والے جوڑے نے اپنے بیاہ کے کپڑے جو الگ ٹنگے تھے انہیں پہننے کو دئے۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت خوش ہوئے اور اپنے ساتھیوں کو بھول گئے۔

اب اس دیہاتی نے جو جھونپڑے میں تھا باہر دیکھا تو ناخدا ان لوگوں کی تلاش میں آرہا تھا۔ دیہاتی نے جہاز کے لوگوں کی رہنمائی کی۔ وہ جھونپڑے کے قریب آئے جوان لڑکا اور لڑکی اپنے عجیب لباس میں سامنے آئے تو انہیں پہچاننا مشکل ہوا۔ یہ دونوں اپنے والدین کے پیروں پر گر پڑے اور بولے "ہم کو دعائیں دیجئے"۔ یہ جملہ انہوں نے تین دفعہ دہرایا اور کسی نے ان کی التجا کو رد نہیں کیا۔

مترجم کے کام پر غور و فکر

گوئٹے کی تصنیف "مترجم کے کام پر غور و فکر" (۱۸۲۸) تمام قوموں کے ادب کی خصوصیات اور قدر و قیمت پر اس کے خیالات کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کا مقصد وہ مشترکہ انسانیت ہے جو دنیا کے ادب سے واضح ہوتی ہے۔ اور قومی خصوصیات میں جو سامنے آتی ہیں وہ رواداری اور باہمی عزت ہے جو ہمہ گیر انسانیت پیدا کرتی ہے گوئٹے کے بقول بین الاقوامی تہذیبی تبادلہ ان سب چیزوں کے لئے ضروری ہے۔

صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام اقوام کے شاعر اور جمالیاتی مصنّفین کے کارنامے آفاقی انسانیت کی طرف گامزن ہیں۔ ہر صنف میں چاہے وہ محض طبع زاد ہو، تاریخی ہو، صنمیاتی ہو یا تخیّلی ہو ہم دیکھیں گے کہ آفاقی عنصر قومی اور انفرادی عنصر سے زیادہ نمایاں ہوتا جائے گا۔

چونکہ عملی زندگی میں بھی یہی رجحان ہے مگر یہ بہیمیت، بے رحمی، جھوٹ وغیرہ سے وابستہ ہے۔ اس لئے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ اس کے ذریعہ آفاقی امن قائم ہو جائے گا۔ مگر پھر بھی یہ لازمی کشمکش رفتہ رفتہ کم ہو جائے گی۔ جنگ کم ہیبت ناک ہو جائے گی اور فتح اتنی مغرور نہیں ہوگی۔

دوسری قوموں کے ادب میں جو کچھ ہے وہ اسی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسری قوموں کو بھی یہی صفات پیدا کرنا ہوں گی۔ ہمیں ہر قوم کی صفات کو جاننا چاہیئے اور اس طرح ہر قوم سے تعلق پیدا کرنا چاہیئے کیونکہ ایک قوم کی صفات اس کی زبان اور اس کے سکّہ کی طرح زیادہ ربط کا ذریعہ ہیں۔

اگر ہم افراد اور قوموں کی شکایات پر غور کریں تو زیادہ آفاقی رواداری حاصل ہو سکتی ہے مگر ہم کو یہ عقیدہ بھی قائم رکھنا چاہیئے کہ ان میں اہم صفات وہ ہیں جن کا تمام انسانیت سے تعلق ہے۔ عرصہ سے جرمن قوم اس رواداری اور باہمی ربط کی کوشش کررہی ہے۔ جو شخص جرمن زبان پڑھتا ہے وہ ایسے بازار میں آتا ہے جہاں

ہر قسم کا سامان بِک رہا ہے اور وہ اپنے کو فائدہ پہنچانے کے ساتھ ساتھ تمام ادب کا مُفسّر بن جاتا ہے۔

اسی طرح ہر مترجم آفاقی روحانی تجارت کا بیوپاری ہے اور تبادلہ کے کام میں اضافہ کرتا ہے۔ کیونکہ ترجمہ کی خامیوں کی بابت کچھ بھی کہا جائے اس کی اہمیت بین الاقوامی تبادلۂ خیالات میں بہت ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے ،، خدا نے ہر قوم کے لئے اسی کی زبان بولنے والا پیغمبر نازل کیا۔ اسی طرح ترجمہ کرنے والا اپنی قوم کا پیغمبر ہے۔

اکرمین سے بات چیت

گوئٹے کی فکر کا کافی حصّہ اور اس کی طویل زندگی کے تجربات ہمیں اکرمین سے بات چیت" میں بھی ملتے ہیں۔ اکرمین اس کا سکریٹری تھا اور اس نے اس بات چیت کو لکھ ڈالا ہے۔ درج ذیل اقتباس اس بات چیت سے تعلق رکھتا ہے جو ۱۸۲۴ء میں ہوئی اور انقلاب کی بابت گوئٹے کی رائے کا اظہار ہے۔ حالانکہ انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء کے سلسلے میں وہ ان کو لازمی مانتا ہے مگر وہ انقلابات کو پسند نہیں کرتا کیونکہ ان کے حالات بڑے مخدوش ہوتے ہیں۔ اس رائے کا سبب قدامت پرستی نہیں ہے گوئٹے کا نظریہ وہ ہے جس کی بنا پر وہ ایک متوازن دنیا چاہتا ہے جو باہمی ربط اور توازن پر مبنی ہو۔

یہ صحیح ہے کہ میں انقلاب فرانس کا حامی نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی ہیبت ناک باتیں میں روز سنتا تھا اور اس پر برافروختہ ہوتا تھا۔ اس زمانے میں اس کے نتائج ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ اور میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ جرمنی میں بھی کچھ لوگ وہی حالات پیدا کرنا چاہتے تھے جو فرانس میں لازمی ہو گئے تھے۔

اسی طرح میں عام وہم کا بھی طرفدار نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ انقلاب قوم کی نہیں بلکہ حکومت کی خامی سے وجود میں آتا ہے۔ جب تک حکومتیں انصاف

پر قائم رہتی ہیں انقلاب نہیں آتے کیونکہ حکومتیں عوام سے سمجھوتا کرتی رہتی ہیں اور جب تک ضروری تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں عوام زبردستی نہیں کرتے۔

چونکہ میں انقلاب سے نفرت کرتا تھا اس لئے مجھے رجعت پسند کہا جاتا تھا مگر یہ بڑی مبہم رائے ہے اور اس پر مجھے اعتراض ہے۔ اگر رجعت پرستی عمدگی، نیکی اور انصاف پر مبنی ہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اگر وہ بُرائی، بے انصافی اور خامی پر مبنی ہے تو اس کا طرفدار بُرائی اور فرسودگی کا طرفدار ہوگا۔

وقت دائمی ترقی کے ہاتھ میں ہے اور انسانی معاملے ہر پچاس برس میں مختلف ہو جاتے ہیں۔ جو ادارہ ۱۸۰۰ میں کامل تھا، ۱۸۵۰ میں ناقص ہو جاتا ہے۔
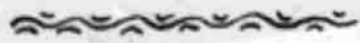
فریڈرش فان شیلر

فریڈرش فان شیلر (۱۸۰۵ - ۱۷۵۹) مارباس، ورٹمبرگ میں پیدا ہوا۔ دلوک کارل یوجن کے فوجی کالج میں کیڈٹ کی حیثیت سے اسے احساس ہوا کہ مطلق العنان حکومت انفرادی آزادی پر کس طرح اثرانداز ہوتی ہے وہ ورٹمبرگ سے فرار ہوکر پریشانی کی زندگی بسر کرنے لگا اس نے ڈراموں کے اپنے معاشرے پر تنقید کی۔ اس کا ڈرامہ "لوئیسی ملیرن" جو اس عہد کا پرزور نمائندہ ہے اس کے شہکار "ڈاکو" سے کچھ ہی کم مرتبہ رکھتا ہے۔ "ڈون کارلو" سے وہ اپنے کلاسیکی دور میں آجاتا ہے۔ ۱۷۸۷ء میں وہ ویمیر آگیا جو جرمنی میں کلاسیکیت کا مرکز بن گیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ گوئٹے کا دوست تھا۔ ۱۷۹۶ تک شیلر نے زیادہ تر فلسفیانہ اور ادبی مضامین لکھے جو اس کی تصانیف کو سمجھنے کے لئے اہم ہیں۔ یہ مضامین اس کی عینیت پسندی کو بھی واضح کرتے ہیں جو کانٹ کے فلسفہ سے متعلق ہے۔ اگرچہ کچھ معنوں میں اس سے مختلف بھی ہے' ۱۷۹۹ سے اپنی موت یعنی ۱۸۰۵ تک شیلر بیمار رہا۔ مگر یہی اس کے بہترین ڈراموں کا دور ہے جو یکے بعد دیگرے معرض تحریر میں آئے اور ان کے نام "والنسٹن" "میریا اسٹوارٹ" "جون آف آرک" "تماند فرام سینا" اور "ولیم ٹل" ہیں۔ ان کا پس منظر ایک ایسی دُنیا ہے جو اعلیٰ قوانین پر چلتی ہے مگر وہ حقیقت اور مجاز میں فرق واضح کرتا ہے۔ گوئٹے کے برعکس جسے زندگی میں قدرت اور دنیا سے ربط میں آہنگ نظر آتا ہے' شیلر ایک عینیت پسند کی کشمکش دکھاتا ہے جو حقائق سے لڑنے میں المیہ نتیجہ پر منتج ہوتی ہے۔ لیکن ذاتی آزادی کی وجہ سے تقدیر پر فتح مند ہوتا اور اس طرح اپنے نصب العین کو حاصل کرلیتا ہے۔

"ڈاکو"

شیلر کا پہلا ڈرامہ "دی رابرز" (۱۷۸۱) اپنے موضوع کے لحاظ سے گوئٹے کے "گوٹز" کی طرح "اسٹرم اینڈ ڈرینگ" سے تعلق رکھتا ہے حالانکہ قصہ قدیم زمانے کا ہے لیکن اس کا پیغام شیلر کے دور کے لئے ہے۔ اس کا ہیرو کارل مور آزادی، انصاف اور عمل کی بے انتہا خواہش رکھتا ہے۔ ڈاکوؤں کے سردار کی حیثیت سے وہ ایسے سماج سے باغی ہو جاتا ہے جس کی برائیوں اور بے انصافیوں کا اس نے تجربہ کیا ہے۔ ڈرامے کا اختتام شیلر کے عینی ڈراموں سے ہم آہنگ کردیتا ہے۔ کارل مور خود کو آفاقی اخلاقی قوانین توڑنے کا مجرم قرار دیتا ہے اور خود کو حکومت کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کا بھائی فرانز مور اس کا متضاد کردار ہے جس کا نقطۂ نظر مادیت اور منفعت پر مبنی ہے اور جو اپنی جنگجوئی اور انسان سے نفرت کی بنا پر ویلن ہے۔ یہاں جو اقتباس پیش کیا گیا ہے اس میں مور اپنی ناجائز خواہشوں کی تکمیل کے لئے اپنے باپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بناتا ہے۔

یہ ڈرامہ انقلابی سمجھا گیا اور بے حد کامیاب ہوا۔ لیکن شیلر کے مربی ڈیوک نے اسے آگے لکھنے سے روک دیا۔

فرانسس ڈی مور: (اکیلا اپنے کمرے میں سوچ رہا ہے) میں صبر کھو چکا ہوں۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ وہ اچھا ہو رہا ہے۔ بڈھے کی زندگی کتنی طویل ہے۔ اگر یہ گوشت کا لوتھڑا جو جہنم کے کتے کی طرح میرے دولت پانے کا راستہ روکے ہے ہٹ جائے تو میرا راستہ صاف ہو جائے۔ مگر کیا میری تجاویز مشین کے آہنی زور میں دب جائیں۔ کیا میری اعلیٰ روح گھونگے کی طرح راستہ طے کرلے۔ ایک روشنی کو جو تیل کے آخری بوند پر ٹمٹما رہی ہے بجھا دیتا ہے مگر میں یہ خود نہیں کروں گا۔ لوگ کیا کہیں گے۔ میں ہوشیار طبیب کی طرح کام کروں گا۔ ہم کو زندگی بڑھانے کی اجازت ہے

تو ختم کرنے کی اجازت کیوں نہ ہو؟ فلسفی اور طبیب کہتے ہیں کہ روح کا رجحان مشین کی رفتار سے ہم آہنگ ہے۔ اگر کوئی موت کا نیا دروازہ کھول دے تو کیا ہو۔ جسم کو دماغ سے برباد کرادے تو یہ نئی بات ہو گی۔ کیا زہر دینے کے کام کو ایک منظم علم نہیں بنا دیا گیا۔ اس سلسلے میں کوئی اپنی صلاحیت کیوں نہ استعمال کرے۔ میں کیسے جسم اور روح کا رابطہ ختم کروں گا۔ کیسے جذبات پیدا کروں غصہ ــــ یہ بھیڑیا جلد اپنے شکار کو کھا لیتا ہے۔ غم۔ یہ کیڑا بہت دیر لگاتا ہے۔ الم۔ یہ سانپ بہت آہستہ چلتا ہے۔ خوف۔ اُمید اس کی دھار اُٹ دیتی ہے۔ کیا صرف یہی ہمارے جلّاد ہیں۔ کیا موت کے ہتھیار ختم ہو گئے (خیالات میں گم ہو جاتا ہے) اب کیا؟ آگے کچھ نہیں؟ ہا (چونک کر) مجھے مل گیا دہشت۔ دہشت کیا نہیں کر سکتی؟ عقل اور مذہب اس دیو کے خلاف کیا کر سکتے ہیں لیکن اگر وہ اس طوفان کو بھی سہہ جائے تو پھر کیا ہو گا۔ میری مدد کرو۔ پریشانی اور توبہ جو روح کو کھانے والے کیڑے ہیں۔ دائمی برباد کرنے والے اور دائمی زہر پیدا کرنے والے تو تاسف اور تم مددگار! مسکراتے ہوئے ماضی اور تم پھول کی طرح کھلے ہوئے مستقبل۔ اس طرح مجھے موت کا کھیل کھیلنے دو۔ کمزور زندگی پرواز کرنے دو اور فوج کا آخری حصہ نااُمیدی کے قابو میں ہوگا خوب میری تجویز تیار ہے۔ گہری۔ اعتماد کے قابل۔ محفوظ۔ کیونکہ اس کے چاقو کا کوئی نشان کبھی نہ ہو گا۔ (مستقل ہو کر) اب کام شروع ہو۔ (ہرمن داخل ہوتا ہے) آخاہ ــ تم آسمانی مددگار ہو۔

اعزاز گُم شدہ کا مُجرم

شیلر کا افسانہ "عزت سے گرا ہوا مجرم" (۱۷۸۵) جس کا ایک مختصر ٹکڑا یہاں پیش کیا گیا ایک سچے واقعہ پر مبنی ہے۔ شیلر ایک ملزم کی نفسیات کا مطالعہ کرتا ہے جو یہ سوچتا ہے کہ اس مجرم کو جو اپنی سزا پا چکا ہے اگر معاشرہ الزام سے بری کر دے تو

مناسب ہے۔ ناامیدی اسے اور جرم کرنے پر مجبور کرتی ہے اور وہ بد سے بدتر ہو جاتا ہے۔ کرسچین ولف کا کردار بد نہیں ہے کیونکہ اسے عزت کا خیال ہے۔ اس کے جرم سماج سے بغاوت پر شروع ہو کر زیادہ شدید ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں شیلر اس مسئلہ کو سامنے لاتا ہے۔ جو آج بھی اہم ہے۔ اور اکثر جدید ناولوں کا موضوع ہے۔

کرسچین ولف ایک صوبے کے ایک قصبہ میں ایک سرائے والے کا لڑکا تھا۔ اس کا باپ مر چکا تھا اور بیس برس کے سن تک وہ سرائے کے کام میں اپنی ماں کی مدد کرتا رہا۔ کام بہت کم تھا اس لئے اس کے پاس بہت وقت تھا۔ لڑکیاں اس کی بدتمیزی کی شکایت کرتیں اور لڑکے اس کی قوتِ ایجاد کی تعریف کرتے۔ قدرت نے اس کو بہت ہی بھیانک جسم دیا تھا جس سے ہر مرد اور عورت کو نفرت ہوتی تھی۔ اسے اپنے کو اہم بنانے کا شوق ہوا۔ اس نے ایک لڑکی سے محبت کرنا شروع کی۔ مگر لڑکی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ اور کسی کام کا اہل نہیں تھا اس لئے اس نے ایماندار چور بن جانے کی ٹھانی۔ اس نے قریب کے جنگل سے جو ایک حکمران کا تھا جانور چرانا شروع کئے اور ان سے جو آمد ہوئی وہ اپنی محبوبہ کو دینے لگا۔ اس کی محبوبہ ہنجن کا ایک اور عاشق تھا جو جنگل کے محافظ کا ملازم تھا اس کا نام رابرٹ تھا۔ رابرٹ نے دیکھا کہ اس کا رقیب اس سے زیادہ اہم ہوتا جا رہا ہے تو وہ اپنے رقیب کی سرائے میں جس کا نام سورج تھا زیادہ سے زیادہ جانے لگا۔ اس نے اپنے رقیب کی پوشیدہ حرکات کا سراغ لگایا اور ایک دن اسے جانور چراتے ہوئے پکڑ لیا۔ ولف کو قید ہو گئی اور وہ اپنا سب کچھ دے کر بمشکل چھوٹ سکا۔ رابرٹ اب ہنجن کا پورا مالک ہو گیا۔ ولف کو بڑی تکلیف ہوئی وہ پھر جانور چرانے لگا اور پھر پکڑا گیا۔ اب اس کے پاس کچھ نہیں تھا اس لئے وہ جیل میں بند رہا۔

ایک سال کی سزا کے بعد وہ اپنے وطن واپس آیا۔ سب لوگ اسے

دیکھ کر بھاگے۔ اس نے قریب کے ایک رئیس کے یہاں مزدوری کرلی۔ اس نے سور کا گلہ چُرانے کی نوکری چاہی مگر اس پر اعتبار نہ کیا گیا۔ چنانچہ وہ تیسری دفعہ جانور چُرانے والا بن گیا۔

وہ پھر پکڑا گیا اور جج نے اسے تین برس کی سزا دی اور اس کی پیٹھ پر پھانسی کا نقشہ چسپاں کرادیا۔ یہ وقت بھی ختم ہوا۔ اور جیل سے باہر آیا۔

جیل میں وہ ہر قسم کے مجرموں کے ساتھ رہا۔ یہ لوگ طرح طرح کے جرائم کا ذکر کرتے تھے۔ پہلے وہ ان سے الگ رہا۔ آخر میں ان کی باتوں کا عادی ہوگیا اور اسے بھی بڑے بڑے جرم کرنے کا حوصلہ ہوگیا۔

وہ آزادی کے دن گننے لگا اور جن لوگوں نے اسے ستایا تھا ان سے بدلہ لینے کی سوچنے لگا۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ ہر قسم کے جُرم کرے گا اور جیل سے باہر آکر وہ اپنی قسم کو پورا کرتا رہا۔

وہ آج بھی اس پر قائم ہے۔

والن اسٹین

والن اسٹین کی موت (۱۷۹۹) سے شیلر کے ان ڈراموں کی تثلیث مکمل ہوتی ہے جو والن اسٹین کے تاریخی کردار پر تصنیف کئے گئے ہیں۔ والن شٹین جنگ سی سالہ (۱۶۱۸-۱۶۴۸) میں شاہی سپہ سالار تھا۔ بیرونی طور پر ڈرامہ کا قصہ تاریخی واقعات کے حساب سے چلتا ہے مگر شیلر ان سے بالاتر ہوکر ان انسانی مسائل کو بروئے کار لاتا ہے جو قوت اور عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ سیاسی نقطۂ نظر سے والن اسٹین اپنے حوصلہ مند طریقہ پر زیادہ سے زیادہ قوت حاصل کرتا جاتا ہے۔ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ پوشیدہ طور پر عمل کی تیاری کرتا رہتا ہے۔ وہ واقعیات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ظاہرداری سے پرہیز کرتا ہے۔ اپنی ہوشیاری کے باوجود وہ برباد ہوجاتا ہے۔

تاریخ کا پہیہ اسے روندتا ہوا گذر جاتا ہے۔ وہ سازش کا شکار ہو جاتا ہے اور آخر میں مارا جاتا ہے۔

یہاں ہم جس خود کلامی کو اقتباس کے طور پر پیش کر رہے ہیں وہ والن اسٹین کی تباہی کے اسباب سامنے لاتی ہے۔ وہ خود کو ایسے حالات میں پاتا ہے جو عمل اور فیصلہ چاہتے ہیں۔ اس نے غور و فکر میں بہت وقت صَرف کیا ہے۔ جو عمل اسکے سامنے آتے ہیں اس کے قابو سے باہر ہیں اور اس کے خلاف جاتے ہیں۔ خود کو بچانے کی تمام کوششیں بیکار ہو جاتی ہیں۔ اور تاریخ کا ظالم رُجحان اسے ختم کر دیتا ہے۔ والن اسٹین کے ساتھ جو واقعیت پسند ہے ہم ایک عینیت پسند میکس پکولو کو بھی عین دیکھتے ہیں جو سیاسی معاملوں میں بھی اپنے ضمیر پر نظر رکھتا ہے اور اخلاقی اصولوں پر چلتا ہے۔ چونکہ یہ ناممکنات میں سے ہے لہذا وہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

والن اسٹین: (خود سے بات کرتے ہوئے) کیا یہ ممکن ہے کیا میں جو چاہتا ہوں وہ نہیں کر سکتا۔؟ اب اگر میں پیچھے ہٹنا بھی چاہوں تو نہیں ہٹ سکتا۔ کیا مجھے وہ سب کچھ کر ڈالنا ہے جسے میں پوری طرح سوچ چکا ہوں۔ جس کے خواب دیکھتا رہا ہوں جس کے ذرائع کو محفوظ رکھا ہے۔ کیونکہ اس کے پورے ہونے کا یقین نہ تھا۔ بس اس کے امکان کو سمجھتا رہا ہوں؟ خدا کی قسم میں نے اسے پورے دل سے طے نہیں کیا تھا۔ خیال سے لطف لینے سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ آزادی اور صلاحیت نے میرے خواب کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ کیا بادشاہت کے خوابوں میں گُم ہونا غلط تھا؟ کیا میرا ارادہ میرے دل میں آزاد تھا۔ کیا میں اس راستے کو بھی نہیں دیکھ رہا تھا جو میری واپسی کے لئے کھلا تھا؟ مگر ایک دم سے میں کہاں پہنچ گیا؟ میرے سامنے وہ میدان ہے جس میں کوئی راستہ نہیں ہے۔ وہ دیوار ہے جسے میں نے بنایا تھا وہ دیوار اب میرے سامنے آگئی ہے مجھے واپس آنے سے روکتی ہے (وہ رُک کر سوچنے لگتا ہے) میں مجرم ہوں اور اس جرم کو کسی طرح مٹا نہیں سکتا۔ زندگی کا ابہام مجھے مجرم قرار دے رہا ہے۔ نیک عمل بھی غلط سمجھا جائے گا اور شبہ پیدا کرے گا۔ کیا میں وہ جعل ساز ہوں جو یہ لوگ مجھے سمجھتے ہیں؟

میں ظاہرداری برت سکتا تھا۔ میں راز کو چھپا سکتا تھا اگر میں غضبناک نہ ہو جاتا۔ اپنے ارادے کے نیک ہونے کی بنا پر میں غصہ میں آگیا۔ میرے الفاظ تیز تھے کیونکہ عمل کمزور تھا۔ اور جو کچھ میں نے جذبات میں کہہ دیا وہ اسے لوگ میرے خلاف ایک الزام بنالیں گے جس کا مجھے مقابلہ کرنا ہو گا۔ اس طرح میں نے اپنے لئے جال خود بنایا ہے اور اب اسے تشدد سے توڑا جا سکتا ہے۔ (پھر ساکت کھڑا ہو کر) کیا عجیب وقت تھا جب کہ آزادی کے شوق اور ہمت نے مجھے اس جرأت مندانہ اقدام کا شوق دلایا تھا۔ جو ناامیدی اور ذاتی تحفظ کے خیال سے ایک بے رحم مجبوری بن گیا ہے۔ ضرورت کی صورت بھیانک ہوتی ہے۔ میں قسمت کے پیالے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کانپتا ہوں۔ میرا عمل اس وقت تک میرا تھا جب تک کہ وہ میرے دل میں تھا ایک دفعہ وہ وہاں سے نکل کر زندگی کے میدان میں آگیا تو ان لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا جو اپنے حساب سے اس کو اپنا سکتے ہیں۔ (وہ تیزی سے کمرے میں چلتا ہے اور سوچنے کے لئے ٹھہر جاتا ہے۔) تم کیا کرنے والے ہو؟ کیا تم اس پر غور کر چکے ہو؟ تم اس قوت کو الٹنا چاہتے ہو جو اطمینان سے بیٹھی ہے جس کو زمانے نے پاک بنا دیا ہے۔ اور رسم کی بنیاد پر مستحکم کر دیا ہے۔ جو قوم کے معصوم عقیدہ پر ہزاروں اصولوں سے مستحکم ہے۔ یہ قوت سے قوت کی جنگ نہ ہو گی۔ ایسی جنگ کا مجھے خوف نہیں۔ میں کسی ایسے دشمن سے لڑ سکتا ہوں جو ہمت رکھتا ہو۔ اور میری ہمت کو جگا دے۔ میں اس پوشیدہ دشمن سے ڈرتا ہوں جو لوگوں کے دلوں میں میری مخالفت پیدا کرتا ہے اور بزدلی کے خوف سے ڈرتا ہے جو سامنے آکر مقابلہ کرے اس سے میں نہیں ڈرتا۔ یہ کل کا اتفاقی معاملہ ہے جو پھر پھر کر سامنے آتا ہے اور جو آج بھی اور کل بھی پریشانی کا باعث ہو گا۔ کیونکہ آدمی بے اصولی کی تخلیق ہے اور عادت اس کی دایہ ہے۔ جو لوگ اس قدیم روایت کو توڑیں گے ان کے لئے پریشانی ہے۔ ماضی روحانی اثر رکھتا ہے۔ بوڑھی چیز اس کے لئے پاک ہے۔ اگر اس کا فیصلہ ہو اور حق تمہاری طرف ہو تو عوام اسی کا ساتھ دیں گے۔

نیدر لینڈ کی بغاوت

شیلر کی تاریخی تصنیف " نیدر لینڈ کی بغاوت" میں آزادی کی اس جدوجہد کا بیان ہے جو سولھویں صدی میں ہسپانیہ کے خلاف عمل میں آئی تھی۔ درج ذیل اقتباس اگمانٹ اور آورنج سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دونوں امیر رہنما ایک دوسرے کے اتنے ہی برعکس تھے جیساکہ گوئٹے نے اپنے ڈرامہ اگمنٹ" میں انھیں دکھایا۔ اسی قسم کا مگر زیادہ وسیع مطالعہ شیلر کی تاریخ جنگ سی سالہ (۱۷۹۲ - ۱۷۹۱) ہے۔ یہ تصنیف مورخ کے اس نظرئے کو بروئے کار لاتی ہے جسے بعد میں شیلر نے اپنے والن اسٹین والے تین ڈراموں میں شاعرانہ طرزِ ادا کی وجہ سے عام مقبولیت بخشی ہے۔

جلد اول سے: اورنج اور اگمنٹ

اگمنٹ اصولوں سے زیادہ ضمیر کا مالک تھا۔ اس کے دماغ نے اپنا نظامِ قانون خود مرتب نہیں کیا تھا بلکہ یہ نظام اس کے اندر ٹھونس دیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عمل کا نام ہی اس کو عمل سے روکتا۔ اس کی دُنیا میں آدمی یا نیک تھے یا بد۔ اس کے فلسفہ میں نیکی اور بدی میں کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لئے کوئی ایک نیکی اسے کسی آدمی کی طرفدار بنا دیتی تھی۔ اگمنٹ کے اندر وہ سب خوبیاں تھیں جو ایک ہیرو میں ہوتی ہیں۔ وہ اورنج سے بڑا سپاہی تھا۔ سیاست میں اس سے کم تر تھا۔ اورنج زندگی کو اس طرح دیکھتا تھا جس طرح وہ نظر آتی تھی۔ اگمنٹ دنیا کو اپنے تخیل کے آئینہ میں دیکھتا تھا۔ وہ لوگ جن کو قسمت کسی محنت کے بغیر نواز دیتی ہے سبب اور مسبب کا تعلق بھول جاتے ہیں اور قدرتی امور میں اس معجزہ پر عقیدہ رکھتے ہیں جو آخر میں ان کو برباد کر دیتا ہے۔ اگمنٹ ایسا ہی آدمی تھا۔ ان خوبیوں کے نشے میں جن کو انسانوں کی شکر گذاری نے بڑھا دیا تھا' وہ اپنی خود فریبی میں محو رہا۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا تھا کیونکہ اسے اپنی مقبولیت پر یقین تھا۔ وہ انصاف پر یقین کرتا تھا

کیونکہ وہ خوش تھا۔ ہسپانویوں کی مکاری کا تجربہ بھی اس کے اطمینان کو ختم نہ کر سکا اور پھانسی پر بھی اسے اُمید باقی رہی۔ اپنے خاندان کے نقصان کے خوف نے اس کے حب وطن کو پست کاموں میں لگا یا۔ چونکہ اسے اپنے سرمایہ اور زندگی کے تلف ہو جانے کا خوف تھا اس لئے وہ جمہوریت کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ دلیم آف اورنج نے بادشاہ کی مخالفت کی کیونکہ بے راہ روی نے اس کے زعم کو اُبھار دیا تھا۔ اگمنٹ خود پسند تھا۔ اس لئے اس نے بادشاہ کے رحم پر اعتماد کیا اورنج عالمی شہری تھا اور اگمنٹ ہالینڈ کی شہریت سے کبھی آگے نہیں بڑھا۔

انسان کی جمالیاتی تعلیم کی بابت

"انسان کی جمالیاتی تعلیم" شیلر کے ایک مضمون کا موضوع ہے جو ۱۷۹۵ء میں خطوط کی صورت میں لکھا گیا۔ یہ فلسفیانہ تصنیف ہے جو روشن خیالی کی روح کے مطابق ہے اور انسان کی تعلیم کے ارتقاء سے متعلق ہے۔ شیلر کے لئے نصب العین ایک ایسا اخلاقی نظام ہے جو انسان کے فرائض اور رجحانات کو ہم آہنگ کرتا ہے۔ اس کا حاصل کرنا ایک فن ہے۔ کیونکہ یہ مادہ اور ہیئت حسیات اور روح کو ایک دوسرے میں سموتا ہے۔ زیر نظر اقتباس بنیادی بحث اور مخصوص خیالات کو سامنے لاتا ہے۔ یہ خاص طور پر یوں دلچسپ ہے کہ یہ سیاسی مسائل کے واقعیاتی تعلق کو عینی فن کے جمالیاتی تعلق پر ترجیح دیتا ہے۔

دوسرا خط

آپ نے مجھے جو آزادی دی ہے اس کا اس سے بہتر استعمال میں نہیں سوچ سکتا۔ کہ فنون لطیفہ پر اظہار خیال کر دوں۔ کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم جمالیات کے قوانین کی ایک کتاب مرتب کر دیں جب کہ دنیا کے حالات ہماری فوری توجہ کا مرکز بن گئے ہیں۔ اور فلسفیانہ تفکر کے لئے اخلاقیات سے زیادہ دلچسپ ہو گئے ہیں۔ کیا سیاسی آزادی کی تعمیر کے ساتھ فن کا مثالی کارنامہ وجود میں نہیں لایا جا سکتا؟

میں کسی اور ملک اور کسی اور زمانے میں رہنے کا خواہشمند نہیں ہوں ۔ ہر حکومت اور ہر دَور کا رہنے والا برابر ہوتا ہے ۔ اور اگر یہ ممکن نہیں ہے کہ انسان خود کو اپنے ماحول سے الگ کر سکے تو اسے اپنے مخصوص کام کا انتخاب کرنے اور قوم کے مذاق کی تعمیر کرنے میں کیوں نہ مصروف ہو جانا چاہیئے ۔

یہ انتخاب فن کے لئے مفید نہیں معلوم ہوتا ۔ کم از کم اس فن کے لئے جس پر میں اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں ۔ حالات نے اس دَور کو وہ رجحان دے دیا ہے جو اس کو عینیت کے فن سے دُور کرتا ہے ۔ اس فن کو حقائق سے دُور ہو کر ضرورت سے بالاتر ہو جانا ہے کیونکہ فن آزادی کی تخلیق ہے اور وہ مادّی ضرورت سے نہیں بلکہ روحانی آزادی سے تربیت پاتا ہے ۔ اس وقت ضرورت غالب ہے اور انسانی روح کو دبا رہی ہے ۔ مفاد اس دَور کا وہ بت ہے جس کے لئے تمام قوتیں کام کر رہی ہیں ۔ اس حساب سے جن کی روحانی صفت کوئی وزن نہیں رکھتی اور ترجیح نہ ملنے کی وجہ سے اس صدی کے بازار سے غائب ہو گئی ہے فلسفیانہ تحقیق کا رجحان بھی تخئیل کو کم سے کمتر کرتا جارہا ہے ۔ فن کی حدود تنگ ہو رہی ہیں اور سائنس کی حدود میں وسعت پیدا ہو رہی ہے ۔

فلسفی اور عام آدمی کی توجہ سیاسی حالات پر ہے ۔ اور انہیں میں انسان کی قسمت کا فیصلہ ہے کیا اس سلسلے میں حصّہ نہ لینا انسانی ضرورت سے بے توجہی برتنا ہے جس طرح یہ قانونی معاملہ اپنے مواد اور نتائج کے حساب سے انسان سے تعلق رکھتا ہے اسی طرح اس کا ہر مفکر کے لئے دلچسپ ہونا لازمی ہے ۔ پہلے جو مشکل قوت سے حل ہوتے تھے وہ اب عقل کے فیصلہ سے حل کئے جاتے ہیں ۔ ہر وہ شخص جو خود کو معاملات کے درمیان رکھ کر اپنی ہستی کو مثالی ہستی بنا لے، وہ خود کو عقل کے دربار کا فرد بنا سکتا ہے تاکہ وہ فرد کی حیثیت اور شہری کی حیثیت سے اس کامیابی میں شریک ہو ۔ اس طرح اس کے ذاتی معاملات ہی قانونی فیصلہ کے تحت نہ آئیں گے بلکہ وہ ان قوانین کے مطابق بھی گفتگو کر سکے گا جو وہ خود رائج کرنا چاہتا ہے ۔

میرے لئے یہ بہت ہی دلچسپ ہو گا کہ اس موضوع کا جائزہ ایسے شخص کے ساتھ لوں اور ایسے شخص کے فیصلہ کو تسلیم کروں جو جذبہ کے ساتھ انسان کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ نقطۂ نظر میں اتنے فرق کے باوجود ہم لوگ خیالات کے میدان میں کسی جانبداری کے بغیر ایک ہی نتائج پر پہنچیں۔ میں اس آزادی کے بجائے حسن کو آزادی پر ترجیح دیتا ہوں۔ یہ معاملہ ہمارے دور کے مذاق سے دور ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ آزادی کا رستہ حسن کے ذریعہ سے حاصل ہونا چاہیئے کیونکہ حسن کے ذریعہ ہی سے آدمی آزادی کی طرف جا سکتا ہے مگر یہ ثبوت اس وقت تک مہیا نہیں کیا جا سکتا جب تک میں آپ کو وہ اصول نہ یاد دلاؤں جن کے ذریعہ عقل اپنے کو سیاسی قوانین کی طرف لے جاتی ہے۔

ایک خط

۱۷۹۳ کے ایک خط میں شیلر کانٹ کی طرح انسان کا فرض یہ بتاتا ہے کہ وہ روشن خیالی حاصل کرے۔ وہ کانٹ سے مختلف ایک راہ یہ اختیار کرتا ہے کہ وہ روشن خیالی کی کمی کی وجوہات کاہلی اور بزدلی قرار نہیں دیتا بلکہ انسان کی روزمرہ زندگی کی ضروریات کو بھی اس کا سبب قرار دیتا ہے اس لئے شیلر کا مطالبہ یہ ہے کہ روحانی اور اخلاقی تعلیم کے آغاز سے پہلے انسان کی بنیادی ضروریات پوری ہونا چاہئیں۔ یہ وہ مطالبہ ہے جو جرمن ادب میں اکثر پیش ہوا اور آج کل برٹولڈ برست نے اپنے ڈرامہ "تھری پنی اوپرا" میں یوں ادا کیا ہے
"پہلے ہمیں روٹی لینے دو پھر اخلاق مل رہے گا۔"

قوم کو روشن خیال بنانے کا — کام کیسے شروع کرنا چاہیئے

انسانوں کی زیادہ تعداد مادی ضروریات پوری کرنے میں اتنی خستہ ہو جاتی ہے کہ اسے غلط خیالات اور بیجا طرفداریوں کے خلاف جنگ کرنے کے کام میں نہیں لایا جا سکتا۔ انسان کی تمام قوت ضروریات کو پورا کرنے کی پریشانی میں ختم ہو جاتی ہے۔ اور اگر وہ ان کو پورا کر لیتا ہے تو اسے آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ نئے ذہنی کاموں کی نہیں یہ سمجھ کر کہ وہ غور و فکر نہیں کر سکتا وہ اپنے خیالات دوسروں سے لیتا ہے اور دوسروں کی عقل

پر بھروسہ کر کے وہ اپنا جائزہ لینے سے بچ جاتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اعلیٰ ضرورتیں اس کے دل و دماغ میں محسوس ہی ہوں۔ اس وقت وہ ان ٹکی بندھی باتوں کو قبول کر لیتا ہے جو حکومت اور مذہب کے رہنما اس کے لئے تیار لئے بیٹھے رہتے ہیں اور جن کے ذریعے سے وہ ہمیشہ سے اپنے مقلدوں کے دل کی تسکین کرتے رہے ہیں۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سب سے زیادہ پریشان لوگ ہی سب سے زیادہ جاہل ہوتے ہیں۔ اس لئے قوم کو روشن خیال بنانے کے لئے اس کے مادّی حالات کو بہتر بنانا ضروری ہے۔ روح کو پہلے ضرورت کی زنجیر سے آزاد کیجئے تب وہ عقل کی آزادی حاصل کر سکتی ہے۔ اسی وجہ سے شہریوں کی خوشحالی حکومت کا پہلا فرض ہونا چاہیئے اگر یہ خوشحالی دماغ کو پختگی پر لانے کا ذریعہ نہ ہوتی تو اس کی طرف توجہ کی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ آدمی کھا پی کر معمولی ہی رہتا ہے لیکن اس کی اعلیٰ فطرت کو جگانے کے لئے اس کا کھانا پینا ٹھیک ہونا چاہیئے۔

جارج فورسٹر

انقلابِ فرانس پر خطوط

جارج فورسٹر (۱۷۹۴ - ۱۷۵۴) یونیورسٹی کا پروفیسر اور لائبریرین تھا۔ اس نے مطالعۂ قدرت کے لئے سفر کئے اور سفرناموں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ فن کی تاریخ پر بھی اس کی کتابیں اہم ہیں۔ انقلابِ فرانس کا ہمدرد ہونے کی وجہ سے وہ مینز کی جمہوری پارٹی کے نمائندہ کی حیثیت سے ۱۷۹۳ میں پیرس گیا تاکہ فرانس سے اتحاد قائم ہو سکے۔ اس کی پاداش میں وہ جرمنی سے جلاوطن کر دیا گیا اور پیرس میں پریشانی اور تنہائی کی وجہ سے مر گیا۔

اس کے ۱۷۸۹ کے خطوط جو انقلاب کے اوائل سے تعلق رکھتے ہیں اور ۱۷۹۰ کے خطوط اب بھی جوش و جذبہ سے معمور نظر آتے ہیں۔ ۱۷۹۳ میں جب فورسٹر پیرس میں تھا اور حالات کا قریب سے مطالعہ کر رہا تھا وہ انقلاب کے منفی نتائج بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ آمریت کا آنا ناگزیر ہے۔ مگر وہ انقلاب کی تاریخی اہمیت میں عقیدہ رکھتا تھا حالانکہ اس سے بھی عوام کے لئے فوراً خوشحالی ممکن نہیں ہوتی۔

مینز

۳۰- جولائی ۱۷۸۹ء

انقلاب فرانس کی بابت تمہارا کیا خیال ہے۔ انگلستان نے اسے جس امن وسکون سے عمل میں آنے دیا ہے اس سے سادہ لوحی اور سیاست سے عدم دلچسپی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ ایک بادشاہ کے مقابلے میں دو کروڑ عوام کی جمہوریت انگلستان کے لئے بڑی تکلیف دہ ہوگی مگر خوبی یہ ہے کہ پہلے انقلاب کا فلسفہ دماغوں میں پختہ ہو اور پھر ایک حکومت میں رونما ہو۔ اس قسم کی کوئی مثال موجود نہیں کہ انقلاب لانے میں اتنا کم خون بہا ہو اور اتنی کم بربادی پھیلی ہو۔ انسان کو روشن خیال بنانے اور انہیں حقیقی مفاد اور حقوق سے آگاہ کرنے کا یہی طریقہ سب سے زیادہ یقینی ہے اس

کے بعد سارے کام خود بخود ہو جاتے ہیں۔

مینز

۱۲ جولائی ۱۷۹۰ء

فرانس میں تیزی کے ساتھ سفر کرنے سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ انقلاب کے خلاف کوئی رد عمل نہ ہو گا۔ سب مطمئن ہیں۔ ہر بات سے نئے ارادے کی کامیابی ظاہر ہوتی ہے۔ عوام کا جذبہ خاص طور سے "شان ڈی ما" میں جہاں قومی رسم کے منانے کی تیاری ہو رہی ہے' دل بڑھاتا ہے۔ کیونکہ یہ جذبہ تمام طبقوں میں یکساں نظر آتا ہے سب کی بھلائی کے لئے مساوی کام ہو رہا ہے اور کوئی بھی ذاتی مفاد کا خیال نہیں کرتا۔ لوگوں نے کہا ہم نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ ہمارا سرمایہ کم ہو گیا مگر ہم جانتے ہیں کہ ہمارے بچے ہمارا شکریہ ادا کریں گے کیونکہ یہ ان کے لئے مفید ہو گا۔ اس خود فراموشی کی وجہ سے جس میں اونچے اخلاق شامل ہیں' ایک شاندار مستقبل کی امید ہو سکتی ہے۔

پیرس   فرانس سے

۵۔ اپریل ۱۷۹۳ء   نیو شیٹل میں اپنی بیوی کو

میں اپنی رائے پر قائم ہوں کہ انقلاب کو انسانی خوش حالی اور بدحالی کے نقطۂ نظر سے نہ جانچنا چاہیئے، بلکہ اسے انسان میں عظیم تبدیلیاں لانے کا ذریعہ سمجھنا چاہیئے۔ مجھے فرانسیسی لوگوں کے کردار پر اتنا ہی کم اعتبار ہے جتنا کہ ان کے دشمنوں کو۔ مگر ان کے نقائص کے ساتھ ساتھ مجھے ان کی خوبیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اور میں کسی قوم کو مثالی قوم نہیں مانتا۔ تمام انسان بنی نوع انسان کا حصہ ہیں، اور فرانسیسی لوگوں کو اس وقت شاید سزا دی گئی ہے کہ وہ ان اچھائیوں کے لئے شہید پیش کریں۔ جو مستقبل میں انقلاب سے حاصل ہوں گی۔ اسی طرح جیسے لوتھر کے زمانے میں جرمنوں کو شہید ہونا پڑا تھا تاکہ عوام کی بھلائی کے لئے وہ اصلاح کے قائل ہو جائیں اور اپنے خون سے اس کی حفاظت کریں۔

پیرس
۱۳- اپریل ۱۷۹۳ء

یہاں کی سازش کا راز جتنا زیادہ کھلتا جاتا ہے اتنا ہی زیادہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ نیکی سے نا اُمید نہ ہونے اور آسمان سے انصاف کی توقع رکھنے کے لئے بڑے ٹھنڈے دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ میں نے ادھر بہت تکلیف اٹھائی مگر یہ خیال میرے پاس بھی نہ پھٹکا کہ میں نے اپنی آخری قوت ایک حماقت پر صرف کی ہے اور ایمانداری کے جوش میں ایسی چیز کے لئے کام کیا جس کو کوئی شخص اچھا نہیں کہتا اور جو حد سے بڑھے ہوئے جنون کے لئے ایک لبادہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ آج کل بے غرضی اور آزادی سے محبت کا اظہار ان لوگوں کی جانب سے جو ایک قوم کی قسمت سے کھیل رہے ہیں محض بچوں کا کھلونا، محض ایک کھوکھلا نعرہ محض ریاکارانہ باتیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جہاں امید خالص ایثار کی امید تھی وہاں خودپسندی رائج ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دھوکا دینے والوں اور دھوکا کھانے والوں کے درمیان کوئی تیسری پارٹی نہیں ہے جس پر کوئی اعتبار کرے یا جس سے کوئی تعلق پیدا کرے۔ اس خیال کو انگیز کرنے کے بعد جو دماغ کو قوت سے متاثر کر رہا ہے اور شعور پر اثر انداز ہو رہا ہے 'انسانیت اور دانائی پر عقیدہ رکھنا یقیناً بڑی ہمت کا کام ہے

پیرس
۱۱- مئی ۱۷۹۳

اب میں انسان کی تقدیم کے عظیم دائرے میں اس انقلاب کی اہمیت سمجھتا ہوں۔ اسے نہ صرف واقع ہونا تھا بلکہ یہ ایک نیا ارتقاء سامنے لائے گا اور خیالات کو ایک نئی راہ ملے گی۔ فرانس کے لوگ اس عمل میں مصروف ہیں جو عام راہ سے الگ ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ مطمئن ہیں؟ یہ سوال وہی لوگ پوچھ سکتے ہیں جنہوں نے کبھی انسانی معاملات پر غور نہیں کیا اور کوئی تجربہ نہیں

حاصل کیا۔ قدرت اور قسمت کو اس خوشحالی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ انسان کا عمل اور اس کی تکلیف اسی کا معاملہ ہے اور دونوں میں کبھی وہ خوشی محسوس کرتا ہے اور کبھی درد۔ ہمیں اپنی زندگی کا مقصد اثرات اور مخالف اثرات اور مختلف طریقوں پر جذبات اور اثرات کا ارتقار معلوم ہوتا ہے جس کی بابت ہم سے پوچھا تک نہیں جاتا کہ ہم اسے چاہتے ہیں یا نہیں۔ ہم اخلاق کو اپنے عمل اور تکالیف میں شامل کر لیتے ہیں۔ یہ اخلاق ہمیشہ ایک مخصوص شخص کی چیز ہوتا ہے جو اس پر رد عمل کرتا ہے۔ اس لئے میں ان لوگوں کے خوابوں پر ہنستا ہوں جو تصور کرتے ہیں کہ عینی حکومت ہو سکتی ہے جہاں ہر شخص نیک، عقل مند اور خوش ہو گا اور جہاں کا دستور آزاد ہو گا۔ یہ صحیح ہے کہ آزادی ایک شخص کی قوتوں کے ارتقار میں بہت مدد دیتی ہے مگر یہ بھی کچھ معاملوں میں یکطرفہ ہو جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ عمل اور تکلیف ایک بڑے دستور کے مقابلے میں ایک اچھے دستور کے ماتحت زیادہ اخلاقی مقصد رکھتے ہیں مگر یہ بات یقینی ہے کہ ایک نئے دستور کے پیدا ہونے کی وجہ پرانے دستور کی وہ فرسودگی ہوتی ہے جس کی وجہ سے قوت کمزور پڑ جاتی ہے اور اسے مہمیز کی ضرورت پڑتی ہے تا کہ حرکت پھر پیدا ہو جائے۔ مجھے فرانس میں عرصے تک امن اور خوشی کی امید نہیں معلوم ہوتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ عرصے تک ایک بات پر اڑے رہے ہیں اب انھیں یہ سیکھنا پڑے گا کہ حالات کا غیر مستقل ہونا بالکل ممکن ہے اور اس لئے بیرونی معاملات سے آزاد ہو کر رہیں اور اپنی قوت پر بھروسہ کرتے رہیں۔ اس حالت کو ختم کرنے میں یورپ کو بڑا عرصہ لگے گا۔

پیرس

۴۔ جون ۱۷۹۳

یہاں امن ہے۔ مجھے خیال ہے کہ ایک جمہوریت میں جذبات کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ تعجب نہ ہو گا۔ اگر کوئی شخص ایک دم سے آگے آ جائے مگر جلد ہی وہ غائب

بھی ہو جائے گا - یہ ناممکن نہیں ہے حالانکہ قرین قیاس نہیں نظر آتا کہ بیرونی قوتیں فرانس میں پچھلے سال سے زیادہ دخل انداز ہو جائیں مگر پھر بھی جمہوریت غائب نہ ہوگی - برخلاف اس کے مجھے امید ہے کہ وہ جڑ پکڑ لے گی اور استقلال حاصل کر لے گی - اس کی بقا نہ فوجوں کی فتح پر اور نہ قومی کنونشن پر مبنی ہے -

پیرس

۲۳ - جون ۱۷۹۳

یہ ممکن نہیں کہ یہاں تین مہینے رہ لینے کے بعد یہاں کے واقعیات کے بابت جوش و خروش سے کچھ کہا جا سکے - ہر جگہ قوت تقریر کے پس پشت خود غرضی نظر آتی ہے - صرف کچھ لوگ ہیں جو ایمانداری سے بھلائی چاہتے ہیں اور اس وجہ سے قوت حاصل کرنے والوں کے لئے نفرت کی چیز بن گئے ہیں - قیدیوں میں بہت سے ایماندار لوگ بھی ہیں - انقلاب کے نام پر سب سے بڑا دھبہ پھانسی دینے والی کچہری ہے - میں اس کی بابت سوچنا تک نہیں چاہتا - جب یہ مناظر گذر جائیں گے تو لوگ بہتر نتائج کی بنا پر انہیں بھول جائیں گے مگر اس وقت ان کا تاثر دہشت ناک ہے اور ہمعصروں کے لئے یہ منظر تکلیف دہ ہے - ہم ان چیزوں پر اس کے زمانے میں رائے دے سکیں گے -

پیرس

۲۶ - جون ۱۷۹۳

ہم بہم ہو رہے ہیں اور ہم ہو جائیں گے جبکہ اور لوگ سیاسی آزادی سے ہوئے ہیں یعنی اخلاقی طور پر آزاد لوگ - انسانوں کو آزادی دینا غلط ہوگا بشرطیکہ وہ بدستور وحشی رہیں اور ان کی صلاحیتیں زیادہ آسانی سے اخلاقی کمال تک نہ پہنچ سکیں - یہی وجہ ہے کہ سیاسی آزادی ضروری معلوم ہوتی ہے - یہ بات ناقابل تردید ہے کہ آزاد ملکوں ہی میں نیکی آفاقی حیثیت حاصل کرتی ہے مگر جہاں تک ہماری انفرادیت کا تعلق ہے جن حالات میں ہم ہیں انہوں نے ہمیں ایسا مخصوص آدمی

بنا دیا ہے جو کسی آزاد دستور کے بغیر مقصد تک پہنچ جاتا ہے۔ ہم خود کو زنجیروں اور تہہ خانوں میں آزاد محسوس کرتے ہیں لہٰذا ہم کو سیاسی آزادی کے نہ ہونے کی شکایت نہ کرنا چاہیئے۔ جس وجہ سے یہ ہمیں مناسب معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ہمارے ہم جنسوں اور شہریوں کی بہبودی ہے۔ ہمیں یہ یقین ہے کہ سیاسی آزادی ان کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور جب وہ اسے حاصل نہیں کر سکتے۔ جب بدمعاش ان سے آزادی چھین لیتے ہیں۔ جب وہ خود اس کے حاصل کرنے کی قوت نہیں رکھتے تو ہمیں تکلیف ہوتی ہے مگر یہ افسوس فضول ہے اور ہمارا راست عمل بھی کچھ نہ حاصل کر سکتا۔ راست عمل یعنی صحیح خیالات پھیلانا۔ مفید علم پیدا کرنا، اپنے خیالات کو فروغ دینا، اپنے جذبات کو ابھارنا ہم جرمنی کے لئے یہی اچھا راستہ ہے۔

ژان پال

جوہان پال فریڈرش اشٹر (۱۸۲۵-۱۷۶۵) کو اس کے افسانوں نے منفرد مصنف بنا دیا ہے۔ حالانکہ اسے کسی خاص ادبی رجحان سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا مگر وہ اپنے دور کے تمام رجحانات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی خاص صفت یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع اور طرز میں کمال کی تخییل کا ثبوت دیتا ہے۔ اس کا رجحان مزاجیہ، عجیب اور بالکل سادہ چیزوں کی طرف ہے۔ اور ان سب چیزوں کو وہ بڑی ہمدردی اور مزاح سے پیش کرتا ہے مگر ژان پال زندگی کی معمولی چیزوں ہی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ وہ اپنے طویل ناولوں میں اہم مسائل جیسے کہ حقیقت کا عینیت سے دور ہونا، انسان کی سچی تعلیم یا مذہب کے عمل کو پیش کرتا ہے۔

مرحوم عیسٰے کی تقریر

ایوانِ عالم سے اس موضوع پر بحث کی گئی تھی کہ خدا کا وجود نہیں ہے۔ "مرحوم عیسٰے کی تقریر" (۱۷۹۶) یہ دکھاتی ہے کہ مصنف موت اور خدا کے وجود کی بابت اپنی غیر یقینی کی وجہ سے کتنا پریشان تھا۔ یہ فرضی تقریر وہ اپنی نا اُمیدی اور بے یقینی ظاہر کرنے کے لئے نہیں بلکہ انسان کے مذہبی عقائد کو سہارا دینے کے لئے کرتا ہے اور یہ دکھاتا ہے کہ عقیدہ کو ترک کرنے سے کیا دہشت ناک چیزیں حاصل ہوں گی۔ اس خواب میں ژان پال اپنے تخییل کو آزاد چھوڑ دیتا ہے اور قیامت کا سماں باندھتا ہے۔ عیسٰے جو بذات خود خدا کی سب سے بڑی نشانی ہیں۔ خدا نہیں ہے اس مقام پر جہاں دہشت حد کو پہنچ جاتی ہے خواب دیکھنے والا بیدار ہوتا ہے۔ خوشی کا نغمہ اس کی زبان ہے۔ خدا پر اور پُر امن دُنیا پر یقین دل میں ہے۔ ہر چند کہ اس کے شکوک ختم نہیں ہوئے کیونکہ وہ ممکنہ آخری یقین پر نہیں پہنچ سکا ہے۔ تاہم ایک بات صاف ہو جاتی ہے کہ جب انسان اپنی تنہائی میں حفاظت کی تلاش کرتا ہے تو خداوند تعالیٰ اس کے دماغ اور جذبات میں موجود ہوتا ہے

دیباچہ

اس قصہ کا مقصد اس کی جسارت میں ہے ۔ خدا کے وجود کا انکار اسی بے حسی سے کیا جاتا ہے جس سے اس کا اقرار کیا جاتا ہے ۔ ہم اپنے خیالات کے نظام میں صرف الفاظ جمع کرتے ہیں جیسے لالچی آدمی دولت جمع کرتے ہیں بعد میں ہم الفاظ کو جذبات میں تبدیل کرتے ہیں اور سکون کو تفریح ہیں۔ ایک آدمی بیس برس تک روح کے دوام میں عقیدہ رکھتا ہے اور صرف اکیسویں برس کے کسی اہم لمحہ میں اسے اپنے عقیدہ کے بیش بہا مادّے کا احساس ہوتا ہے ۔ وہ اس عقیدے سے ایسی حرارت نکلتی ہوئی محسوس کرتا ہے جیسی کافور کے شعلے سے نکلتی ہے۔

اسی طرح مَیں اس زہریلے دھوئیں سے ڈر گیا تھا جو اس شخص کے دل کو گھونٹ دینے کے لئے نکلتا ہے جو پہلی دفعہ جمالیاتی نظریات کے ایوان میں داخل ہوتا ہے۔ مجھے خدا کے انکار کی بہ نسبت دوام کے انکار سے کم تکلیف ہوگی۔ پہلے معاملہ میں مَیں ایسی دُنیا کھو دیتا ہوں جو دھند لکے میں ہے ۔ دوسرے معاملہ میں مَیں موجود دنیا کو کھو دیتا ہوں یعنی سورج سے انکار کر دیتا ہوں ۔ تمام روحانی دُنیا انکار کے ہاتھ سے پارہ پارہ ہو جاتی ہے اور خود پرستی کے سیمابی نقطوں میں بٹ جاتی ہے جو چمکتے ہیں، چلتے ہیں، گھومتے ہیں، جُڑ جاتے ہیں، اور الگ ہو جاتے ہیں اور ان میں اتحاد اور دوام نہیں ہوتا۔ کائنات میں منکر سے زیادہ اکیلا کوئی نہیں ہوتا۔ وہ ایسے یتیم کی طرح روتا ہے جس نے اپنے باپ کو کھو دیا ہو۔ اسے قدرت کسی اعتبار سے اندھی نہیں معلوم ہوتی بلکہ ایک مرقد میں رکھی نظر آتی ہے ۔ وہ روتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ مردہ سے الگ ہو جاتا ہے۔ پوری کائنات اسے مصری ابوالہول کی طرح نظر آتی ہے جو ریت میں آدھا دفن ہے اور کائنات ایک لوہے کا چہرہ معلوم ہوتی ہے جس کے پیچھے بے شکل دوام چُھپا ہے ۔

میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ میرا قصہ یونیورسٹی کے کچھ استادوں کے دلوں میں خوف پیدا کرے کیونکہ یہ لوگ محض وہ مزدور بن جاتے ہیں جو تنقیدی فلسفہ کی بنیادیں اور نالیاں کھودتا ہے ۔ یعنی یہ لوگ خدا کے وجود پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے ہیں جیسے کہ وہ کسی سمندر کے سانپ یا عنقا کی بابت سوچ رہے ہوں ۔

دوسرے لوگوں کے فائدہ کے لئے جو یونیورسٹی کے استادوں کی طرح گمراہ نہیں ہوئے ہیں، میں یہ کہوں گا کہ یہ ممکن ہے کہ دوام میں عقیدہ کے ساتھ خدا سے انکار کو ملا لیا جائے کیونکہ وہی ضرورت جو میری خودی کے چمکتے ہوئے قطرہ کو سورج کی روشنی اور پھول کے تھالے میں ڈال دے وہ دوسری دُنیا میں بھی یہی کر سکتی ہے۔ بچپن میں جب لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ آدھی رات کے وقت جب ہماری نیند ہماری روح کے قریب پہنچ جاتی ہے اور ہمارے خوابوں کو بھی تاریک کر دیتی ہے اس وقت مردے اپنی نیند سے اُٹھتے ہیں اور گرجوں میں زندہ لوگوں کی نقل کرتے ہیں تو ہمیں موت کے خیال سے ڈر لگتا ہے۔ رات کی تنہائی میں مُردوں کی وجہ سے ہم اپنی آنکھیں خاموش گرجے کی لمبی کھڑکیوں سے ہٹا لیتے ہیں اور ان کی چمک پر نظر ڈالنے سے ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ چاند سے تو نہیں آ رہی ہے۔

بچپن اور اس کے خوف اس کی خوشیوں سے زیادہ جلد غائب ہو جاتے ہیں مگر خوابوں میں پھر چمکتے ہیں اور روح کی تاریکی آگ کی چنگاریوں کی طرح لہراتے ہیں۔ ان اُڑتے ہوئے نقطوں کو نہ مارو۔ اپنے دہشت ناک خوابوں کو ایسا عکس سمجھو جو حقیقت کو زیادہ اہم بنا دیتے ہیں اور خوابوں کی جگہ اور کون سی چیز آ سکتی ہے جو ہمیں آبشار کی سوزش سے بچپن کی اونچائی پر لے جا سکتی ہے جہاں اپنے چھوٹے پلیٹوؤں پر جو آسمان کا آئینہ ہیں زندگی کا دریا اپنی بلندیوں سے الگ ہو رہا ہے۔

میں ایک دفعہ موسم گرما میں ایک پہاڑی پر دھوپ میں لیٹے لیٹے سو گیا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک قبرستان میں ہوں۔ گرجے کے گھنٹے نے گیارہ بجا کر مجھے جگا دیا ہے میں نے خالی آسمان پر سورج دیکھنے کی کوشش کی اور یہ یقین کر لیا کہ چاند نے اسے گہن میں چھپا دیا ہے۔ تمام قبروں کے منہ کھل گئے تھے اور ایک نظر نہ آنے والا ہاتھ قبروں کے تہہ خانے کا دروازہ کھولتا اور بند کر دیتا تھا۔ سائے جو کسی چیز پر نہ تھے دیواروں پر گھوم رہے تھے اور دوسرے سائے ہوا میں سیدھے چل رہے تھے۔ تابوتوں میں بچوں کے سوا کوئی نہیں سو رہا تھا۔ آسمان پر ایک دھندلا کہرا تھا جو ایک بڑے سائے

کے ذریعہ سے حال کی طرح زیادہ قریب، زیادہ گہرا اور زیادہ گرم ہوتا جا رہا تھا۔ میرے اوپر ایک برف کا دریا گرتا ہوا دکھائی دیا اور میرے نیچے زمین زلزلہ میں تھی گرجا زور سے ہلا۔ دولڑتی ہوئی آوازیں لگاتار اس کے اندر لڑتی ہوئی اور بکھرتی ہوئی سنائی دیں۔ کچھ کچھ دیر بعد گرجے کی کھڑکیوں پر ایک روشنی نظر آتی اور اس میں لوہا اور سیسا پگھلتے ہوئے نظر آتے۔ آسمان کے جال اور زمین کے زلزلہ نے مجھے عبادت گاہ میں پہنچایا جہاں دوست روشن آنکھوں سے سوچتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میں عجیب سالوں کے درمیان جا رہا تھا جس پر تمام صدیوں کے نشان تھے۔ سب سائے ذبیحہ کے چاروں طرف کھڑے تھے اور وہ سب دل کے بجائے سینوں پر ہاتھ مار رہے تھے صرف ایک مردہ جو سب سے پہلے گرجا میں دفن کیا گیا تھا، اپنے تکیہ پر اب بھی لیٹا تھا اور اس کے مسکراتے ہوئے چہرہ پر خوشی کا ایک خواب تھا۔ مگر جب ایک زندہ آدمی داخل ہوا تو وہ جاگا اور مسکراہٹ ختم کر دی۔ اس نے مشکل سے اپنی آنکھیں کھولیں مگر اس کے ڈھیلے نہیں تھے اور اس کے ہلکے ہوئے سینے پر دل کی جگہ ایک زخم تھا اس نے اپنے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی مگر اس کے بازو الگ ہو گئے اور ہاتھ الگ گر گئے۔

گرجے کی چھت پر دوام کا وہ چہرہ تھا جو گھڑی کی طرح تھا۔ اس پر کوئی نمبر نہ تھے اور نہ کوئی سوئی تھی صرف ایک کالی انگلی اس سمت اشارہ کر رہی تھی اور مُردے اس میں وقت دیکھ رہے تھے۔

اب ایک شاندار لمبی شکل جس کے چہرے پر دائمی تکلیف کے آثار تھے اوپر سے ذبیحہ پر اُتری اور سب مُردوں نے کہا "عیسےٰ! کیا خدا نہیں ہے؟" اس نے جواب دیا "کوئی خدا نہیں ہے"

مُردوں کے سائے تھر تھرائے، نہ صرف اس کے سینے بلکہ ایک کے بعد دوسرا تھرانے سے الگ ہو گیا۔

عیسےٰ نے بیان جاری رکھا "میں دنیا بھر میں گھوما۔ میں سورج تک اُڑا اور ستاروں کے ساتھ آسمان کے میدان پر پھرا مگر خدا نہ ملا۔ میں وہاں تک گیا

جہاں تک خودی اپنا عکس ڈالتی ہے۔ اور گہرائی میں نظر ڈال کر کہا "اے باپ تم کہاں ہو" مگر مجھے دائمی طوفان سنائی دیا جس پر کوئی قابو نہیں رکھتا اور انسانی وجود کی قوس قزح گہرائی پر کھنچی ہوئی تھی اور کوئی سورج نہ تھا جس نے انہیں بنایا ہو اور جب میں نے لاانتہا کائنات میں آسمانی آنکھ کو ڈھونڈا تو وہ خالی اور بے انتہا گہرائی کا گڑھا دکھائی دی اور دوام خلا پر بیٹھا تھا اور اسے چبا رہا تھا۔ چلاؤ۔ اے بے ہنگم آوازوں۔ سایوں کو ختم کر دو کیونکہ خدا نہیں ہے۔

بے رنگ سائے اس طرح اُڑ گئے جیسے کہرا گرمی سے اُڑ جاتا ہے اور تمام جگہ خالی رہ گئی۔ پھر دل کے درد کے ساتھ وہ مُردہ بچے جو قبرستان میں جاگ گئے تھے عبادت گاہ میں داخل ہوئے اور ذبیحہ پر کھڑی ہوئی لمبی شکل سے پوچھنے لگے "عیسےٰ ہمارا کوئی باپ نہیں ہے؟" انہوں نے روتے ہوئے جواب دیا "ہم تو دونوں یتیم ہیں۔ ہمارا کوئی باپ نہیں۔

اس وقت گڑبڑ کی آوازیں اور بھی تیز ہوگئیں۔ تھراتے ہوئے گرجا کی دیواریں الگ ہو گئیں اور بچوں کے ساتھ بیٹھ گئیں اس کے بعد ساری زمین اور سورج بھی بیٹھ گیا، کائنات کا سارا لامتناہی نظام اپنی ساری عظمت کے ساتھ ڈوب گیا۔ قدرت کی چوٹی پر عیسےٰ کھڑے ہوئے کائنات اور اس کے ہزاروں سورجوں کو اس طرح مٹتے دیکھتے رہے جیسے کہ کسی کان میں رات منتی جا رہی ہو، سورج کان کھودنے والوں کے لیمپ کی طرح نظر آ رہا ہو اور ستارے چاند کی طرح غائب ہو رہے ہوں۔

اور جب عیسےٰ نے دنیاؤں کی بھیڑ، آسمان کے اگیا بیتالوں کا ناچ اور دلوں کی جلتی ہوئی مونگے کی چٹانوں کو دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ ایک سیّارے کے بعد دوسرا سیّارہ اپنی چمکتی ہوئی روح کو چھوڑ کر موت کے سمندر میں غائب ہو رہا ہے جیسے کہ پانی کا ایک گیند لہروں پر چمکتی ہوئی روشنی کو ختم کر رہا ہو تو انہوں نے اپنی آنکھیں اُٹھائیں اور خلاء کو دیکھ کر کہا "حماقت زدہ نفی ۔ دائمی ضرورت ۔ جنونی اتفاق ۔

کیا تم جانتے ہو کیا ہونے والا ہے۔ تم مجھے اور کائنات کو کب بگاڑ ڈالو گے اے اتفاق کیا تم جانتے ہو کہ تم کب تک ستاروں پر ایسی آندھی چلاؤ گے جو ان کی روشنی بجھا دیگی۔ ہم میں سے ہر ایک اس کائنات میں اکیلا ہے۔ میرے پاس میرے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اے باپ۔ اے باپ تمہارا دائمی سینہ کہاں ہے کہ میں اس سے لپٹ جاؤں۔ اگر ہر دور اپنا باپ اور مورث ہے تو وہ اپنا ہی برباد کرنے والا فرشتہ کیوں نہ ہو۔

"کیا میرے ساتھ کوئی آدمی ہے ؟ تم عزیب مخلوق، تمہاری چھوٹی زندگی قدرت کی ٹھنڈی سانس ہے یا اس کی آواز بازگشت ہے۔ ایک آئینہ اپنی چمک گرد کے بادلوں پر ڈال رہا ہے جو زمین کے مُردوں کی راکھ سے بنے ہیں اور پھر تمہارے بادل کی طرح کے گھومتے ہوئے عکس اُبھرتے ہیں۔ اس گہرائی میں دیکھو جس پر راکھ کے بادل اُڑ رہے ہیں۔ دنیاؤں سے بھرا ہوا دھندلکا مُردوں کے سمندر سے اُٹھ رہا ہے مستقبل ایک اُٹھتا ہوا گہرا ہے اور موجودہ دور گرتا ہوا گہرا ہے۔ کیا تم اپنی زمین کو پہچانتے ہو"

یہاں عیسے نے نیچے دیکھا اور ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں" آہ میں کبھی اس زمین پر تھا اس وقت میرا دائمی باپ میرے ساتھ تھا اور میں خوشی کے ساتھ آسمان کو دیکھ رہا تھا اور مجروح سینے کو اس کے اعلیٰ تصور سے معمور کئے تھا اور مرتے مرتے میں نے کہا " اے باپ اپنے لڑکے کو اس خون کے جہنّم سے اُٹھا کر اپنے دل میں رکھ لو ؛ اے زمین کے خوش باشندو! تم اب بھی اس پر عقیدہ رکھتے ہو۔ شاید اب تمہارا سورج ڈوب رہا ہے اور تم پھولوں کے درمیان اپنے گھٹنوں پر گر پڑو گے اور اپنے ہاتھ اٹھا کر خوشی کے آنسوؤں سے آسمان کی طرف دیکھو گے۔ مجھے بھی تم دائمی ہستی کے مانند دیکھو گے اور میرے زخموں کو میرے مرنے کے بعد بند کرو گے۔ تم غمزدہ لوگوں کے زخم مرنے کے بعد بند نہیں کئے جائیں گے۔ اگر کوئی بدقسمت زمین پر زخموں سے بھری پیٹھ لے کر گر پڑے گا تاکہ وہ

ایسی صبح کا انتظار کرے جو حق، نیکی اور خوشی سے معمور ہے تو جب وہ جاگے گا تو دیکھے گا کہ طوفان برپا ہے، تاریکی دائمی ہے، کبھی صبح نہیں ہوگی، زخم اچھے نہ ہوں گے اور دائمی باپ نہ ہوگا۔ اے انسانو اگر تم ابھی زندہ ہو تو اس سے دعا کرو، نہیں تو تم اسے ہمیشہ کے لئے کھو دو گے۔

اور جب میں نیچے گرا اور میں نے کائنات کی چمکتی ہوئی عمارت کو دیکھا تو مجھے دوام کے سانپوں کے اکٹھے ہوئے کنڈل دکھائی دئے جو کائنات کے چاروں طرف لپٹ گئے تھے اور کنڈل گر پڑے اور کائنات کے چاروں طرف دوہرے چکر بن گئے۔ پھر ایک سانپ ہزاروں حلقے بنانے لگا اور دنیاؤں کو گھیر کر قریب کرنے لگا اور اس نے نہ ختم ہونے والی عبادت گاہ کو قبرستان میں تبدیل کر دیا۔ ہر چیز تنگ، ڈراونی اور تاریک نظر آئی اور بہت ہی بڑا گھنٹہ آخری لمحہ بجانے والا تھا جب میں جاگ اٹھا۔

میری روح خوشی سے رو رہی تھی کہ میں پھر خدا سے دعا کر رہا تھا اور خوشی، آنسو اور عقیدہ سب دعا میں موجود تھا اور جب میں اُٹھ کر چلا تو سورج کھیت کی بالیوں پر چمک رہا تھا اور اپنا عکس چاند پر ڈال رہا تھا۔ آسمان اور زمین کے درمیان ایک خوشی پر مٹنے والی دُنیا میری طرح زندہ تھی اور دائمی باپ کے سامنے تھی اور میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی قدرت سے اطمینان کی فضا میں شام کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

ایک شہزادے نے شکار کے بعد اپنی رعایا کی میزبانی کیسے کی۔ ژان پال نے جرمنی کے مقبوضات میں خرابیوں کا حال بیان کرنے کے لئے ایک فرضی اخباری رپورٹ کا سہارا لیا ہے جس کے آخر میں وہ اپنی رائے کا اظہار بھی کرتا ہے۔

یہاں وہ ان دیہاتیوں اور سپاہیوں کا مصیبت کی زندگی گزار رہے تھے حال لکھتا ہے جن کو حکمرانوں کی مرضی سے بچانے کے لئے کوئی دستور نہیں بنایا گیا ہے اس کی تنقید نہ تو روشن خیالی کے زمانہ کی طرح فلسفیانہ بحث پر مبنی ہے اور نہ اسٹرم اینڈ ڈرینگ کی طرح بے ربط شکایت ہے بلکہ مزاح اور طنز کے ذریعہ ادا ہوئی ہے جو حکمرانوں کی مدح سے

نکلتا ہے۔ پڑھنے والا سمجھ جاتا ہے کہ ژان پال کا مطلب کیا ہے۔ اس کی تنقید کمزور ہے اور صحیح طریقہ پر نہیں چلتی کیونکہ وہ بے معنی مبالغے استعمال کرتا ہے۔

اگرچہ انسان اور عام لوگوں کی محبت اور عام طور پر ہر قسم کے جذبے نے اپنا آشیانہ زیادہ تر شاہی تختوں پر بنا لیا ہے اس لئے ان جذبات کا اظہار کوئی معجزہ نہیں ہے ہر بار (اور بہت زیادہ) کوئی حکمران ایسا عمل کرتا ہے (اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا معمولی عمل بھی عظیم عمل ہوتا ہے) کہ لوگوں کا ایک مجمع جمع ہو جانا چاہیئے اور زور شور سے اس کی تعریف کرے۔ خاص طور سے اخبار نویس جن کے لئے دنیا کی تاریخ کا یہ صفحہ ہی ساری دنیا ہے، میں اسے عظیم عمل کہوں گا۔ اگر کوئی مجھے ایک اشرفی دے دے یا اگر میں موسیقار ہوں تو دو سو اشرفیاں دے دے۔ بہرکیف سنیچر کے اخبار سے اس شاندار عمل کا حال پڑھیئے اور اس کو شاندار عوامل کے زمرے سے الگ کر دیجئے یعنی ایسے عوامل کی تعریف ہوتی ہے مگر ان کی تقلید نہیں کی جاتی۔

۲۹۔ اگست

ہمارے رحم دل حکمران اور خداوند نے اس سال خزاں کے زمانے میں سفیر کے لئے ایک شکار کا انتظام کیا۔ اور اس میں دیہاتیوں کو شریک ہونے کی اجازت فرمائی۔ دیہاتیوں کی خوشی، جب کہ حکمران کی عنایت سے رات بھر محنت کر کے شکار کو ہنکانے سے انہیں معافی دے دی گئی تھی، اتنی زیادہ تھی کہ کچھ لوگ یہ نہ دیکھ سکے کہ شوقین شکاریوں نے خراب ہنکائی کی وجہ سے ان کے ہاتھ اور ٹانگیں اڑا دی ہیں۔ اور جب وہ گھر واپس آئے تو انہیں محسوس ہوا کہ وہ اٹھ بیٹھ نہیں سکتے ہیں۔ بہرکیف ہمارے حکمران نے یہ محسوس نہیں کیا یہ شکار ہی ان کی رعایا کی کھیتی کے اجڑ جانے کا معاوضہ نہ ہو بلکہ انہوں نے یہ فرمان جاری کیا کہ سرکاری خزانہ کچھ رقم پیش کرے تاکہ دیہات کو سرکار کی طرف سے کھانا دیا جائے اور یہ کھانا معمولی دیہاتی قسم کا نہ ہو بلکہ مزے کو بڑھانے کے لئے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ حکمران اپنی رعایا کے ساتھ مساوات برت رہا ہے عمدہ ہو۔ اس معاملہ میں اخراجات کا خیال نہیں کیا گیا قسم قسم کی پلیٹیں تھیں کچھ چینی

کی اور کچھ شیشے کی جن پر موم اور دوسری چیزوں سے تصویریں بنی تھیں۔ یہ پلیٹیں آئینہ کی کشتیوں پر سجی ہوئی تھیں اور لمبی سرخ میزوں پر رکھی گئی تھیں تاکہ دیہاتی انھیں دیکھ کر خوش ہوں۔ تمام قسم کی پلیٹوں میں وہ موم کے ماڈل والی پلیٹیں سب سے زیادہ پسند کی گئیں جن میں شکاریوں کو کھیتوں کو برباد کرتے دکھایا گیا تھا۔

خوشی منانے کا عالم اس وقت حد کو پہنچ گیا، جب مہمان خوبصورت پلیٹوں کا منظر دیکھنے کے بعد ہر قسم کا کھانا خریدنے لگے جو شہر کے لوگ لائے تھے۔ شکار کا گوشت بھی حکمران کے حکم سے خریدا گیا اور وہ اتنا زیادہ تھا کہ اس میں سے بہت سا سڑ گیا کیونکہ کتے اسے کھا نہ سکے اور دیہاتی خرید نہ سکے۔ حکمران نے جو ہمیشہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ عام آدمی بہت خوش ہوں، یہ اعلان کیا کہ آئندہ اسی قسم کے اور شکار اور دعوتیں ہوا کریں گی۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ حکمران ایسی پلیٹوں کا جن سے پیٹ عجیب اطمینان حاصل کرتا ہے اور زیادہ مظاہرہ کیا کریں گے لہٰذا ہر تنخواہ کے دن پر گولہ بارود کی روٹی ایک رسالے کے بعد دوسرے رسالہ کو دکھائی جائے گی اور کھانے کو نہیں دی جائے گی، کیونکہ وہ آٹے کے بجائے مٹی کی بنی ہونے کی وجہ سے ہضم نہ ہو سکے گی۔ یہ مٹی فوج کی بھوک کو پورا نہیں کر سکتی۔ اس لئے بہت سے سپاہی دیہاتوں میں بھیک مانگنے جاتے ہیں اور کبھی کبھی اپنا معمولی راشن چرا بھی لیتے ہیں۔

اخبار کی اس اطلاع کی بابت میں دو باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات یہ کہ ہر دیہاتی اس بات کا اقرار کرے گا کہ وہ اپنے اور شکاریوں کے درمیان فرق ضرور کرتے ہیں۔ یہ انہیں مارتے نہیں اور نہ ان کو سرما کے شکار میں اچھی طرح کھلاتے اور رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ سپاہی کو ہمت کے علاوہ کھانے کی بھی ضرورت ہے۔ ہمت تو جنگ کے وقت ضروری ہے اور کھانا امن کے زمانے میں بھی درکار ہے اس لئے ضروری ہے کہ سپاہیوں کے پیٹ چھوٹے کئے جائیں۔ کوئی سپاہی معیاری بھوکا قرار دیا جائے اور باقی کو اس کے درجے پر آجانا چاہیئے۔ اگر کوئی سپاہی اتنے کم کھانے

پر زندہ نہ رہ سکے تو اس کی جگہ آنے والے پر خرچ کچھ نہ ہوگا جب کہ اس خرچ کا خیال کیا جائے گا جو راشن پر ہوتا ہے اور یہ بھی ضروری نہ ہوگا کہ سپاہی کو چھ ماہ کے لئے چھٹی دے دی جائے "تاکہ بھوک سے چھٹکارا پائیں بلکہ وہ سب بیرک میں بھوک کا انتظار کریں گے۔ یقیناً انہیں کمزور ٹانگوں پر کھڑے ہونے میں مشکل محسوس ہوگی مگر حکمرانوں نے یہ طے کیا ہے کہ وہ بھوک سے سمجھوتہ نہ کریں گے "تاکہ ان کی فوج ۳۶۵ دن کا فاقہ کرے اور پیٹ بھرے لوگوں کو فوج میں شامل نہ کریں گے۔ اسی عالم میں بھوکے سپاہی بھوکوں پر گولی چلائیں گے۔ اور معاملہ طے ہو جائے گا۔

نوالس

عیسائیت یا یورپ

فریڈرش فون ہارڈنبرگ (۱۸۰۱ - ۱۷۷۲) جو اپنے کو نوالس کہلاتا تھا رومانی دَور کا سب سے نمایاں شاعر تھا۔ اس نے جو چند تصانیف پیش کیں وہ ایسے تخیّل سے معمور ہیں جو زندگی کو جادو کی طرح بدل دیتا ہے۔ اس کے یہاں گہری اور پُرجوش روحانیت ہے جس میں موت کی تمنّا نمایاں ہے۔ موت کی خواہش اس کے یہاں اس کی پندرہ برس کی محبوبہ کی موت کی وجہ سے اور اس کی اپنی بیماری کی وجہ سے ہے اس کا مضمون "عیسائیت یا یورپ" (۱۷۹۹) تاریخ کی طرف ایک خاص رجحان کی مثال ہے جس نے جرمنی کے رومانیوں پر اثر ڈالا۔ یہ قرونِ وسطیٰ کو ایک شاندار زمانہ ظاہر کرتا ہے جب خدا، دنیا اور انسان میں اتحاد تھا۔ تجدّدِ اصلاح ایک مداخلت تھی جس نے یہ اتحاد بگاڑ دیا۔ جدید سائنس نے معجزہ اور اسرار کو مٹا دیا۔ روشن خیالی نے فرانس کا انقلاب پیدا کیا جو نوالس کے زمانے میں ہوا۔ اس نے اسے ایک انقلاب کی طرح دیکھا اور یہ چاہا کہ ایک اور اصلاح ہو جو امن اور عقیدے کا دَور لے آئے۔ انسان نے قرونِ وسطیٰ سے اب تک جو معلومات حاصل کی ہیں وہ برباد نہیں جائیں گی۔ مگر وہ نئے عقیدہ کو ایک آزادی دیں گی۔ نوالس نے یورپ کا تاریخی کارنامہ صرف سیاسی اتحاد میں نہیں بلکہ مذہبی روایت کی تجدید و احیاء میں دیکھا۔

آئیے اب اپنے دَور کے سیاسی ڈرامہ کو دیکھیں۔ پُرانی اور نئی دنیا کشمکش میں ہیں۔ موجودہ سیاسی اداروں کی نااہلی نئے کرشمے دکھا رہی ہے۔ اگر اس معاملے میں بھی سائنس کے سلسلے کی طرح یورپ کے ممالک میں زیادہ اتحاد کا نتیجہ جنگ ہو تو کیا ہو۔ اگر یورپ پھر جاگ جائے۔ اگر ایک حکومتوں کی حکومت اور ایک

نیا سیاسی نظریہ ظہور میں آجائے تو اس وقت حکومتوں کا بنیادی نظام اور اس کے اتحاد کا اصول کیا ہوگا۔ اور کیا وہ سیاسی خودی کا ذہنی تصور پیش کرے گا؟ کیا دنیاوی قوتوں کے لئے توازن میں آجانا ممکن ہے؟ یہ جب ہو سکتا ہے جب کہ تیسرا عنصر جو دنیاوی اور ذہنی دونوں پر مشتمل ہو شامل ہو جائے۔ جھگڑنے والی قوتوں میں صلح نہیں ہو سکتی۔ تمام امن محض دھوکا ہے۔ انتظامیہ کے ممبروں کے نقطۂ نظر سے کسی مشترکہ ضمیر کا پتہ نہیں لگتا۔ دونوں قوتیں اپنے دعوے جو انسان کی ضرورت پر مبنی ہیں، رکھتی ہیں۔ دونوں انسان کی روح کی دائمی قوتیں ہیں، ایک طرف قدیم چیزوں کی جانب رجحان ہے اور دوسری جانب نئی چیزوں میں خوشی کا احساس اور ذاتی حقوق کی پاسداری ہے۔ ان میں سے کسی کو دوسرے کے برباد کرنے کی امید نہ کرنا چاہیئے۔ یہاں فتوحات بے معنی ہوں گی، کیونکہ یہاں مرکز اس دنیا سے بالاتر ہیں۔

کون جانتا ہے کہ اگر وہ امن نہ حاصل کیا جائے جو روحانی قوت عطا کرتا ہے تو یورپ خون میں نہا جائے گا۔ جب تک کہ وہ جنون جو یہاں کے لوگوں کو چکر دے رہا ہے آسمانی موسیقی سے نہ روکا جائے گا اور لوگ محبت کا تہوار جنگ سے سُلگتے ہوئے میدانوں کو آنسوؤں سے بجھا کر نہ منائیں گے۔ صرف مذہب ہی یورپ کو پھر جگا سکتا ہے۔ قوتوں کو مطمئن کر سکتا ہے اور عیسائیت کو نئی شان سے زمین پر امن پسند رہنما بنا سکتا ہے۔

ہرمن فون کلائسٹ

ہرمن فون کلائسٹ (۱۸۱۱-۱۷۷۷) جرمنی کے بڑے ڈرامہ نگاروں میں تھا۔ اس کی تصانیف کے موضوع رومانی ہیں۔ مگر ژان پال کی طرح وہ نہایت جدید ہیں۔ کلائسٹ نے بڑے حوصلے سے کام کیا لیکن توازن نہ ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ ناکام رہا۔ اس نے فوجی ملازمت، علمی مطالعہ، زراعت، سول سروس اور صحافت کسی میں اطمینان نہ پایا۔ اس کی تصانیف میں سب سے اہم مسئلہ ایک ایسے مقام کی تلاش ہے جو عمل اور حق کو استقلال عطا کرے۔ کانٹ کے انسانی تصور کے تجزیہ سے متاثر کلائسٹ نے انسانی جذبات ہی میں عافیت محسوس کی۔ اپنے ڈراموں اور قصوں میں اس نے انسان کی زندگی پر دعوے اور اس کے جذبات کی فتح کو واضح کیا ہے اور حقیقت سے اس کی وہ کشمکش بھی دکھائی ہے جس کا نتیجہ کامل ناامیدی ہوتا ہے۔ اس کے اہم ترین ڈرامے "ایمفیٹریون" (۱۸۰۷) "پینتھسیلیا" (۱۸۰۸) اور "پرنس آف ہومبرگ" (۱۸۱۱) ہیں۔

میکل کوہلہاس: لوتھر کا اعلان

کوہلہاس تم جو کہتے ہو کہ تم انصاف کی تلوار چلانے کے لئے بھیجے گئے ہو، تم کیا کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟ تم جذبات سے پاگل ہو رہے ہو۔ تم میں بے انصافی سر سے پیر تک بھری ہے کیونکہ ملک کے مالک نے جس کے تم رعایا ہو تمہارا حق چھین لیا۔ تمہارا ایک معمولی جائداد پر حق تھا تم اٹھ کھڑے ہوئے۔ بے ایمان آدمی تلوار ہاتھ میں لے کر جنگل کے بھیڑیئے کی طرح اس من پسند قوم پر جس کا وہ نگہبان ہے پل پڑے ہو۔ تم جو اپنے جھوٹ سے لوگوں کو دھوکا دیتے ہو کیا تم سوچتے ہو ایسے گنہگار کہ خدا کے سامنے اس دن جب کہ ہر دل کی تہیں دکھائی دیں گی تم کو اس

کام کا کیا اجر ملے گا؟ تم کیسے کہتے ہو کہ تمہارا حق چھن گیا۔ تم غصہ ور جانور جس کو انتقام کی خواہش نے دیوانہ بنا رکھا ہے اور جو ایک بار کے بعد اپنے عمل کو بالکل چھوڑ بیٹھا ہو، کیا تمہاری حکومت ویسی ہی ہے جیسی کچہری کے ملازموں کی جو کوئی خط چھپا لیتے ہیں یا کسی چیز کو دبا لیتے ہیں؟ اور مجھے تم کو بتا دینا چاہیئے کہ تمہاری حکومت تمہارے معاملے کو نہیں جانتی۔ جس حکمران کے خلاف تم بغاوت کر رہے ہو وہ تمہارا نام تک نہیں جانتا اور جب تم خدا کے سامنے اس پر الزام لگاؤ گے تو وہ کہے گا "اس آدمی کے ساتھ میں نے انصاف نہیں کیا کیونکہ میں اسے جانتا بھی نہیں تھا۔ جو تلوار تم چلا رہے ہو وہ بربادی اور خونخواری کی تلوار ہے۔ تم باغی ہو اور انصاف کے سپاہی نہیں ہو۔ اسلئے اس دنیا میں تمہارے لئے پھانسی ہے اور عقبیٰ میں لعنت ہے جو خراب عمل اور خدا سے انکار کا نتیجہ ہے

جب وہ بیٹھ گیا تو لوتھر نے پوچھا تم کیا چاہتے ہو؟ کوہلہاس نے جواب دیا "تمہارے اس الزام کا رد کہ میں بے انصاف ہوں۔ تم نے اپنے اعلان میں کہا کہ میری حکومت میرے معاملے کو نہیں جانتی اچھا تو مجھے ڈریسڈن پہنچا دو اور میں اس کے سامنے یہ معاملہ پیش کردوں گا۔ لوتھر نے کہا "ناپاک اور خوفناک آدمی، تم کو ٹرونکا کے مالک پر حملہ کرنے کا کیا حق تھا اور جب وہ اپنے قلعہ میں نہ ملا تو تم نے اس کی قوم کا قتل عام کیا" کوہلہاس نے جواب دیا "ڈریسڈن کی خبر نے مجھے دھوکا دیا۔ میری جنگ ضرور غلط تھی مگر آپ نے مجھے یقین دلایا کہ میں اس قوم سے نکالا نہیں گیا" لوتھر نے کہا "نکالا گیا" تم پر جنون طاری تھا؟ تم کو اس قوم سے کون نکال سکتا تھا جس میں تم رہتے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کوہلہاس نے کہا "میں اسے نکالا ہوا کہتا ہوں جس کو قانون کا بچاؤ نہ ملے۔ میں اس کام سے اس قوم میں شامل ہوا تھا اور جو شخص مجھے اس میں شامل ہونے سے منع کرتا ہے وہ مجھے جنگل کے جانوروں میں دھکیل دیتا ہے اور مجھے ڈنڈا اٹھانے پر مجبور کرتا ہے"۔ لوتھر نے کہا "قانون کی حفاظت سے تم کو کس نے روکا؟ کیا میں نے تم کو نہیں لکھا تھا کہ تم نے جو شکایت کی

ہے وہ اس حکمران کو معلوم نہیں ہے۔ اگر حکومت کے ملازمین نے معاملات کو اس سے چھپایا اور اس کے نام کو بدنام کیا تو خدا کے سوا اس سے کوئی سوال نہیں کر سکتا۔ تم بے ایمان آدمی اس کی بابت فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہو۔ کوہلہاس نے کہا "اچھا اگر حکمران نے مجھے نہیں نکالا تو میں اسی قوم میں واپس جانے کو تیار ہوں مجھے ڈرسڈن پہنچا دو۔ لوتزن میں میرے سپاہی جو جمع ہیں میں ان کو نکال لوں گا اور قلعہ کو ملک کی سرکار کو واپس کر دوں گا۔" لوتھر نے اپنے سامنے رکھے ہوئے کاغذات کو ٹھیک کیا اور خاموش رہا اور پھر بولا "ڈرسڈن کی حکومت سے تمہیں کیا چاہیئے" کوہلہاس نے کہا "اسکوائر کو سزا۔ میرے گھوڑوں کی واپسی، میرے نقصان کا تاوان اور میرے آدمی ہرس کی واپسی۔" لوتھر نے کہا "نقصان کا تاوان، ہزاروں کی رقم جو تم نے یہودیوں اور عیسائیوں سے قرض لی۔ وہ بھی تم وصول کرنا چاہتے ہو۔؟" "خدا نہ کرے۔ میں اپنا گھر اور مویشی واپس نہیں چاہتا۔ میں ہرس کی ماں کو اس کا خرچ اور اپنے گھوڑوں کی قیمت دلوانا چاہتا ہوں" لوتھر نے کہا "خوفناک آدمی، ایک مرتبہ جب تو بدلا لے چکا تو پھر اسکوائر پر کیوں ایسا فیصلہ کرانا چاہتا ہے جو اسے برباد کر دے" کوہلہاس نے روتے ہوئے کہا "عالی جناب۔ میری بیوی ماری گئی ہے اور میں دنیا کو دکھانا چاہتا ہوں کہ وہ صحیح راہ پر تھی میری باتیں پوری کر دیجئے اور باقی معاملوں میں میں آپ کا مطیع ہو جاؤں گا۔

خطوط

کلائسٹ کے خطوط ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اپنے ڈراموں اور نثر میں ان ذاتی معاملات کو پیش کر رہا تھا جن کو وہ حل نہ کر سکا اور جنہوں نے اسے خودکشی پر مجبور کیا ۲۶۔ اکتوبر ۱۸۰۳ کو لکھا ہوا خط خودکشی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کلائسٹ اپنی ملازمت سے پریشان تھا۔ اس نے المیہ کے فن میں کمال حاصل کرنے کی کوشش مگر اس کا ڈرامہ معیار تک نہ پہنچ سکا اور اس نے مسودے کو جلا دیا۔ وہ اسی طرح اپنے

منصوبے میں ناکام ہوا جیسے فرانسیسی انگلستان پر حملہ کرنے میں ناکام رہے۔ اور اس کا ذہنی توازن برقرار نہ رہا۔

ایک اور خط وہ ہے جو اس نے خودکشی کے دن ۲۱۔ نومبر ۱۸۱۱ء کو لکھا۔ کلائسٹ کی زندگی کا خلاصہ ان الفاظ میں ہے۔ "حق یہ ہے کہ مجھے اس زمین پر مدد نہ ملی" ایک اور خط میں وہ اپنی زندگی کو "سب سے زیادہ تکلیف دہ جو کسی آدمی نے گذاری" کہتا ہے مگر وہ ناامیدی سے نہیں بلکہ اطمینان سے مرا۔

ہینرِش فون کلائسٹ بنام الریکی فون کلائسٹ

میری پیاری الریکی

میں جو کچھ لکھ رہا ہوں اس سے تمہاری زندگی خطرے میں آسکتی ہے مگر مجھے یہ ضرور کرنا ہے۔ پیرس میں مَیں نے اپنی تصنیف کو پڑھا نا پسند کیا اور جلا دیا اب سب معاملہ ختم ہے آسمان مجھے دنیاوی فائدوں سے اور شہرت سے محروم کر رہا ہے اور ایک ضدی بچّے کی طرح میں اس سے انکار کر رہا ہوں میں خود کو تمہاری دوستی کا اہل نہیں بنا سکتا مگر اس دوستی کے بغیر میں زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔ میں اپنے کو موت میں غرق کر دینا چاہتا ہوں۔ تم مطمئن رہو میں جنگ میں لڑ کر مارا جاؤں گا۔ میں نے اس ملک کا دارالحکومت چھوڑ دیا ہے اور شمالی ساحل پر گھوم رہا ہوں میں اس فرانسیسی فوج میں شامل ہو جاؤں گا جو انگلستان پر حملہ کرنے والی ہے اور سمندر پر برباد ہو جائے گی۔ میں قبر میں پہنچ جانے کی خواہش رکھتا ہوں تم میرا آخری خیال ہوگی۔

ست اومیر ۲۶۔ اکتوبر ۱۸۰۳

ہنرِش فون کلائسٹ : الریکی فون کے نام خط

بنام حضور عالیہ مس الریکی فون کلائسٹ۔ دریائے فرنکفرٹ اوڈر پر میں دنیا اور خاص طور پر میری پیاری الریکی سے صلح کئے بغیر نہ مروں گا۔ کلائسٹ خاندان کے نام میرے خط میں جو الفاظ ہیں ان کو میں واپس لیتا ہوں۔ تم نے میرے لئے وہ کچھ کیا جو ایک بہن ہی نہیں بلکہ کوئی آدمی کر سکتا تھا۔ بات یہ ہے کہ اس دنیا میں

میری مدد نہیں ہوسکتی تھی - اب خدا حافظ - خدا تم کو بھی میری سی موت دے صرف اس میں اس کی آدھی خوشی ہو - یہی سب سے زیادہ مخلص خواہش ہے جو میں تمہارے لئے کر سکتا ہوں۔

تمہارا ہنرش

اسمنگ قریب پوٹسڈام
تاریخ : میرے موت کے دن کی صبح (۲۱- نومبر ۱۸۱۱)

لوکارنو کی فقیرنی

کلائسٹ کے افسانوں میں "لوکارنو کی فقیرنی" خاص مقام رکھتی ہے۔ اس کا اختصار خاص صفت ہے۔ اس کا واقعہ ایک معمولی حادثہ ہے جس کے نتائج بڑے ہوتے ہیں کچھ تعجب خیز ہے اور ایسا ہی غیر واقعیاتی قصہ ہے جو رومانی اثر نمایاں کرتا ہے - یہ عجیب صفات سمجھائی نہیں جا سکتیں کہ یہ عجیب اور پُراسرار ہیں۔

الپس پہاڑ کے نیچے شمالی اٹلی میں لوکارنو کے پاس ایک قلعہ تھا جو ایک مارچیز کا تھا اور جس کے آثار اب بھی موجود ہیں - یہ بڑا قلعہ تھا جس کے ایک کمرے میں ایک بڈھی بیمار عورت بھوسے کے ڈھیر پر پڑی تھی - مارچیز نے ایک مرتبہ اس کمرے میں داخل ہوکر اسے غصہ سے ڈانٹا اور چولھے کے پیچھے ہو جانے کا حکم دیا۔ عورت مشکل سے جیسا کیسے اٹھی مگر کمرہ کے بیچ میں آکر گر گئی اور مر گئی۔

کئی سال بعد مارچیز نے اس قلعہ کو بیچنا چاہا - ایک فلرِڈنٹائن نے اس کو خریدنے کا وعدہ کیا اور وہ اسی کمرے میں ٹھہرایا گیا - رات کے وقت وہ ڈر سے بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ اس کمرے میں ایک بھوت ہے۔

یہ خبر ہر جگہ پھیل گئی اور سب خریدار بدظن ہو گئے - مارچیز نے خود طے کیا کہ اس کمرے میں سوئے گا - رات کو اس نے بھی ایک بھوت نکلتے دیکھا - صبح کو اس کی بیوی نے حال پوچھا تو اس نے بھوت کے موجود ہونے کی تصدیق کی۔

دونوں نے یہ طے کیا کہ اس خبر کو پھیلانے سے پہلے وہ دونوں اس کی مزید تفتیش کریں۔ چنانچہ دونوں مل کر اس کمرے میں سوئے اور اپنے کتّے کو بھی ساتھ لے گئے۔ آدھی رات کے وقت کتّا بھونکنے لگا جیسے کہ اس نے کوئی آدمی دیکھا ہو۔ یہ دیکھ کر خاتون کمرے سے بھاگی۔ مارچیز نے تلوار چلانا شروع کی۔ خاتون نے اپنی سواری تیار کرائی تاکہ وہ قلعہ سے دور بھاگ جائے۔ وہ جانے والی ہی تھی کہ اس نے دیکھا کہ قلعہ میں آگ لگ گئی اور ایک اونچا شعلہ بلند ہوا۔ مارچیز نے پریشان ہو کر آگ لگادی تھی اور قبل اس کے کہ اس کی بیوی لوگوں کو مدد کے لئے روانہ کرے، وہ جل کر مر چکا تھا اور اب بھی اس کی ہڈیاں اس کمرے میں ہیں جہاں اس نے بوکارنو کی فقیرنی کو ڈانٹا تھا۔

جوسف فون ایشنڈورف

اپنی نظم ونثر میں جوسف فون ایشنڈورف (۱۷۸۸-۱۸۵۷) جرمن رومانیت کا اہم نمائندہ معلوم ہوتا ہے۔ نیپولین سے آزادی حاصل کرنے والی جنگوں میں وہ لیفٹننٹ کے عہدہ پر مامور تھا وہ منصب کے اعتبار سے سول سروس میں بڑا عہدہ دار تھا۔ اس کی نظمیں قدرت سے گہرے لگاؤ اور روحانی کیف کی بنا پر نمایاں ہیں۔ اس کے یہاں رومانی شاعروں کی سی متضاد صفات نہیں ہیں۔

جرمن رؤسا کی زندگی

ایشنڈورف کی تصنیف 'جرمن رؤسا اور انقلاب' سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض خواب دیکھنے والا نہیں تھا بلکہ صحیح نظر رکھتا تھا۔ زیر نظر اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ جرمنی میں رؤسا کا کیا حال تھا۔ مصنف اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ طرز زندگی فرسودہ ہوگیا اور اب ختم ہونے والا ہے۔ یہ عجیب وغریب بیان انقلاب فرانس سے متاثر ہے۔ جس کے اصولوں نے رؤسا کی سماجی اور سیاسی وقعت کو ختم کردیا تھا۔

بوڑھے لوگوں کو پرانا زمانہ یاد ہوگا۔ وہ لوگ نہ پرانے تھے نہ اچھے بلکہ ایک مضحکہ تھے۔ ان کے اصول محض دکھاوا رہ گئے تھے جن پر سوداگروں نے غلبہ حاصل کرلیا تھا۔ رؤسا قرون وسطیٰ کی نشانی اور بادشاہوں کے مصاحب تھے مگر سی سالہ جنگ نے انہیں ختم کردیا تھا۔ بادشاہ کے غائب ہوجانے سے وہ مرکز سے علیحدہ ہوگئے تھے۔ وہ ریت کے ڈھیر پر کھڑے تھے اور آزاد ہونے کے بجائے دربار یا فوج کا حصّہ ہوگئے تھے۔

اس لئے سورماؤں نے فوج پیشہ اختیار کرلیا تھا۔ سی سالہ جنگ میں ان کی قدیم صفات پھر سے زندہ ہوگئیں مگر ان کا وہ نظام ختم ہوگیا جو انہیں ایک

لڑی میں پروئے ہوئے تھا - وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے اور ان کے فوجی لباس میں بھی تبدیلی آگئی -

اس زمانے کا جوان رئیس جنگ کے بجائے خواتین کو گھیرنے میں لگ گیا اور ان لوگوں کے تمام طریقے ایسے ہو گئے جن سے وہ مستورات کے تعاقب میں کامیاب ہو سکیں۔

رؤسا تین حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ تعداد میں سب سے زیادہ، تندرستی میں سب سے بہتر اور سب سے زیادہ دلچسپ حصہ ان لوگوں سے بنتا تھا جو چھوٹی ریاستوں کے مالک تھے۔ یہ ریاستیں شہروں سے دور اور آج کل کے زمانے سے بالکل ملتی تھیں۔ اپنی زندگی کی یکسانیت کو بدلنے کے لئے یہ لوگ شکار پر جاتے، شکاریوں کے قصے سنتے اور قریب کے شہر میں خوبصورت عورتوں کے پاس جاتے۔ ان کا جلوس یوں نکلتا تھا کہ مستورات اپنے بہترین لباس میں کوچ میں بیٹھی ہوئی سب سے آگے ہوتیں اور پیچھے مرد ایک قسم کی کھلی گاڑی میں ٹھنسے ہوئے بیٹھتے تھے۔ مگر یہ لوگ سب سے زیادہ دلچسپ ان پارٹیوں میں نظر آتے جو یہ اپنے گھروں میں دیتے تھے یہاں یہ دکھائی دیتا کہ ایسے معاملوں میں کتنے کم انتظام کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ پارٹیاں بڑے کمروں میں ہوتیں جہاں ناچ اور گانے کا بھی سامان ہوتا اور شمعوں سے روشنی کی جاتی - دیہاتیوں کی عورتیں اور جوان لڑکیاں باہر سے تماشا دیکھتیں۔ مختلف قسم کے ناچ ہوتے۔ عموماً ایک مرد اور ایک خاتون بھی ناچتے اور ساتھ ہی ساتھ ہر قسم کے باجے بجتے۔ اکثر نشہ میں آکر سن رسیدہ مرد بھی ناچنے لگتے۔

عموماً یہ خوش باش لوگ سیدھے سادے مکانوں میں رہتے جو کھلے ہوئے ہوتے تھے ۔ ایک شریف آدمی کے لئے اچھا کسان ہونا اور ایک خاتون کے لئے گھر بار چلانے کی قابلیت ہونا ضروری تھا۔ ان کو قدرت کے حسن کا شعور نہ

تھا کیونکہ وہ خود قدرت کا ایک حصہ تھے۔

جوان لڑکیاں کچھ پرانی قسم کے باجے بجا کر تفریح کرتیں یا پھر کچھ باغبانی سے دلچسپی لیتیں۔ صبح ہی سے ہر قسم کے کام شروع ہو جاتے اور ادھر اُدھر پھرنے سے دروازے زور کے ساتھ کھلتے اور بند ہوتے۔ چڑیاں بھی اِدھر اُدھر اڑتی دکھائی دیتیں اور سورج نکلنے پر گھر کی ہر چیز روشن ہو جاتی۔ گرمیوں میں سہ پہر کے وقت مہمان آتے۔ خواتین سے چہلیں ہوتیں، کافی پی جاتی اور زراعت کی بابت باتیں ہوتیں۔ تمام وقت چڑیوں کی آوازیں باہر سے آتی رہتیں۔ اس وقت آندھی آتی اور آسمان پر بجلی چمکنے لگتی۔

ناکارہ کی سرگذشت

ایشنڈورف کی کہانی "ایک ناکارہ کی سرگذشت (۱۸۲۶) آخری دَور کے رومانی نظریہ کی مثال ہے۔ ایک پن چکی والے کا لڑکا قسمت آزمائی کے لئے نکلتا ہے اور دور دراز کے ممالک کا خواب دیکھتا ہے۔ وہ بہت سے عجیب واقعات سے گزرتا ہے اور آخر میں شادی کر لیتا ہے۔ اس قصہ میں محبت کے جذبات، قدرت کے مناظر موسیقی اور اطمینان ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ اس میں نظمیں بھی شامل ہیں اور افسانوی طرز سیدھا سادا ہونے کے باوجود ایک فضا قائم کرتا ہے۔

میں دن رات تیزی سے سفر کرتا رہا کیونکہ ہر وقت میرے کانوں میں قلعے سے آنے والی آوازیں گونجتی رہتی تھیں جیسے لوگ چیختے ہوئے میرے پیچھے دوڑ رہے ہوں۔ راستے میں مجھے دیہاتیوں سے معلوم ہوا کہ میں روم سے کچھ ہی میل دُور تھا۔ یہ سُن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ بچپن میں میں نے روم کی بابت بہت سے قصے سُنے تھے اور جب میں اتوار کے دن گھاس پر پن چکی کے سامنے لیٹ کر سوچا کرتا تھا تو آسمان پر چلتے ہوئے بادلوں میں مجھے یہ شہر، اس کی عجیب پہاڑیاں، اس کے پیچھے نیلا سمندر، اس کے سونے کے پھاٹک اور اس کے چمکتے ہوئے میناروں

پر گاتے ہوئے فرشتے صاف نظر آتے تھے۔ رات ہو گئی اور چاند چمکنے لگا۔ جب جنگل سے نکل کر میں اس پہاڑی پر آیا جہاں سے مجھے یہ پیارا شہر دکھائی دینے لگا۔ دور سمندر چمک رہا تھا، آسمان پر لاتعداد ستارے تھے اور نیچے یہ پاک شہر تھا۔ جو بادل کا ٹکڑا معلوم ہو رہا تھا یا ایسا شیر، جو سو رہا تھا اور جس کے اِدھر اُدھر پہاڑ، دیووں کی طرح کھڑے تھے۔

پہلے میں ایک سنسان میدان میں پہنچا جہاں کہیں کہیں ایک ٹوٹی پھوٹی دیوار یا سوکھی ہوئی جھاڑی یا کوئی رات کی چڑیا اُڑتی نظر آتی تھی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اس میدان میں ایک قدیم شہر دبا ہوا تھا اور یہاں رات میں بھوت چلتے نظر آتے تھے مگر میں بے خوف اس پر سے گذرتا چلا گیا کیونکہ شہر میرے سامنے زیادہ سے زیادہ صاف نظر آتا گیا۔ اونچی پہاڑیاں اور شہر کے مینار اس طرح چمکتے گئے جیسے کہ ان پر فرشتے کھڑے ہوں۔

اس طرح پہلے میں کچھ چھوٹے گھروں کے پاس سے گزرا اور پھر ایک شاندار پھاٹک میں سے گذر کر روم کے مشہور شہر میں داخل ہو گیا۔ یہاں چاندنی کی روشنی سے دن کا سا سماں معلوم ہوتا تھا۔ کوئی انسان نہیں نظر آیا سوائے ان لوگوں کے۔ جو کہیں کہیں سنگ مرمر کے زینوں پر سو رہے تھے۔ صحن میں فوارے چل رہے تھے اور سڑک کے کنارے کے باغ جھوم رہے تھے۔ اور سڑک پر خوشبوئیں آ رہی تھیں۔

میں چاندنی اور خوشبوؤں سے متاثر ہو کر بھول گیا کہ کہاں جانا ہے اتنے میں باغ سے ستار کی آواز سنائی دی۔ میں نے سوچا "یہ وہ پاگل طالب علم ہوگا جو میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا" مگر آواز ایک خاتون کی تھی جو باغ میں گا رہی تھیں۔ میں محو ہو گیا۔ کیونکہ یہ آواز میری حسین خاتون کی تھی اور وہ وہی گیت گا رہی تھی۔ جو اپنی کھڑکی پر کھڑی ہو کر گایا کرتی تھی۔

اس سے مجھے اپنے دلکش ماضی کی یاد تازہ ہو گئی۔ میں بے قرار ہو کر پھاٹک پھاند کر باغ میں داخل ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں ایک نازک سی سفید شکل تھی

مگر وہ مجھے دیکھ کر گھر کے اندر بھاگ گئی" یہ وہی ہے" میرے دل نے کہا۔ پھاٹک سے کودنے میں میرے پیر میں موچ آگئی تھی اور میں لنگڑاتا ہوا گھر کی طرف چلا۔ میں نے دستک دی اور انتظار کرنے لگا اور مجھے اندر کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ چاندنی میں دو آنکھیں چمک رہی ہیں۔
" وہ بھی جانتی ہے کہ میں ہوں" میں نے سوچا۔ میں نے اپنی بانسری نکالی اور پُرانے طریقے پر گانے لگا۔ مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ ہوا۔ پھر میں زینہ پر تھک کر لیٹ گیا اور نہایت سہانے خواب دیکھنے لگا۔

جب میں جاگا تو صبح ہو چکی تھی۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ میں نے اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ فوارہ چل رہا تھا مگر کوئی اور آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ایک کمرے میں جھانکا اس میں فرنیچر ٹھیک سے لگا تھا مگر دروازہ اس طرح بند تھا جیسے کہ رہنے والے عرصے سے باہر چلے گئے ہوں۔ پھر میں خوفزدہ ہو کر پھاٹک کی طرف آیا اور اسے پار کر کے سڑک پر پہنچ گیا۔ میں نے شہر کو سورج کی روشنی میں جگمگاتے ہوئے دیکھا اور خوش ہو کر آگے بڑھا۔

مگر اس بڑے شہر میں میرا کہاں ٹھکانا تھا۔ میں ایک پتھر کے فوارے پر بیٹھ گیا اور گانے لگا۔

ایک جوان آدمی نے پاس آکر کہا "تم خوب گاتے ہو" میں نے جرمن زبان میں یہ آواز سن کر کہا " میرے ہموطن تم پر خدا کی رحمت ہو" جوان نے ہنس کر کہا " مگر تم یہاں روم میں کیا کر رہے ہو"؟ میں نے راز چھپاتے ہوئے کہا " میں یہاں دُنیا دیکھنے آیا ہوں " اس پر وہ ہنس کر بولا۔" میں بھی دُنیا دیکھنے آیا ہوں تاکہ قرطاس پر اس کی تصویر بناؤں "۔ " تم بھی مصوّر ہو" میں نے کہا۔ اس نے کہا " تم میرے گھر آکر ناشتہ کرو اور میں تمہاری تصویر بناؤں "۔ میں اس مصوّر کے ساتھ خاموش سڑک پر چل دیا۔

وہ مجھے گلیوں سے نکالتا ہوا ایک پُرانے گھر پر لایا۔ وہ اپنی جیبیں دیکھتا رہا، پھر اسے یاد آیا کہ وہ صبح کو طلوعِ آفتاب دیکھنے کے لئے گیا تھا تو کنجی اندر ہی بھول گیا تھا۔ پھر ایک دھکّے سے اس نے دروازہ کھول لیا۔ یہ ایک بہت بڑا کمرہ تھا مگر اس میں ہر قسم کی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ ایک طرف میز تھی جس پر ایک پلیٹ میں روٹی رکھی تھی اور شراب کی ایک بوتل تھی۔

"لو کھاؤ پیو۔ میرے ہم وطن" اس نے کہا۔ اس نے کھڑکی کھولی اور نہایت شاندار منظر دکھائی دیا۔ مصوّر نے کہا "وہ ہمارا شاندار جرمنی ہے۔" اور بوتل اُٹھا کر شراب پینے لگا۔

پھر مصوّر نے لکڑی کے فریم کو کھڑکی کے پاس کیا۔ اس پر ایک کاغذ لگا تھا جس پر ایک جھونپڑا بنا تھا اس میں حضرت مریم تھیں اور حضرت عیسےٰ تھے جو بچپن سے گزر رہے تھے۔ جھونپڑے کے باہر دو گڈریوں کے بچے جُھکے کھڑے تھے۔ مصوّر نے کہا ان گڈریوں میں سے ایک کا چہرہ میں تمہارا سا بناؤں گا تاکہ دُنیا تم کو جان جائے اور ہم مرنے کے بعد بھی یاد رہیں۔" یہ کہہ کر اس نے کُرسی اُٹھائی مگر اس کی پیٹھ اس کے ہاتھ میں آگئی مگر اس کو ٹھیک کر کے مصوّر نے مجھے اس پر بٹھایا۔ میرے سامنے ایک آئینہ لگا تھا جس کو دیکھ کر میں مُنہ بنا رہا تھا۔ مصوّر یہ دیکھ کر ہنسا اور مجھے اُٹھنے کا اشارہ کیا اس نے میرا چہرہ گڈریئے کے کاندھوں پر بنا لیا تھا اور میں اسے دیکھ کر خوش ہوا۔

وہ تصویر بناتا رہا اور میں روٹی کھاتا رہا۔ میں نے وہاں اور بھی تصویریں دیکھیں اور پوچھا "کیا تم نے یہ بھی بنائی ہیں"؟ اس نے کہا "یہ مشہور مصوّر لیونارڈو ڈا ونچی اور لیوڈو راتی کی ہیں۔ میں نے کہا "ہاں میں بھی انہیں جانتا ہوں۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا "تمہارا مطلب کیا ہے؟"
کیا میں ان کے ساتھ رات دن سفر نہیں کرتا رہا؟ کیا وہ دونوں سرائے میں غائب نہیں ہو گئے اور میں اکیلا ادھر چلا آیا۔
مصوّر نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے کہ میں پاگل تھا مگر فوراً زور سے ہنس کر کہا "اچھا تم ان دو مصوّروں کے ساتھ سفر کر رہے تھے" میں نے کہا "ہاں" اور اس نے اٹھ کر مجھے سر سے پیر تک دیکھا اور کہا "یہاں ایک جرمن خاتون آئی تھی جوان فن کاروں اور ان کے ساتھ ایک بنسی بجانے والے کو ڈھونڈھ رہی تھی۔"

"جرمنی کی ایک خاتون"! میں نے پوچھا۔ "کیا اس کے ساتھ ایک مزدور بھی تھا؟"

"میں اور کچھ نہیں جانتا۔ میں نے اسے ایک خاتون کے گھر میں دیکھا تھا۔ کیا تم اسے جانتے ہو؟"

میں عجیب عالم میں آگیا۔ آخرکار میں نے کہا "یہ وہی ہے۔ وہی ہے" اور اپنی ٹوپی اٹھا کر سڑک کی طرف بھاگا۔ مصوّر کہتا رہا "شام کو ضرور واپس آنا۔ ہم کو شاید اس کی بابت کچھ معلوم ہو جائے۔"

لجوگ اوہلینڈ

سربراہِ مملکت کے انتخاب کے سلسلے میں

لجوگ اوہلینڈ (۱۷۸۷ - ۱۸۶۲) شاعر، عالم اور سیاست دان تھا۔ اس کی نظمیں رومانی تحریک کے آخری دور کی نمائندہ ہیں۔ ٹوبنجن میں پروفیسر کی حیثیت سے اس نے قدیم جرمن زبان اور شاعری کا مطالعہ کیا۔ سیاسی زندگی میں حصّہ لینے کی وجہ سے اس کے کام میں رخنے بھی پڑے۔ ۱۸۴۸ کے انقلاب کے بعد وہ فرنکفرٹ کی قومی اسمبلی کا ممبر ہوا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ تمام جرمنی کو متحد کیا جائے۔ جب اس امر پر غور ہو رہا تھا تو جرمنی کے مقبوضات الگ الگ ہو گئے۔ حسب ذیل تقریر اوہلینڈ نے اسمبلی میں کی تھی۔

حاضرین میں اس امر کی تائید کرتا ہوں کہ ملک کا صدر وقفوں کے بعد منتخب ہوا کرے۔ آخری اجلاس میں میں نے اس بات کی مخالفت کی تھی کہ صدر حکمرانوں میں سے چنا جائے، کیونکہ یہ بات اب مان لی گئی ہے اس لئے میں یہ کہتا ہوں کہ اس صدارت کو موروثی ہونے سے روکا جائے: کسی خاص ریاست کو یہ حق حاصل نہ ہو؛ آسٹریا کو الگ نہ کیا جائے اور صدر چھ سال کے لئے مقرر ہو۔

میں دیکھتا ہوں کہ موروثی حکومت دستوری بادشاہت کی طرح ایک ایسا صدر لائے گی جو لا شئے محض ہو گا۔ وہ کوئی آزاد رائے نہ رکھ سکے گا اور اگر ایسا کرنے کی کوشش کرے گا تو دستوری نظام سے کشمکش ہوگی۔ دستوری حکومت انگلستان میں رائج ہے۔ جرمنی میں اس قسم کا بادشاہ نہیں ہوا۔

ہمارے سیاسی نظام کی بنیاد بادشاہت نہیں بلکہ جمہوریت ہے اور ہمارا دستوری بادشاہ اس کا نتیجہ ہے۔ اس لئے جرمنی کے دستوری

نظام کو جمہوریت کے قریب ہونا چاہیئے۔

ایک زمانے میں میں یہ خواب دیکھا کرتا تھا کہ جمہوریت سے صحیح قسم کے لوگ اُبھر کر سامنے آئیں گے۔ اس وقت آپ دریافت کر سکتے ہیں کہ بادشاہی قوت کے بغیر ایسا کیونکر ہو سکتا ہے مگر میں یہ کہوں گا کہ اگر انتخاب کا طریقہ رائج رکھتے تو ایسا شخص آجاتا جس کا خاندان پوری قوم ہوتی۔

صرف ایک انتخاب سے ایک صدر کو چن لینا اور اسے قائم رکھنا غلط ہے کیونکہ صدر جوانی میں منتخب ہو کر بوڑھا ہو جائے گا مگر اس کی رائے نہ بدلے گی۔

پھر میں آسٹریا کے الگ رکھنے کے خلاف رائے دوں گا۔ شروع میں کسی نے یہ خیال نہیں کیا تھا کہ آسٹریا جرمن ریاستوں میں شامل نہ ہوگی۔ جرمنی کا اتحاد پیش نظر تھا۔ مگر اب ہماری نظر تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر آسٹریا کو الگ کر دیا گیا تو جرمنی اپنی روحانی قوت میں کم ہو جائے گا۔

حاضرین! ہمیں ایک عظیم عمارت بنانا ہے۔ ایک مینار پروشیا میں تعمیر ہو چکا ہے اب آسٹریا کو دوسرا مینار بنانا ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ موروثی طریقہ کو ختم کر دیں اور آسٹریا کو الگ نہ کریں۔ جمہور کو اس کے حق خود ارادی پر قائم رکھیں۔ کوئی صدر قائم نہیں رہ سکتا اگر وہ عوام کا منتخب کردہ نہ ہو گا۔

انیسویں صدی

◉

اپنی صفات کے حساب سے عینیت پسند کلاسیکی رومانی دور اٹھارہویں صدی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے خاتمہ کا نقطہ ۱۸۳۲ء میں گوئٹے کی وفات تھا۔

انیسویں صدی میں سائنس کی ترقی نے عینی فلسفہ کو رد کر دیا۔ اب فلسفی فرد کی داخلی زندگی سے سروکار رکھنے لگے یا وہ تاریخ کے اس مادی تصور کی بنیاد رکھ رہے تھے جس نے مارکسیت کی شکل میں سیاسی انقلاب کی قوت حاصل کرلی تھی۔ سائنسی ترقی کا فوری اثر یہ تھا کہ ٹیکنیکل اور صنعتی ترقی ہوئی جس سے معاشرے کا نظام بدل گیا اور اس سے لوگوں کے دماغ پر بڑا زور پڑا۔ اس دور کے نمائندے شاعروں کے بجائے فلسفی، سائنس دان اور سیاستدان ہوئے۔ مصنّفین کا رجحان واقعیت کی طرف ہوگیا مگر وہ عصری مسائل کو حل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

۱۸۴۸ء کے انقلاب سے پہلے ہی تحریکیں اور بغاوتیں شروع ہوگئی تھیں۔ بورژوا طبقہ کے لوگ اور ان کے ساتھ وہ تمام مصنّفین بھی جو ماضی کے اثر میں تھے، اپنی ذات کے خول میں گم ہوگئے اور سماجی و سیاسی امور سے فرار اختیار کر گئے۔ مصنّفین کا ایک گروہ جن کو "جوان جرمنی" کہا گیا اس عمل کی مخالفت کی انہوں نے سیاسی ردِعمل کو مضبوط کیا۔ ان لوگوں نے سیاسی اور سماجی پمفلٹ لکھ کر کافی اثر ڈالا۔ اس کا ماڈل فرانس کا جولائی والا انقلاب (۱۸۳۰) تھا جس نے ۱۷۸۹ میں قائم شدہ بادشاہت سے بغاوت کی تھی۔ جرمنی میں اس تحریک کا مقصد سیاسی حقوق کا حصول، قوت کا اوسط طبقہ میں منتقل ہونا اور جرمنی کو متحد کرنا تھا۔ بہت سے مصنّف اور صحافی جو "جوان جرمنی" سے ہمدردی رکھتے

تھے، گرفتار ہوتے، پریشان کئے گئے اور ملک سے فرار ہو گئے۔

کارل مارکس اور فریڈرش انجلز کا "کمیونسٹ مینسفسٹو" ۱۸۴۸ء میں چھپا۔ جو جرمنی میں بورژوا انقلاب کا سال ہے مگر مینی فیسٹو ایک جو تھے طبقے محنت کش عوام " کو جو حال ہی میں بیدار ہوئے تھے بورژوا طبقے کے خلاف بغاوت کی دعوت دیتا تھا۔ اوسط طبقے نے صنعت کاری کے ذریعہ بہت دولت جمع کرلی تھی اور ملک کی اقتصادیات پر قابض ہوگیا تھا، جب کہ محنت کش جن میں کسان اور دستکار دونوں شامل تھے، غریب اور مقروض ہو گئے تھے اور جان لیوا حالات میں کام کر رہے تھے۔ کمیونسٹوں کے برخلاف جو سماجی نظام کو اُلٹ دینا چاہتے تھے، سماجی اصلاح کرنے والے نچلے طبقے کے معاشی حالات کو سُدھارنے میں لگے ہوئے تھے اور ان کو اس عہد کے حالات سے ہم آہنگ کر رہے تھے۔

انیسویں صدی کے آخری نصف کا ادب، خاص طور سے ناول اور افسانے "واقعیت کا ادب" کہلاتے ہیں مگر یہ حقیقت کو محض ایک حد تک سامنے لاتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ زندگی کے مابعد الطبعیاتی نظریہ سے گریز کرتے ہیں مگر اس وقت کے اہم مسئلے یعنی سماجی کشمکش کو اُجاگر کرتے ہیں۔ اصولی طور پر یہ ادب فرد کے مسائل سے تعلق رکھتا ہے اور معاشرے کی زندگی ایک عینی طریقہ پر دکھائی جاتی ہے جو حقیقت سے ہم آہنگ نہیں ہے اس سلسلے میں صرف ایک مصنف صحیح طور پر واقعیاتی کہا جا سکتا ہے اور وہ تھیوڈور فونٹین ہے۔

ہنرش ہائین

ہنرش ہائین (۱۷۹۷-۱۸۵۶) ہی وہ عظیم مصنف ہے جو خیالات کے لحاظ سے "جوان جرمنی" سے متعلق کہا جاسکتا ہے۔ اس نے قانون پڑھا اور سیاسی رسالوں میں مقالے لکھے۔ اس کی نظمیں طنز کے باوجود رومانی تحریک سے تعلق رکھتی ہیں۔ ۱۸۳۱ء سے وہ پیرس میں مقیم ہوگیا اور جرمنی کے حالات کا وہیں سے مطالعہ کرتا رہا۔ اس کی تصانیف۔صحافی خبریں اور سیاسی مضامین ہیں۔ ہائین کی قوتِ مطالعہ، زبان پر اس کی قدرت اور اس کی تنقید کا لطیف طنز ان سے ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۸۴۵ء میں اس کی تصانیف جرمنی میں ممنوع قرار دے دی گئی تھیں۔

ہائین کے پیرس کے جولائی والے انقلاب (۱۸۳۰ء) پر خیالات اس کے ذاتی جذبات کا اظہار ہیں۔ اس وقت شاہ چارلس دہم بادشاہ جو آزادی کو سلب کرنا چاہتا تھا معزول کردیا گیا تھا۔ اس انقلاب میں بھی ویسی ہی دہشت ناک خونریزی ہوئی جیسی ۱۷۸۹ء میں ہوئی تھی۔

"سیاحت کی کتاب" میں ہائین یہ دکھاتا ہے کہ اس کے خیالات عالمی تاریخ سے واقفیت پر مبنی ہیں۔ وہ انقلابی قوت کو حاکم طبقہ کے خلاف ایک لازمی چیز مانتا ہے

جولائی کا انقلاب

ہلنگو لینڈ ۶۔ اگست

" جب اس کی فوج لونگو بارڈی سے لڑ رہی تھی تو ہیر دلین کا بادشاہ اپنے خیمہ میں بیٹھا چپ چاپ شطرنج کھیل رہا تھا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ جو شخص شکست کی خبر سنائے گا وہ مار دیا جائے گا۔ جو لوگ ایک درخت پر

بیٹھے جنگ کا حال دیکھ رہے تھے چلاتے رہے " ہم جیت رہے ہیں۔ ہم جیت رہے ہیں " آخر کو آواز آئی " بدنصیب بادشاہ۔ ہیرولین کی بدنصیب رعایا " تب بادشاہ کو محسوس ہوا کہ وہ جنگ ہار گیا۔ مگر اب کوئی چارہ نہ تھا۔ کیونکہ یونگو بارڈی کے لوگ خیمہ میں گھس آئے اور اسے مار ڈالا ..."

میں بال وارنیفرڈ کی کتاب میں یہ قصہ پڑھ رہا تھا جب کہ "تازہ خبروں سے بھرے اخبار آئے۔ یہ خبریں سورج کی کرنوں کی طرح تھیں اور انہوں نے میری روح میں آگ لگا دی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس آگ سے جو میرے اندر موجود ہے میں قطب شمال تک تمام سمندروں میں آگ لگا سکتا ہوں۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ سارے سمندر پر کیک کی خوشبو کیوں آ رہی تھی۔ دریائے سین نے یہ خبر سمندر تک پہنچا دی تھی اور سمندر کی جل پریاں جو انسانی عظمت سے محبت کرتی ہیں' اپنے محلوں میں جانے کی دعوت کرنے لگیں اور کیک کی خوشبو پورے سمندر میں پھیل گئی۔

اے فرانس کے لوگو! تم آزادی کے اہل ہو کیونکہ آزادی تمہارے دلوں میں ہے۔ اس معنی میں تم اپنے اجداد سے مختلف ہو جنہوں نے اپنے کو صدیوں کی غلامی سے نکالا اور اپنی عظمت کے باوجود وہ ظلم بھی کئے جن پر انسان کے محافظ فرشتے نے اپنا منہ چھپا لیا۔ آج انسانوں کے ہاتھ دفاعی جنگ میں بہتے ہوئے خون سے رنگے ہیں۔ قوم نے خود اپنے دشمنوں کی مرہم پٹی کی اور جب یہ کام ختم ہوا تو وہ اپنے روزمرہ کے کام میں لگ گئی اور اپنے کام کی کوئی اجرت نہیں مانگی۔

ہیلی گولینڈ ۱۰ر اگست

لافائت، تزنگا، مرسیلز

میری امن کی خواہش ختم ہو گئی ہے۔ اب میں جان گیا ہوں کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میں انقلاب کا بیٹا ہوں اور انقلاب چاہتا ہوں۔ اب میری نظر ان چمکیلے ہتھیاروں پر ہے جس پر میری ماں نے منتر پڑھے ہیں۔ چمن کے پھولوں سے کہہ دو کہ میں اپنے سر پر جنگ کا تاج پہنوں گا۔ میں جنگی نغمے گاؤں گا' ایسے نغمے جس میں آگ

ہوگی اور جو بلندیوں سے بھڑکتے ہوئے ستاروں کی طرح گریں گے اور ہر تقدّس اور شرافت کا پردہ چاک کردیں گے ۔ میں ایک سرخوش اور نغمہ ہوں ایک تلوار اور شعلہ !

شاید میں پاگل ہوگیا ہوں ۔ ان خبروں نے میرے دماغ میں آگ بھردی ہے ۔ میرے تمام خیالات شعلوں کی لپیٹ میں ہیں ۔ میں اس آگ کو سمندر کے پانی سے بجھانے کی ناکام کوشش کرتا ہوں ۔ سمندر کا پانی بھی اسے نہیں بجھا سکتا ۔ لیکن باقی لوگوں کی حالت بھی تو مجھ سے زیادہ مختلف نہیں ہے حتیٰ کہ برلن والے بھی اس جھلسا دینے والی لُو سے متاثر ہیں ۔ اس سال یہ بہت بڑی تعداد میں یہاں آئے ہیں اور ایک جزیرے سے دوسرے جزیرہ تک پھیل گئے ہیں تاکہ سمجھنے والے یہ سمجھ لیں کہ پورے بحرۂ شمالی پر برلن والوں کا قبضہ ہے حتیٰ کہ بے چارے ہیلی گو لینڈ والے بھی حیران ہیں ۔ ایک ماہی گیر نے جو مجھے کل ایک جزیرے تک لے گیا تھا مجھ سے ہنس کر کہا تھا کہ " بے چارے عوام جیت گئے " جی ہاں یہ لوگ جذباتی ہیں اور یہ واقعات کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں ۔ فرد فون وارن ہیگن نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ لیپ زگ کی جنگ ابھی جاری تھی کہ میری خادمہ دوڑی ہوئی میرے کمرے میں آئی اور خوفزدہ آواز میں چیخی " شرفاء جنگ جیت گئے "

میں بالکل نہیں سو سکا ۔ میرا بوجھل دماغ خیالات کی کشمکش سے پھٹنے لگا اور میری آنکھوں کے سامنے طرح طرح کے مضحکہ خیز ہیولے بننے لگے کبھی وہ بے حد چھوٹے اور ننھے منّے سے ہوجاتے اور کبھی پھیل کر دیو قامت بن جاتے ۔ یہ ہیولے مجھے پاگل بنا رہے تھے ۔ کبھی میں نے محسوس کیا کہ میں خود ایک ہیولہ بن گیا ہوں اور میں جرمنی سے فرانس جارہا ہوں اور وہاں سے لمبی لمبی ٹانگوں کے ساتھ واپس آرہا ہوں ۔ مجھے یاد ہے کل رات اسی عالم میں جرمنی کی تمام ریاستوں اور صوبوں میں پھرتا رہا اور اپنے دستوں

کے دروازوں پر دستک دے کر شریف لوگوں کو نیند سے بیدار کرتا رہا تھا اور اکثر جب انہوں نے مجھے حیران نظروں سے دیکھا تو میں خود خوفزدہ ہوگیا، یہ نہیں سمجھ سکا کہ میں کیا چاہتا ہوں اور میں نے انہیں کیوں جگایا ہے۔ بہت سے ایسے بے فکروں نے جنہیں میں نے گہری نیند سے اٹھایا تھا صرف اتنا پوچھا کہ "اس وقت کیا بجا ہے"۔ مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ پیرس میں مرغ نے بانگ دے دی ہے۔

پیرس میں جولائی کے مقدس دن انسان کی بنیادی شرافت کے گواہ ہیں، ایسی شرافت جسے کبھی نیست و نابود نہیں کیا جا سکتا۔ ان دنوں کو جس نے دیکھا ہے وہ اب قوموں کے دوبارہ عروج کا قائل ہے۔ اے جولائی کے مقدس ایام! پیرس کے لوگ کتنے عظیم تھے۔ آسمانی دیوتاؤں نے خود اپنی زریں نشستوں کو خیرباد کہا اور پیرس کے شہری بن گئے لیکن انسانی خواہش اس سے بھی آگے بڑھ کر بیلجیم کے انقلاب کی محرک بنی جس نے پوتنز کی طرح کی ایک چال کی بنیاد پر کام کیا تھا۔ ایسا انتظام کیا گیا کہ آزادی کا درخت جنت میں بھی نہ بڑھ سکے۔

آزادی

لومبارڈ اور ٹسکن کی جمہوریتوں، ہسپانوی برادریوں اور جرمنی کی آزاد ریاستوں اور دوسرے ملکوں کی ابتدائی تاریخوں میں جدوجہد یا کشمکش کے جو واقعات ملتے ہیں، انہیں ہم عوامی بیداری کی تحریکیں قرار نہیں دے سکتے۔ وہ صرف ایسی کوششیں کہی جا سکتی ہیں جن کا مقصد آزادی یا عوامی حقوق کے حصول کے بجائے افراد اور اداروں کے لئے

محض مراعات حاصل کرنا تھا۔ نتیجتہً ہر چیز اس گردہی اور پنچائتی نظام میں مقید رہی۔

اصلاحات کے دَور سے اس جد وجہد میں روحانی اور مادّی دونوں مقاصد شامل ہوئے اور آزادی کا مطالبہ ایک بنیادی حق کے طور پر کیا گیا۔ پرانے مذہبی اقوال کی جگہ اصولوں نے لے لی اور جرمنی میں دہقانوں نے اور انگلستان میں اصلاح پسندوں نے ایسے اصولوں کے حوالے دینا شروع کئے جو ہمارے جدید اصولوں اور معقولیت پسندی کے عین مطابق تھے۔ اس کے بعد ہی یہ کہا جانے لگا کہ سب لوگ پیدائشی طور پر مساوی اور شرفاء میں سے ہیں۔ دولت گناہ ہے اور غریب بھی خدا کی جنت اور اس کے لطف و کرم کے حقدار ہیں۔

کسانوں نے ایک ہاتھ میں بائیبل اور دوسرے میں تلوار لے کر جنوبی جرمنی کی طرف پیش قدمی کی اور نورمبرگ کے اونچے اونچے ایوانوں کے مالک امراء سے کہہ دیا کہ آئندہ ریاست میں کوئی ایسا مکان باقی نہیں رہنے دیا جائے گا جو کسانوں کے جھونپڑوں سے مختلف ہو گا۔ انہوں نے مساوات کا مفہوم کتنا صحیح سمجھا تھا۔ اس وقت سے ہم فرانکونیا اور سوابیا میں مساوات کے اس اصول کو کارفرما دیکھتے ہیں جہاں چاندنی راتوں میں امراء کے محلّات کے کھنڈر ہمیں کسانوں کی اس جنگ کی یاد دلاتے اور ایک طرح کی روحانی تازگی بخشتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر ایک بالغ نظر انسان خوشی محسوس کرتا ہے جب کہ بچکانہ ذہن کے انسان ان سے یہ تاثر بھی لے سکتے ہیں کہ یہاں کس قدر کشت و خون ہوا ہزاروں انسان تہہ تیغ کئے گئے، بے شمار کو اذیتیں دی گئیں اور ہو سکتا ہے تصوّر کی آنکھوں سے کسانوں کے خون میں لت پت سروں کو دیکھ کر کوئی انتقامی جذبہ بھی بیدار ہو جائے۔

انگلستان اور اسکاٹ لینڈ میں ان کے بھائی نسبتاً زیادہ فائدے

میں رہے جہاں ان کی شکست کے اثرات اس طرح کے نہیں تھے۔ بلکہ ہمیں اب بھی وہاں ان کی حکمرانی کے آثار نظر آتے ہیں۔ البتہ وہ اسے برقرار نہیں رکھ سکے۔ حالات پھر پہلے کی طرح ہو گئے بلکہ دیکھا جائے تو برطانیہ میں کوئی سماجی انقلاب نہیں آیا اور آج بھی وہاں بورژوا طبقہ اور سیاسی ادارے اسی طرح ذات برادری اور گروہی نظام کے تحت قائم ہیں۔ جدید تہذیب کی روشنی وہاں پہنچی ضرور لیکن نہایت معمولی ۔ انگلستان اب بھی قرون وسطیٰ کا کوئی جدید نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ وہاں جو ترقی اور تبدیلی ہوئی وہ ایک عملی ضرورت کے طور پر کی گئی اسے اصول کے طور پر نہیں اپنایا گیا۔ انگلستان میں مذہبی اصلاحات بھی ادھوری ہی رہیں اسی طرح سیاسی اصلاحات بھی نامکمل رہیں، عوام کی نمائندگی کا طریقہ کار قطعی غیر مؤثر ہے، دولت کی بنیاد پر طبقات کی تقسیم کا سلسلہ ضرور ختم ہوا لیکن روائتی مراعات، شخصی حیثیتوں اور عدلیہ کے روبرو حیثیتوں کے فرق نے اسے ابھی تک برقرار رکھا ہے۔ قوانین کی حیثیت بھی ایسے خنجر کی سی ہے جو غیر محسوس طریقہ پر قتل عام کر رہا ہو۔ اس وقت روئے زمین پر سب سے زیادہ ٹیکس ادا کرنے والی قوم انگریزوں کی ہے۔ ان کا ضابطۂ فوجداری بھی ایسا ناقص ہے کہ لوگ آئے دن چند پیسوں کی خاطر قتل کرتے ہیں اور قانون سے بچ نکلتے ہیں۔ اگرچہ انگلستان میں حال ہی میں بہت سی اصلاحات کی گئی ہیں اور اب ووٹ کے ذریعے کبھی کبھا صنعتی شہروں کو بھی نمائندگی ملنے لگی ہے۔ اونچے طبقے کے علاوہ دوسرے طبقے بھی اب کچھ مراعات کے حقدار سمجھے جانے لگے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ایسی لیپا پوتی ہے جو ناپائیدار ہے، بالکل اسی طرح جس طرح انگلستان کا ایک بے وقوف درزی بھی یہ بات جانتا ہے کہ "پرانا لباس ایک دن چیتھڑوں میں بدل جائے گا۔

۔ کوئی شخص پرانے لباس میں نئے کپڑے کا پیوند نہیں لگاتا اور نہ ہی کوئی نئی شراب پرانی بوتل میں بھرتا ہے ماسوائے اس صورت کے کہ بوتل ٹوٹ جائے اور شراب بہنے لگے۔ ورنہ ہمیشہ نئی شراب نئی بوتلوں میں ہی ڈالی جاتی ہے اور اس طرح دونوں محفوظ رہتی ہیں ۔"

اس عظیم سچائی کا اظہار ایک ایسے مبلغِ اعظم نے کیا تھا جس نے بیت المقدس کی اشرافیت کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ اس کی آواز بعد کے پیرس کے قومی کنونشن کی سربراہ کانفرنس میں شریک ہونے والوں کی آواز میں کچھ مماثلت ہے جو یہ کہتے ہیں کہ محض اُوپری لیپا پوتی فضول ہے پورے سماجی نظام میں تبدیلی ہوگی، اسے نئے سرے سے ترتیب دیا جائے گا بالکل ایسے جیسے وہ نیا نیا پیدا ہوا ہو۔

میں انقلابِ فرانس کا ذکر کر رہا ہوں جو تاریخ عالم میں آزادی اور مساوات کے نظریوں کا مظہر ہے۔ ان نظریوں کی بنیاد ایسی معقولیت پر ہے جو ہر شخص کے ذہن میں ہوتی ہے اور جس کی بنیاد پر ایوانِ علم کی تعمیر ہوتی ہے۔ یہ اس روایتی آسمانی نظام سے بدرجہا بہتر ہے جس میں مخصوص لوگوں کے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے۔ آخرالذکر آسمانی نظام بھی جو بذاتِ خود اشرافی قسم کا تھا مراعات یافتہ لوگوں کی حکمرانی کے خلاف ایسی مؤثر جنگ کرنے کے قابل نہ تھا جیسی کہ موجودہ معقولیت پسندی کا نظریہ کر رہا ہے جس کی نوعیت قطعی جمہوری ہے۔ انقلاب کی تاریخ اس جدوجہد کی ایک جنگلی تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے جس میں کچھ نہ کچھ ہم سب نے ہی حصہ لیا ہے۔

اگرچہ دشمن کی تلواریں روز بروز کند ہوتی جارہی ہیں اور ہم بہترین مقام حاصل کر چکے ہیں لیکن ابھی ہم اس وقت تک فتح کا گیت نہیں گا سکتے جب تک کام پوری طرح مکمل نہ ہو جائے۔ آپ ہی سوچیئے کیا ہم عارضی جنگ بندی کے دوران لالٹینیں ہاتھ میں لے کر اپنے مُردوں کو دفن کرنے کے لئے میدانِ جنگ میں جا سکتے ہیں۔ ایسے میں تجہیز و تکفین کی رسوم اور فاتحہ

سوئم کا کیا مذکور ؟

ہمیں صداقت کے ان بڑے دشمنوں کے خلاف بھی جنگ کرنی ہے جو بہت چالاک ہیں اور آزادی کے سب سے بڑے ہیرو اور پہلے مبلغ اعظم کے بارے میں بھی غلط تاثر دینے سے نہیں چوکتے اور جب وہ اس کی عظمت سے انکار نہیں کر پاتے تو اسے دیوتاؤں میں شمار کر کے سب سے چھوٹا دیوتا بنا دیتے ہیں اور جو ان پادریوں سے لڑے گا اسے اس بات کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے کہ اس بے چارے کے نام کے ساتھ اتنے جھوٹ اور تہمتیں لگیں گی کہ اس کا حلیہ بگڑ جائے گا۔ لیکن جس طرح جنگ میں اُس جھنڈے کو سب سے زیادہ انعام کا مستحق سمجھا جاتا ہے جو گولیوں سے سب سے زیادہ چھلنی ہو اور جو بارُود کے دھوئیں کی وجہ سے انتہائی خستہ حال ہو گیا ہو چنانچہ اس جھنڈے کی مانند جس شخص پر سب سے زیادہ تہمتیں لگیں گی اور جس کا حلیہ سب سے زیادہ بگڑا ہوا ہو گا وہی آزادی کے معبد میں سب سے زیادہ قابلِ احترام ہو گا۔

انقلاب کے ہیروؤں کی طرح خود انقلاب کے واقعات کو نہایت غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ اسکول کے بچّوں کو انقلاب کے مظالم کی کہانیاں رٹائی گئی ہیں۔ اسی طرح نمائشوں میں بھی گلوٹین مشین کی تصویریں دکھائی گئیں۔ یہ مشین فرانس کے مشہور عالم سرجن ڈاکٹر ایم گلوٹین نے ایجاد کی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے ایسے لوگوں کے سروں کو تن سے جُدا کیا جا سکتا ہے جن کے دلوں میں بغض اور عناد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اس مشین کو اکثر ایسے مقاصد کے لئے استعمال بھی کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا استعمال صرف غداری، دغا اور فریب جیسی ناقابلِ علاج بیماریوں کے سلسلے میں ہی کیا گیا۔ اس میں مریض کو زیادہ دیر تک اذیتیں برداشت نہیں کرنی پڑتیں جیسا کہ شرفاء کے زمانہ قدیم میں ہزاروں شہریوں اور دہقانوں کو مسلسل

اذیتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ یہ ایک بڑی دہشتناک بات ہے کہ فرانسیسیوں نے یہ مشین سربراہ مملکت پر بھی استعمال کرڈالی اور یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس پر انہیں برادرکُشی کا مجرم گردانا جائے یا خودکشی کا۔ لیکن حالات کو پوری طرح مدِنظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ لوئی آف فرانس واقعات سے زیادہ جذبات سے مغلوب رہتا تھا۔ اسلئے جن لوگوں نے عوام کو اس سے قربانی لینے پر مجبور کیا اور جو خود بھی شہزادوں کا خون بہاتے رہے تھے' انہیں موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ صرف دو بادشاہ ایسے تھے جنہیں عوام نے ختم کیا۔ یہ دونوں عوام سے زیادہ شرفاء کے بادشاہ تھے اور انہیں زمانۂ امن میں مخصوص مفادات کے لئے نہیں بلکہ جنگ کے دوران اس وقت تہِ تیغ کیا گیا جب وہ اپنے پورے عروج پر تھی۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ ایک ہزار سے زیادہ بادشاہوں اور شہزادوں کو خودغرضی کی بنا پر شرفا اور پادریوں کی سازشوں کے تحت خنجر یا تلوار سے قتل کیا گیا یا زہر دے کر ہلاک کردیا گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ طبقے بادشاہوں کو قتل کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں اس لئے وہ خاص طور سے لوئی شش دہم اور چارلس اوّل کی موت پر مگرمچھ کے سے آنسو بہاتے ہیں۔ وہ بادشاہ بالآخر یہ بات جان لیں گے کہ عوام کے بادشاہ کی حیثیت سے اُن امرار کی بہ نسبت جن کی بغلوں میں چھُریاں رہتی تھیں قانون ان کا بہتر محافظ ثابت ہوسکتا تھا۔

یہی نہیں کہ انقلاب کے ہیروؤں اور خود انقلاب کو غلط رنگ میں پیش کیا گیا' بلکہ ہمارے پورے دَور اور ہمارے مقدس نظریات کو ایسی ڈھٹائی اور بے حیائی کے ساتھ جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی' اس طرح توڑمروڑ کر پیش کیا گیا کہ جب آپ ان لوگوں کی باتیں سُنیں یا ان کی کوئی تحریر پڑھیں تو آپ یہ محسوس کریں گے کہ گویا عوام بے وقوف تھے اور یہ کہ آزادی

ایک بُری چیز ہے۔ وہ بڑی مکاری سے آہیں بھریں گے اور اس بات پر افسوس ظاہر کریں گے کہ ہم لامذہب ہو گئے ہیں۔ ایک ایسے دَور کو جو ماضی اور مستقبل کے تمام ادوار سے افضل تھا اور جس نے ماضی کے گناہوں اور مستقبل کی خوشیوں کی خاطر اپنے آپ کو قربان کر دیا بُرا بھلا کہا گیا اور اس دَور کو بُرا بھلا کہنے والے وہ لوگ تھے جن کی گردنیں اپنے چھپے ہوئے گناہوں کے بوجھ سے جُھکی ہوئی تھیں۔ وہ مسیحا جو کانٹوں کا تاج سر پر پہن سکے اور صلیب کی اذیتیں برداشت کر سکے' صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے دور کے فریسیوں اور سیڈیوسیوں پر ہنسنا اور بات ہے اور حقیقت کو سہارا دینا جدا چیز ہے۔ سچائی اس وقت زیادہ مضبوطی سے قائم رہتی ہے جب اسے استہزار کا نشانہ بنایا جا رہا ہو۔ ہمارا عہد اس لحاظ سے اس سے مماثل ہے کہ فرانس کے وہ بچے جنہوں نے فضول اور مزاحیہ کتابیں لکھیں، ضرورت پڑنے پر سنجیدہ اور سخت رویہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ مثلاً ڈوکلوس یا حتیٰ کہ لوڈٹ ڈی کاڈرے بھی جنہوں نے نہایت فضول اور واہیات چیزیں لکھیں، ضرورت پڑنے پر آزادی کے لئے اُسی بہادری اور عزم کے ساتھ لڑتے جو حریت پسندوں کا شیوہ ہے لیکن بدقسمتی سے ان کا بھی کوئی مذہب نہیں تھا۔

اگر آزادی بھی کوئی ایسا ہی مذہب ہوتا جیسا کہ دوسرے مذاہب ہیں تو ہم اس کے پیروکار ہونے کی حیثیت سے شاید اس کے مخالفین کو جاہل اور لامذہب قرار دیتے۔

میں ایک بار پھر وہ الفاظ دُہراتا ہوں جن سے میں نے اس مضمون کا آغاز کیا تھا۔ یعنی آزادی ایک نیا مذہب ہے اور یہ ہمارے دَور کا مذہب ہے۔ اگرچہ اس مذہب کے خداوند، یسوع مسیح نہیں ہیں لیکن پھر بھی وہ اس کے سب سے بڑے مبلغ ہیں جن کا نام ان کے پیروؤں کے دلوں

میں روشن ہے۔ لیکن اس مرتبہ اس نئے مذہب کے لئے فرانس کے لوگوں
کو منتخب کیا گیا ہے اور اس مذہب کی پہلی آیتیں اور مناجاتیں ان ہی کی
زبان میں تحریر ہیں۔ پیرس اس مذہب کا بیت المقدس اور رائن، دریائے اردن
ہے جو آزادی کی مقدس سرزمین کو ملک فلسطین سے جدا کرتا ہے۔

لڈوِگ بورن

لڈوِگ بورن (۱۷۸۶ - ۱۸۳۷ء) نے ایک سیاسی کالم نگار اور صحافی کی حیثیت سے جمہوریت کی زبردست حمایت کی تھی۔ وہ جمہوریت کو سماجی اور روحانی آزادی کے لئے خشتِ اوّل سمجھتا تھا۔ وہ بھی اپنے دوسرے ہم نواؤں کی طرح ۱۸۳۰ء کے بعد سے پیرس ہی میں رہا۔ اس نے اپنے آگ لگا دینے والے مضمون "امیر اور غریب" میں اُن ہی خیالات کا اظہار کیا ہے جن کی بنیاد پر بعد میں کارل مارکس نے اپنے جامع نظام کا ڈھانچہ تیار کیا۔ بورن نے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کا آپس میں تعلق بیان کر کے یہ بتایا ہے کہ کس طرح امراء کا اونچا طبقہ سیاست میں بھی اپنا عمل دخل جاری رکھتا ہے اور اس طرح نچلے طبقوں کو آسائشوں سے محروم رکھ کر انہیں دبائے رکھتا ہے۔ اس طبقے کے لوگ اپنی دولت میں برابر اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اُن کی دولت میں اضافہ کرنے کے ذرائع بظاہر قانون کے دائرے میں ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ مجرمانہ ہوتے ہیں۔ بورن کے خیال کے مطابق یہی صورتِ حال خاص طور سے فرانس میں بھی موجود ہے جہاں صحیح قسم کی جمہوریت قائم کرنے کے لئے انقلاب کی راہ ہنوز کافی دور ہے۔

بورن نے اپنے "پیرس سے خطوط" (۱۸۳۲ - ۱۸۳۴ء) میں جولائی کے انقلابِ فرانس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جرمنی میں بھی ایک ایسے ہی انقلاب کی ضرورت ہے۔ جرمنی میں ان خطوط پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ جن خطوط کا ہم نے انتخاب کیا ہے ان میں یہ شکایت کی گئی ہے کہ جرمنی میں اخبارات آزاد نہیں ہیں اور حکومت نے یہ آزادی جہاں اس لئے نہیں دی ہے کہ وہ عوام کی تنقید سے خوفزدہ ہے وہاں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ جمہوری نظام کے مفہوم سے قطعی طور پر ناآشنا ہے۔

امیر اور غریب

امیروں کے خلاف غریبوں کی جنگ کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے اتنا واضح ہے کہ ہم خود کو بالکل اس کے درمیان موجود پاتے ہیں، اس جنگ کو روکا جاسکتا ہے اور دنیا میں قیام امن کی ضمانت دی جاسکتی ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ تمام حکومتیں بالکل ایک سے انداز میں اس تباہی و بربادی کو قریب لا رہی ہیں۔ جب سیاست دان کسی تباہی کو اپنے سر پر کھڑا دیکھتے ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے نمٹنے کے لئے انہوں نے وہ سب کچھ کر لیا ہے جو ان کے بس میں تھا۔ فرانس کی اسمبلی میں وہاں کے غریب عوام کا کوئی نمائندہ نہیں ہے۔ فرانس کے نئے آئین میں بھی پرانے پاگل پن، ناانصافیوں اور غیر مہذب پرانی سیاست کو برقرار رکھا گیا ہے۔ اس میں بھی ایسے لوازمات ہیں جن کے تحت صاحب جائداد ہی کو ووٹ دیا جاسکتا ہے اور وہ جن کے پاس کوئی جائداد نہیں ہے کسی عزت اور احترام کے بھی حقدار نہیں ہیں۔ انگلستان کے قانون اصلاحات کے ذریعے صرف متوسط طبقے کی حالت بہتر بنائی گئی ہے اور نچلے طبقوں کی غلامانہ حیثیت کو برقرار رکھا گیا ہے۔ پارلیمینٹ میں اور ایوانِ نمائندگان میں صرف اُمراء، صاحبِ جائداد، کارخانے دار اور نجی وسائل کے مالک ہی جا سکتے ہیں جنہیں صرف اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے اور جو کام کرنے والے لوگوں کے مفادات کی عین ضد ہوتا ہے۔ پرانے سیاست دانوں کے ذہنوں میں کبھی کبھی یہ خیال پانی کے بلبلے کی طرح ابھرتا ہے کہ نچلے طبقوں کو بھی عوام کی نمائندگی میں حصہ ملنا چاہیئے لیکن وہ کہتے یہ ہیں کہ جو لوگ قلاش ہوں اور جنہیں اپنے نقصان کا کوئی غم نہ ہو تو وہ ملک کی عام بھلائی کے کام ایمانداری سے انجام نہیں دے سکتے کوئی بھی دشمن ان کا ووٹ آسانی سے خرید سکتا ہے۔

وہ یہ بات اس لئے کہتے ہیں تاکہ وہ اپنے ذہن میں اُٹھنے والے خیال کی تردید کر سکیں۔ وہ یہ بات اس لئے بھی کہتے ہیں کہ انہیں پتہ ہے کہ غریبوں میں امیروں کی نسبت ایماندار افراد زیادہ ہوتے ہیں اور دوسرے لوگوں کی نسبت انہیں رشوت دے کر خریدنا آسان نہیں۔ وزراء بھی انہیں عوام کے نمائندوں کے درمیان دیکھنا نہیں چاہتے۔ ہم ان کے خفیہ رجسٹر دیکھ سکتے ہیں کہ کون ان کے پیرو کار ہیں، کون ان کے سیاسی گماشتے اور جاسوس ہیں۔ اور پھر ہمیں یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ زیادہ تر امراء نے اپنی خواہشات اور ہوس کو پورا کرنے کے لئے اپنے ضمیر کا سودا کیا یا غریبوں نے اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے اپنے ضمیر کی آواز کو دبا دیا۔ صرف امیر قوانین بناتے ہیں اور وہی ٹیکس نافذ کرتے ہیں اور پھر اس کا سب سے زیادہ بار غریبوں پر ڈال دیتے ہیں۔ یہ ناانصافیاں دیکھ کر ذہن بغاوت پر آمادہ ہوتا ہے۔ کبھی کسی شہر میں رہنے والے امیر نے آپ سے زائد ٹیکسوں کی شکایت کی ہے؟ اگر نہیں تو پھر ان ٹیکسوں کا سارا بوجھ کون برداشت کرتا ہے جن کی وجہ سے یورپ کے عوام کی کمر ٹوٹ گئی ہے؟ ظاہر ہے اس کا سارا بوجھ غریب مزدور پر پڑتا ہے۔ غریب دہقان کے اکلوتے لڑکے کو اپنے آقا زمیندار کا محافظ بننا پڑتا ہے۔ اور اگر وہ اس کا اہل نہ ہو تو اسے صرف پانچ کروڑ یومیہ پر کام کرنا پڑتا ہے۔ بیشتر ٹیکس ناگزیر ضروریاتِ زندگی پر لگائے جاتے ہیں اور امیروں کی عیاشیوں پر صرف اتنا ٹیکس لگتا ہے جتنا اس کی طبع نازک برداشت کر سکے۔ اسی طرح سرکاری قرضوں سے بھی امیر ہی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر امیر کارخانے دار کی ہر لڑکی کے پاس ترکی شال نہ ہو تو وہ اپنے آپ کو غریب اور مجبور سمجھنے لگتا ہے اور اپنی بے بسی کو دُور کرنے کے لئے وہ اپنے مزدوروں کے معاوضے میں کمی کر دیتا ہے۔ پیرس شہر کی سالانہ ضرورت چار کروڑ ہے تاکہ بڑے تاجروں اور سپلائی کرنے والوں کے حلوے مانڈے

چلتے رہیں۔ اب انہیں کچھ زیادہ رقم کی ضرورت ہے چنانچہ وہ کچھ دن سے
شراب، مکھن یا کوئلے پر نئے ٹیکس لگانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔
اس سے امیروں کے لئے کوئی فرق نہیں پڑے گا اور اس مرتبہ بھی غریب
آدمی ہی کو ٹیکس ادا کرنے پڑیں گے۔ شراب کی ایک بوتل پر پانچ سوس ٹیکس
ہے۔ یہ ٹیکس ہر بوتل پر وصول کیا جاتا ہے اور اس بات کا خیال بھی نہیں
رکھا جاتا کہ یہ شراب گھٹیا ہے جسے غریب پیتے ہیں یا بڑھیا جسے امراء پیتے
ہیں۔ بیس فرانک کی جو بوتل آتی ہے اس پر بھی وہی ٹیکس لگتا ہے جو آٹھ
سوس کی بوتل پر لگتا ہے۔ اوپرا میں گانے والی ہیروئن کو جس کی سالانہ
آمدنی چالیس ہزار فرانک ہے کچھ نہیں دینا پڑتا جب کہ گلی گلی ساز بجا کر بھیک
مانگنے والے ایک غریب آدمی کو اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ پولیس کے حوالے
کرنا پڑتا ہے۔ یہ ٹیکس ایک ایسی قابلِ نفرین لاٹری ہے جس کا سارا بوجھ غریب
طبقہ پر ہی پڑتا ہے۔ مملکت تین کروڑ روپے سالانہ مزدوروں کی جیب
سے ڈاکہ مار کر نکالتی ہے اور یہ وہ حکومت کرتی ہے جو چوروں اور
ڈاکوؤں کو سزا بھی دینا چاہتی ہے۔ یہی حکومت امیروں کو خبردار کرتی ہے کہ
وہ ان وحشی جانوروں یعنی عوام سے ہوشیار رہیں۔ اب سوچنا یہ ہے
کہ اگر یہ سب کچھ فرانس جیسے ملک میں ہوسکتا ہے جہاں اخبارات آزاد
ہیں اور وہ تشدّد کی بہت سی کارروائیوں کی روک تھام کر لیتے ہیں تو
اس جگہ کیا نہیں ہوتا ہوگا جہاں سب خاموش تماشائی ہیں، جہاں کوئی
شکایت نہیں کر سکتا اور ہر شخص صرف اسی غم سے آشنا ہوتا ہے جو اس پر
گذرتا ہے۔ وہاں غریبوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے اور انہیں کس طرح
حقیر سمجھا جاتا ہے ہمیں اس کا پتہ نہیں۔ روس، آسٹریا اور پروشیا کے
اخبارات کے اس پروپیگنڈے سے چلا جو انہوں نے ہیضے کی وبا کے بارے
میں شروع کیا تھا۔ انہوں نے ایسے لوگوں کا مذاق اُڑایا جو یہ سمجھتے تھے کہ

امرار ہمیں زہر دے کر مارنا چاہتے ہیں۔ اخبارات نے اسے مجذوب کی بڑ قرار دیا اور ہیضے کی اس وبا کو نفرت کی بیماری کی کڑوی دوا قرار دیا۔ لیکن اس مجذوب کی بڑ میں بھی حقیقت پوشیدہ تھی اور وہ یہ کہ امیر لوگ غریبوں کو ایک ایسا اوزار سمجھتے ہیں جسے وہ ضرورت پڑنے پر استعمال کریں۔ اور جب اس کی ضرورت باقی نہ رہے تو اسے اُٹھا کر پھینک دیں اور جب وہ استعمال کے قابل نہ رہے تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ یہی وہ حقیقت تھی جو ان مذاق اُڑانے والوں سے چھپی رہی۔ کیا امیروں نے اس موقع پر غریبوں سے نفرت کا اظہار نہیں کیا اور انہیں اپنے گھروں اور خاندانوں سے دُور رکھنے کے لئے ظالمانہ حربے استعمال نہیں کئے۔ اس وقت اخبارات نے بھی امرار کے دلالوں کا کردار ادا کیا اور پھر انہوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار نہیں کیا کہ یہ بیماری صرف غریبوں میں پھیل رہی ہے اور امرار اس سے محفوظ ہیں؟ عوام نے اس پر کیا سوچا ہوگا؟ لیکن وہ تو یہ جانتے ہیں کہ عوام میں اتنا شعور ہی نہیں کہ وہ کچھ سوچ سکیں لیکن وہ ایک بات یاد رکھیں کہ جب عوام نے سوچنا شروع کر دیا تو اس کا وہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ سب کچھ بھول جائیں گے۔ روس کے لوگ غضب ناک نہیں ہوتے وہ ہر حال میں مست رہتے ہیں، خواہ وہ کسی کو کوڑے لگائیں یا خود کوڑے کھائیں وہ اپنی کھال میں مست رہتے ہیں اس لئے وہاں ایک گڈریا ایسا بھی ہے جس کی عمر ایک سو اڑسٹھ (۱۶۸) سال ہے۔ ہم تہذیب یافتہ جرمن اتنے صحت مند نہیں ہیں لیکن پھر بھی ہمارے یہاں وہ کچھ ہو رہا ہے۔

"پیرس سے ایک خط"

کوٹا پیرس سے ایک اخبار نکالنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ یہ بات

مجھے ڈی نے بتائی ہے جسے اس نے اسی مقصد کے لئے یہاں بھیجا ہے۔ اگر یہ منصوبہ پورا ہوگیا تو یہ اس کے لئے نعمت ثابت ہوگا۔ یہ آدمی اپنی دولت، اپنی سرگرمیوں، تجارتی حلقوں اور اپنے تعلقات کے ذریعہ کیا کچھ نہیں کرسکتا ہے۔ اسے کم ہمت اور بزدل قلم کاروں میں جرأت پیدا کرنے کا فن بھی آتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ رازہائے درون پردہ کس طرح معلوم کئے جاتے ہیں۔ جب میں سنسرشپ کے بارے میں سوچتا ہوں تو اپنا سر پیٹ لینے کو دل چاہتا ہے۔ کسی کی حوصلہ شکنی کے لئے یہی کافی ہے۔ اخبارات کی آزادی فتح نہیں ہے اور نہ ہی یہ جنگ ہے بلکہ یہ وہ ذریعہ ہے جو لڑائی کے لئے افراد کو مسلح کرتا ہے لیکن اب سوال یہ ہے کہ جب تک جنگ نہ ہو تو اس وقت تک فتح کیسی اور یہ کہ ہتھیاروں کے بغیر لڑائی کیسے ہوسکتی ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں کسی کو پاگل کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں خالی ہاتھوں سے اپنا دفاع کرنا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے ہمیں کبھی پریس کی آزادی عطا نہیں کریں گے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں کسی حاکم یا اس کے مشیروں کی ناانصافیوں کو پسند نہیں کروں گا اور یہ کہ چونکہ ہر معاملے میں اور ہر جگہ برائی موجود ہے اس لئے پریس کے ذریعہ ہمیشہ ان کا احتساب کرتا رہوں گا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ چاہے اس طرح حکومت کریں جس طرح فرشتے جنت کا نظام چلاتے ہیں اور سب سے زیادہ مطالبات پیش کرنے والے شہریوں کو بھی شکایات کا موقع نہ ملے، تب بھی وہ اخبارات کو آزادی نہیں دیں گے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان کی اُلّو جیسی فطرت ہے جو دن کی روشنی کو برداشت نہیں کرسکتا یا وہ ان بھوتوں کی طرح ہیں جو مُرغ کی اذان کے ساتھ ہی غائب ہوجاتے ہیں۔

رابرٹ پرُوز

رابرٹ پروز (۱۸۱۶ - ۱۸۷۲ء) نے جوایک صحافی، ادیب اور ادبی مؤرخ ہے، اپنے مضمون "انقلابِ فرانس" میں ۱۷۸۹ء کی کاروائی کی ایک بار پھر تعریف کی ہے اور اس کے اصولوں کو پوری طرح سراہا اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ پرُوز نے اپنے مضمون "رجعت پسند رومانیت" میں نوجوان جرمنی" کے دوسرے تمام مصنّفین کی طرح گوئٹے اور رومانیت پسند شاعروں کی مخالفت کی ہے۔ اس میں رومانی تحریک کی بعض اہم خصوصیات کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن انہیں تعصّب کے ساتھ توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا یا ان کے اصولوں کو غلط سمجھا گیا ہے۔ بہر حال اس تنقیدی جائزے میں "مغربی جرمنی" کے گروپ کے اپنے نظریات بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔

اِنقلابِ فرانس

اٹھارہویں صدی کا درخت جب اپنے برگ دبار پوری طرح لایا تو اس کا پھل ہمیں اس صدی کے آخر میں انقلابِ فرانس کی صورت میں ملا۔

انقلابِ فرانس کی اہمیت پر بار بار زور دینے کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہے کہ اب بھی کچھ لوگ جن میں صرف عوام، پولیس والے، سنسر کرنے والے اور سی۔ آئی۔ ڈی کے حکام ہی نہیں بلکہ دانشور مورخ، اور سیاستدان بھی شامل ہیں مختلف طریقوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انقلابِ فرانس کی وجہ محض یہ تھی کہ فرانس کے لوگ فطرتاً نافرمان ہیں۔ یا یہ کہ ٹیکس بہت زیادہ تھے، اناج کی فصل تباہ ہوگئی تھی یا یہ کہ فلاں شخص وزیر ہوگیا تھا یا فلاں شخص وزیر نہیں بن سکا تھا اور اگر لوئی شانزدہم یہ کرلیتا یا وہ نہ کرتا یا یہ کہ حالات یہ رُخ نہیں وہ

رُخ اختیار کر لیتے تو انقلاب نہ آتا۔ بالفاظ دیگر اگر اس وقت فرانس میں ایک دلیر جرمن پروفیسر یا ذہین جرمن سیاستداں ہوتا تو حالات اس سے بالکل مختلف ہوتے اور شاید لوئی شانزدہم یا اس کے پوتے آج بھی فرانس پر حکومت کر رہے ہوتے اور نیپولین؟ وہ شاید ایک ریٹائرڈ میجر ہوتا۔ اس لئے ایک جرمن پروفیسر کی ذہانت اور دوربینی کا شکریہ۔

میں یہ کہتا ہوں کہ انقلاب فرانس کا واقعہ اتنا معمولی نہیں ہے جیساکہ ہم سنتے ہیں۔ اس لئے بار بار یہ بات دہرائے جانے کی مستحق ہے کہ یہ انقلاب صرف فرانس کا انقلاب نہیں تھا۔ اس کا تعلق پوری دنیا سے ہے اور یہ تاریخ کا انقلاب اور ایک نئے دور کا آغاز ہے۔

انتہا یہ ہے کہ ہم جرمن لوگ بھی جو بڑے وفادار اور پُر امن ہیں اور جن کو اپنی خامیوں کا احساس ہے، اس خیال سے پریشان ہو سکتے ہیں کہ کہیں یہی سب کچھ یہاں بھی نہ ہو۔ اب یہ سوچنا بے کار ہے کیونکہ ہم اس کی زد سے نہیں بچ سکتے۔ اس انقلاب کے کچھ پھل ہم بھی چکھ چکے ہیں حالانکہ ہم نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ یہ ایک ایسا انقلاب ہے جو پوری دُنیا پر صبح کے سرخ ستارے کی طرح چمک رہا ہے اور جو ایک نئے اور خوش حال دَور کا نقطۂ آغاز ہے۔ انقلاب کے جو پھل ہمیں ملے ہیں وہ آزادی اور ثقافت کے وہی نظریات ہیں جن کے تحت کہا جاتا ہے کہ تمام انسان پیدائشی طور پر مساوی اور آزاد ہیں اور جن کا اظہار پوری اٹھارہویں صدی میں ہمارے شاعر اور مفکّر کرتے رہے ہیں۔ شعروں، نغموں اور مفکّروں اور فلسفیوں کے پیش کردہ تمام نظاموں اور نظریات میں اس کا اظہار ہوا ہے لیکن اس طرح جس طرح ایک بچّہ الفاظ کی تلاش کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ تُوتلی زبان میں ہے۔ بہرحال یہ بھی غنیمت ہے کہ ہم اس حقیقت کو تلاش تو کرتے ہیں جسے اس صدی

کے آخر میں فرانس میں تسلیم کیا گیا اور جس کا اظہار فرانس کے قومی نغمے میں قابلِ فخر موت کی خواہش کی صورت میں کیا گیا ہے۔ ہمارے ذہنوں پر سب سے زیادہ اثر جس چیز کا پڑتا ہے وہ گلوٹین مشین سے ٹپکنے والے خون کے وہ قطرے ہیں جن کا احتساب کیا گیا تھا۔

واقعات نے ایسا خوفناک رُخ اختیار کیا کہ آزادی کے فرشتے کو جو دنیا بھر کے عوام کو مسرت اور خوش حالی کا پیغام دینے کے لئے دنیا کا چکر لگانے نکلا اپنے پاکیزہ لباس کو خون کے دھبوں سے بھی آلودہ کرنا پڑا اور یہ کہ ہماری غلامی کی تمام زنجیروں کو نرمی کے ساتھ ڈھیلا کرنے اور توڑنے کے بجائے کلہاڑی کی سخت ضربیں لگا کر انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرنا پڑا لیکن اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ آزادی کا مفہوم ہمیشہ قتل و غارت گری نہیں ہوتا اس لئے یہ جو کچھ ہوا اس میں ان لوگوں کا قصور ہے جنہوں نے انقلاب کی حیثیت کو غلط رنگ میں دیکھا، عروج کو زوال سمجھا اور صبح کی روشنی کو بھڑکتے ہوئے شعلوں کی روشنی سمجھا۔ جب ایک بوائلر پھٹتا ہے تو اس میں اس بھاپ کا کوئی قصور نہیں ہوتا جس کے دباؤ سے وہ پھٹا اور نہ خود بوائلر کا کوئی قصور ہوتا ہے۔ قصور اس شخص کا ہوتا ہے جس نے بوائلر کو ضرورت سے زیادہ گرم کیا اور بھاپ کا دباؤ بڑھا کر حفاظتی والو کھولنا بھول گیا نتیجہ یہ ہوا کہ بوائلر پھٹ گیا۔

لہٰذا ہمیں انقلاب کی اس خونی تصویر کو دیکھ کر گھبرانا نہیں چاہیئے اور نہ فرانسیسیوں کی بدقسمتی اور اٹھارہویں صدی کے ان واقعات پر اظہارِ افسوس کرنا چاہیئے جو اس انتہا کو پہنچ گئے، بلکہ تاریخ کی تلخ حقیقتوں کو سمجھنا اور ان سے سبق حاصل کرنا چاہیئے، چاہے وہ سبق محض اتنا ہی کیوں نہ ہو کہ بوائلر کو ضرورت سے زیادہ گرم نہیں کرنا چاہیئے۔

چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انقلاب فرانس زندگی، بالغ نظری اور آزادی

کے ان نظریوں کی عملی شکل ہے جو ہمیں پوری اٹھارہویں صدی میں جاری و ساری ملتے ہیں۔ اس کے ذریعہ نظریئے نے حقیقت کا، ادب نے سیاست کا، اور ثقافت نے عمل کا جامہ پہنا۔

رجعت پسند رومانیت

رومان پسندی نے ادب میں ایک اور ادب کی تخلیق کی ہے اور جاہل اور بے ذوق عوام کے مقابلے میں قوم میں ایک مراعات یافتہ چھوٹا طبقہ پیدا کیا ہے۔ ان میں محبّت اس خوبصورت جذبے اس تحمل مزاج اور ترغیبی عنصر کی کمی تھی جس کی بدولت فشئے اور خصوصاً شیلر عظیم فن کار بنے اور جس کے بغیر عام طور سے زندگی کے کسی بھی شعبے میں بڑا آدمی بننا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ کیونکہ یہی تمام عظمتوں کی بنیاد ہے۔

اس معاملے میں اور دوسری چیزوں کی طرح رومان پسندی کا تعلق گوئٹے سے قائم ہوجاتا ہے جس کی حیثیت پر اکثر اور بہت زیادہ بحث ہوئی ہے۔

اس سے میری مراد گوئٹے کے ذاتی رجحان سے نہیں ہے جس میں وہ معاشرے میں گھلنے ملنے کے بجائے کسی ریاست کے وزیر یا امیر کی نمائندگی کرتا ہے میری مراد اس کی ادبی حیثیت سے ہے جس میں وہ عوام کا مذاق اڑاتا اور انہیں حقارت سے ٹھکراتا ہے اور جس کی وجہ سے اس کے اور شیلر کے درمیان ایک نمایاں فرق قائم ہوجاتا ہے۔ گوئٹے کے معاملہ میں (جیساکہ میں نے ابھی بتایا) یہ صورتِ حال اس کی خودپسندی کی وجہ سے پیدا ہوئی جس نے اُسے دوسروں سے بے نیاز کردیا تھا۔

دوسری طرف رومان پسندوں کا جہاں تک تعلق ہے انھوں نے عوام کو حقارت کی نظر سے محض اس لئے نہیں دیکھا کہ وہ کوئی بہت عقلمند

انسان تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ عوام بھی اتنے سادہ لوح تھے۔ گوئٹے کا یہ مقولہ کہ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو' ان کے نزدیک اشرافیت کی انتہا پر جاکر یہ ہوگیا تھا کہ میں زندہ ہوں اور باقی لوگ زندگی کا تصور ہی کرتے ہیں۔ گوئٹے کے خیالات خود اس کے اپنے احساسات کا مظہر تھے' اس نے دنیا کو برداشت کیا اور اس سے لطف اٹھایا جب کہ رومان پسند دوسروں سے بالکل کٹ کر رہ گئے اور انہوں نے دُنیا کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور اس کا مضحکہ اُڑایا۔

اب چونکہ رومان پسندوں نے اپنے آپ کو باقی لوگوں کی نسبت زیادہ بہتر، عقلمند اور ذہین سمجھ کر عام لوگوں سے اپنے آپ کو بالکل الگ تھلگ کرلیا ہے اس لئے نتیجتاً ان کے علیحدہ گروہ اور طبقے بن گئے ہیں اور انہوں نے ایسا طرزِ عمل اختیار کیا کہ وہ ان عوام میں گھُلنے ملنے نہ پائیں جنہیں وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

رومان پسند ہمارے ادب میں صحیح معنوں میں علیحدگی پسند ہیں۔ اگرچہ علیحدگی پسندی اور طبقاتی پسندیدگی کی اِکّادُکّا مثالیں ماضی میں بھی ملتی ہیں لیکن وہ انفرادی سطح پر ذہنی فتور یا نفسیاتی الجھنوں کا نتیجہ ہیں ۔ یہ رومان پسند ہی تھے جنہوں نے پہلی بار باضابطہ طور پر کھلے عام ایسی ادبی سازش اور ذاتی دلچسپی کے فن پاروں کا مظاہرہ کیا جو شاید پہلے بھی ظاہر کئے جاتے رہے ہوں لیکن چوری چھپے، لیکن اب انہیں بڑے پیمانہ پر منظم پریس کے ذریعہ سے پبلسٹی دی گئی اور پہلی بار عوام کو ادب میں بدنامیوں کا تجربہ ہوا۔

طبقاتی برتری کا یہ رجحان ادب تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ یہ ہماری سماجی زندگی اور حتیٰ کہ گھریلو زندگی میں بھی سرایت کرگیا اور اس کی یہ خصوصیت زیادہ بدتر تھی۔ ادب، فن اور ڈراموں میں سماجی حالات سے بے نیازی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پُر تکلف چائے پارٹیوں میں بھی ملک، قوم اور شہریوں کے مسائل اور تاریخی واقعات کا کوئی ذکر نہیں ہوتا جہاں لوگ

ذہنی آسودگی اور مسرت" کے لئے اکٹھا ہوتے تھے۔ ان محفلوں میں لوگ کسی کتاب یا فن کی نمائش دیکھنے یا کسی معروف شخصیت سے ملنے کے لئے کسی اندرونی جذبہ کے تحت نہیں آتے تھے بلکہ اس لئے آتے تھے کہ یہ ایک فیشن تھا اور اس طرح وہ نہایت مہذب اور شریف سمجھے جاتے تھے۔ اس میں وہ کتنے بور ہوتے ہوں گے اس کا انہوں نے کبھی اظہار نہیں کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ جمالیاتی بوریت کی ایک بدترین صورت تھی۔

آگے چل کر یہی رومان پسند اپنے اس مصنوعی ماحول میں جسے انہوں نے زندگی کے تمام مثبت پہلوؤں سے جدا کر کے خود تخلیق کیا تھا، تسکین کا کوئی سامان پیدا نہ کر سکے۔ چونکہ انہوں نے زندگی کی بنیادی قدروں، روایتوں اور فطرت اور تاریخ کی بنیاد سے انکار کیا تھا۔ اس لئے انہیں اپنے لئے ایک مصنوعی بنیاد فراہم کرنی پڑی جو زندگی کی حقیقی روح سے محروم تھی۔

یہاں ہمیں واضح طور سے تین سمتیں ایسی ملتی ہیں جن پر چل کر ادب نے غلط راہیں اختیار کیں۔ یہ ادب اس راستے پر چلنے کو تیار نہ تھا جو تاریخ کا راستہ ہے یا جو آزادی کا راستہ ہے۔ عوام کی عمومی حالت کے پیش نظر اس راستے کو اختیار کرنے سے قاصر تھا جو دراصل حسن کی راہ بھی ہے۔

پہلی سمت تو وہ ہے جس میں قرون وسطیٰ کے لئے یکطرفہ اور تاثراتی پسندیدگی یا ترجیح کا رجحان پایا جاتا ہے۔ قرون وسطیٰ میں اختلاف کی وہ حیثیت نہیں تھی جو آج ہمارے جدید دور میں ہے اور جس کی وجہ سے ایک ہل چل مچی ہوئی ہے بلکہ یہ اختلاف اس زمانے میں زیرِ زمین سویا ہوا تھا۔ اس وقت اس نے کبھی کبھار خواب کی سی کیفیت میں اچانک جُنبش ضرور لی جب کہ اس گمبھیر سناٹے میں پیغمبرانہ انداز میں کچھ علیحدہ اور ناقابل فہم آوازیں سنائی دیں۔ اس میں ایک نئے اور خوش آئند

دَور کی نوید سنائی گئی لیکن پھر بھی کسی تاریخی بحران نے انفرادی سکون کو ختم نہیں کیا۔ انہوں نے ایک مکمل عہدِ انسانی کو صرف تصوّر اور خواب میں ہی دیکھا تھا۔ قدیم دُنیا اپنی تازگی، قوت اور صحت بخش حُسن کے ساتھ انہیں اپنے نئے دَور میں متاثر نہ کر سکی؛ ان کی مریضانہ محبّت، ان کی بے مقصد جدوجہد اور صداقت سے عاری جذباتیت نے انہیں خود بخود قرونِ وسطیٰ کی مبہم اور بگڑی ہوئی ہیئتوں کی طرف مائل کر دیا۔

اس پر قومی عنصر مستزاد تھا۔

لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی مراد کس قومیت سے ہے؟ وہ جرمنی کہاں ہے جس کی وہ بات کرتے ہیں؟ اور وہ کون سے عوامی ادارے اور تاریخی اقدار ہیں جن کی وہ ہمیں تلقین کرتے ہیں؟ کیا وہ اس طرح جدید دَور کے تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے بجائے ہمارے سر پر قرونِ وسطیٰ کا داغدار اور جھوٹا ماضی تھوپنے کی کوشش نہیں کر رہے؟ ہمیں امید رکھنا چاہیئے کہ مستقبل کا سورج ضرور طلوع ہوگا اور اس کی آزادی دلانے والی کرنیں تمام افسوسناک سایوں اور اندھیروں کو ختم کر دیں گی۔

دوسری چیز جس کی طرف رومان پسند مائل ہیں وہ کیتھولک مذہب ہے جسے وہ اپنے فن کا مرکزی نقطہ سمجھتے ہیں کیتھولک مذہب سے ان کی یہ وابستگی محض اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ قرونِ وسطیٰ سے متاثر ہیں یا یہ کہ وہ جنوبی علاقوں کے ادب خصوصاً ہسپانوی ادب کو بہتر سمجھتے ہیں اور نہ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ وہ قرونِ وسطیٰ کے کلیسا کا دور یہاں نافذ کرنا چاہتے ہیں جس کی تعریف و توصیف میں وہ رطب اللسان رہتے ہیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ سے مطمئن نہیں ہیں، وہ اخلاقی کمزوری کا شکار رہیں اور جب وہ ہزاروں غلطیاں کر چکتے ہیں تو

اپنی نامکمل اور شکستہ شخصیت کو کیتھولک مذہب کی گود میں گرا دیتے ہیں۔ رومانی نظریئے کے بڑے بڑے حامیوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ان سے بلند تر تھے جنہوں نے کیتھولک مذہب کا کھلم کھلا پرچار کیا اور جن میں سے بیشتر کیتھولک گھرانوں میں پیدا ہوئے کیونکہ یہ لوگ خود پروٹسٹنٹ تھے۔ جو بعد میں کیتھولک ہوئے ان کی پریشان حال روحوں نے طوفان کے بعد کیتھولک مذہب کی آغوش میں پناہ حاصل کی تھی۔

تیسری چیز جو رومان پسندوں نے کی وہ یہ تھی کہ انہوں نے ادب کو ادب کے ذریعہ پروان چڑھایا۔ یعنی انہوں نے چھپی ہوئی کتابوں کے بارے میں کتابیں لکھیں، اسی طرح پرانی نظموں اور پرانے طربیہ ڈراموں پر بھی نظمیں اور ڈرامے لکھے۔ ایسے ادب میں مواد کی کمی رہی اور ان کے پاس کوئی ایسا موضوع نہ تھا جسے وہ اس طرح پیش کرتے کہ اس کا کوئی اثر پڑتا۔ نتیجۃً ایسے ناول اور ڈرامے لکھے گئے جن میں زندگی کی حقیقتوں یا قوموں کے عروج وزوال کی عکاسی کے بجائے ادبی جنگوں اور جمالیاتی تنازعوں کو پیش کیا گیا تھا اور جن میں اتنی ذہانت کا اظہار بھی نہیں تھا جو نقل اتارنے کے لئے ضروری ہے۔

انہیں ان تمام کوششوں میں یقینی طور پر مفاد عامہ اور عوام سے ہمدردی کو خیرباد کہنا پڑا اور اس طرح وہ عناصر جن سے رومان پسندوں نے ادب کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی تھی، اور جنہیں ہم عوام کہہ سکتے ہیں، ادب پر اس طرح اثر انداز ہوئے کہ اسے فن کی بنیاد سے ہی محروم کر دیا جو اس ادب کا مرکزی نقطہ بن سکتی تھی۔

اڈولف گلاس برینر

اڈولف گلاسبرینر (۱۸۱۰ - ۱۸۷۶) کو اپنی جوانی کے دنوں میں ایک صحافی اور مصنّف کی حیثیت سے ان آزاد تحریروں کی وجہ سے ایک بار سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اپنی بعد کی تحریروں کی وجہ سے وہ برلن کے مزاحیہ لوک ادب کا بانی کہلایا۔ ہم اس کی تحریر کا جو اقتباس یہاں پیش کر رہے ہیں اس میں اس نے اپنے زمانے کے خیالات کو عجیب انداز میں ایک سبق آموز کہانی کی طرح پیش کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے کے جرمنی میں رجعت پسندوں کی متحدہ قوتیں کس طرح آزادی کے خیال تک کو دبانے کی کوششیں کر رہی تھیں۔

رات تھی ـــــــ اندھیری رات

وہ ایک اندھیری رات تھی جب میں نے ایک بہت بڑا پالنا دیکھا تھا۔ اس کے چاروں طرف پہاڑ تھے اور اس میں ایک اچھی اور بہادر قوم محوِ استراحت تھی۔ ان میں سے ایک پہاڑ پر ایک اعلیٰ افسر بیٹھا تھا۔ اس نے پالنے کو جھونکا دیا اور ایک لوری گنگنانے لگا۔ تاکہ قوم سو جائے اور جب آسمان پر ستارہ چمکا تو وہ اوپر چڑھ گیا اور اس ستارے کو بجھا دیا تاکہ کہیں اس کی روشن کرنیں بچّوں کی آنکھوں پر نہ پڑیں۔ اس نے تمام تاروں کو بجھا دیا جس کے بعد مکمل تاریکی چھا گئی، قبر کی سی تاریکی۔

لیکن کہیں دُور سے بادل آئے، ان بادلوں میں خوبصورت خواب چھُپے ہوئے تھے، یہ بادل دُنیا کے لئے آزادی اور محبت کے گیت گا رہے تھے۔ ایسا لگا جیسے بچّوں نے یہ گیت سُن لئے ہوں انہوں نے کروٹ بدلی اور مسکرائے، گیت اور زیادہ سریلے ہو گئے۔ یہاں تک کہ بچّے جاگ گئے، انہوں نے اپنے ہاتھ خوابوں کی طرف پھیلا دئے۔

اعلیٰ افسر کو غصہ آگیا اس نے ان سب کو پالنے میں باندھ دیا اور بہت سے لوگوں کو اپنی مدد کے لئے بلایا۔ یہ لوگ سیاہ خوفناک چہروں والے تھے اور وہ کالے رنگ کی لمبی لمبی قبائیں پہنے ہوئے تھے۔

سیاہ فام لوگ پالنے کے چاروں طرف کھڑے ہو گئے انہوں نے میٹھے خوابوں والے بادلوں کا پیچھا کیا اور انہیں بھگا دیا۔ انہوں نے بچوں سے کہا کہ عبادت کرو اور سو جاؤ'۔ سوؤ اور عبادت کرو کیونکہ خدا کی یہی مرضی ہے جس نے انہیں یہاں بھیجا ہے۔

بچے ان سیاہ شکلوں سے ڈر گئے اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ تب ان آدمیوں نے اپنی اونچی آوازوں میں بھوتوں کی طرح گانا شروع کر دیا۔

ہم نے ساری دانش وری کا گلا گھونٹ دیا
اور انسانی ذہن کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔
ہم نے روشنی کو ختم کر دیا
اے زہن کے سپوتو، سو جاؤ اور عبادت کرو
اپنے رب کی عبادت کرو
وہ انہیں نیست و نابود کر دے گا جو زنجیریں توڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔
ہمارے نظریات اور خیالات خدا کی طرف سے آتے ہیں
لیکن یہ وہ نظریات نہیں ہوتے جن میں حکومت کے جبر و قہر کے
خلاف اظہارِ نفرت کیا گیا ہو
صرف ایک خیال کی اجازت ہے
اور اس کی اجازت بھی بادشاہِ وقت کو ہے کہ
صرف وہی آزاد ہے
پہاڑوں کی اونچی اونچی چوٹیوں سے بھی اوپر
ایک عذاب ان لوگوں کا منتظر ہے۔

جو یہاں خوش اور آزاد ہیں
اور جو لوگ کچھ نہیں سوچتے اور ہماری طرح
صرف سوتے اور عبادت کرتے ہیں اور
سلطنت کے وقار میں اضافہ کرتے ہیں، بخشے جائیں گے

بچے ان بھوت جیسے لوگوں سے اور ڈر گئے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں زیادہ زور سے بند کر لیں۔ وہ پھر سو گئے اور میٹھے اور سریلے نغموں کے خواب دیکھنے لگے۔ اور جب ان آدمیوں نے دیکھا کہ لوگ گہری نیند سو گئے ہیں تو انہوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور حقارت سے ان کی طرف دیکھا۔ تب اعلیٰ افسر نے پالنے کو پھر جھونکا دیا اور لوری گانے لگا۔

جارج بُوشنر

جارج بُوشنر (۱۸۱۳ - ۱۸۳۷) نے طب اور طبعی سائنس کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ نوعمری ہی میں حزب اختلاف میں شامل ہوگیا تھا۔ اس نے ۱۸۳۴ء میں "انجمن حقوق انسانی" کے نام سے ایک خفیہ تنظیم قائم کی تھی جس کا مقصد رجعت پسندانہ حالات کو انقلابی طور پر تبدیل کرنا تھا۔ اس کے سیاسی پمفلٹ "ہیس کا دیہی پیغامبر" میں باغیانہ سوشلسٹ نظریات کا پرتو ملتا ہے۔ اس کی اشاعت پر اس کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری ہو گئے تھے۔ ۱۸۳۵ء میں وہ جرمنی سے فرار ہوگیا۔ پہلے وہ اسٹراسبورگ گیا اور پھر زیورچ پہنچ گیا جہاں وہ یونیورسٹی میں لیکچرار ہوگیا۔ وہاں اس کا تئیس سال کی عمر میں میعادی بخار کی وجہ سے انتقال ہوگیا۔

بُوشنر نے چند مگر اعلیٰ پائے کی تحریریں چھوڑی ہیں، یہ تحریریں خاصی فلسفیانہ ہیں۔ اس نے حقیقت کا جس گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اس نے اسے کافی قنوطیت پسند اور باغیانہ خیالات کا مالک بنا دیا تھا۔ بُوشنر نے ایک طرف انسان کو تاریخ اور سماج کی قوتوں کے آگے ایک بے بس پرندہ ظاہر کیا ہے (جیساکہ اس کے ڈرامے "ووزیک" میں ہے) اور دوسری طرف وہ انسان کے وجود کی حقیقت اور مفہوم کی تلاش میں بھی سرگرداں نظر آتا ہے۔

یہی وہ پس منظر ہے جو اس کے اُن خطوط میں دکھائی دیتا ہے جس میں بُوشنر خوشیوں کی تمنا کرتا نظر آتا ہے لیکن ساتھ ہی اسے یہ خوف بھی ہے کہ اس کی خوشیاں تباہ ہو جائیں گی۔ مارچ ۱۸۳۴ء کا خط اس نے اپنی محبوبہ وِلے مائین جیگلے کو لکھا ہے جس سے اس نے خفیہ طریقے سے منگنی کی تھی۔ وِلے مائین کے نام جنوری ۱۸۳۷ء کا دوسرا خط بُوشنر نے اپنی موت سے صرف چند ہفتے پہلے لکھا تھا۔ نومبر ۱۸۳۶ء کو اس نے زیورچ سے اپنے

گھر والوں کو خط لکھا جس میں اس نے جرمنی کے حالات کا سوئٹزرلینڈ کے حالات سے مقابلہ کیا ہے جنہیں وہ خوش آئند سمجھتا ہے۔ اپنے طالب علم ساتھی کی موت کی غلط خبر کے حوالے سے وہ اس امید کے ساتھ اپنا خط ختم کرتا ہے کہ جرمنی میں بھی انقلابی تبدیلیاں آئیں گی۔

منگیتر کے نام خط

مارچ ۴۴ ۱۸ء

عزیز از جان! میں تمہاری طرف سے فکرمند ہوں۔ اگر مجھے تمہاری خیریت معلوم نہ ہو تو میں پریشان ہو جاتا ہوں اب میں ہر روز لکھتا ہوں، کل ہی میں نے ایک خط شروع کیا ہے۔ میرا تو یہی ارادہ ہے کہ میں ڈارمسٹیٹ جانے کے بجائے سیدھا اسٹراسبورگ پہنچوں۔ اگر تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو میں چند لمحوں میں وہاں موجود ہوں گا لیکن ایسے خیالات سے کیا حاصل؟ یہ میرے لئے معمہ ہیں۔ میرا چہرہ ایسٹر کے انڈے کی طرح ہے جس میں خوشی سُرخ دھبے ڈال دیتی ہے تاکہ وہ ٹوٹ جائے۔ میں نفرت انگیز خیالات کا اظہار کر رہا ہوں جو تم پر گراں ہوں گے اور تمہارے بخار میں اضافہ کر دیں گے۔ لیکن نہیں، میں کسی چیز کو نہیں مانتا۔ یہ محض پرانے اور مستقل درد کے اثرات ہیں۔ بوڑھے اور مدقوق لوگوں کے لئے بادِ بہاری کا ہلکا سا جھونکا بھی موت کا پیغام معلوم ہوتا ہے۔ تمہارا درد پُرانا ہے، اب یہ ختم ہو رہا ہے اس کے سوا کچھ نہیں اور تم سمجھتی ہو کہ اس کے ساتھ ہی تمہاری زندگی کا بھی خاتمہ ہو رہا ہے لیکن کیا تم کل کا روشن دن نہیں دیکھتیں؟ کیا تمہیں میرے پیروں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی جو ایک بار پھر تمہاری طرف بڑھ رہے ہیں؟ دیکھو میں تمہارے لئے پیار بھیج رہا ہوں، موتیا، چنبیلی اور گلاب کے پھول اور حیا کی وہ سُرخی جو اُبھرتے ہوئے سورج کی کرنوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے

سے زمین کے چہرے پر بکھر جاتی ہے۔ میں آدھا دن کمرے میں بند ہو کر گذارتا ہوں اور وہاں تمہاری تصویر سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔ کل میں نے تمہیں پھول پیش کرنے کا وعدہ کیا تھا لہذا یہ حاضر ہیں۔ تم مجھے اس کے بدلے میں کیا دو گی؟ تم نے میرا پاگل پن دیکھا؟ اگر کوئی کام سنجیدگی سے کرنا چاہتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں مسخرہ لیری فیری بن گیا ہوں جب وہ اپنی تلوار کھینچتا ہے تو اس کی جگہ خرگوش کی دُم نکل آتی ہے.....

کاش میں نے کچھ بھی نہ کہا ہوتا۔ ایک انجانا خوف مجھ پر سوار ہے۔ مجھے فوری خط لکھو لیکن خدا کے لئے زبردستی اور طبیعت پر جبر کر کے مت لکھنا۔ جانِ من! تم نے مجھے ایک حل بتایا تھا۔ کافی عرصے تک یہ بات میری نوکِ زبان پہ رہی اور ہم ایک دوسرے کو خاموشی سے چاہتے رہے۔ اب تم ہر چیز سے اپنے والد کو آگاہ کر دو۔ لیکن دو شرطیں ہیں۔ اس کا ذکر اپنے قریب ترین رشتہ داروں سے بھی نہ کرو کیونکہ میں خاندان میں پکنے والی کھچڑی کو پسند نہیں کرتا۔ دوسرے یہ کہ میرے والدین کو اس وقت تک کچھ مت لکھو جب تک میں خود اس سلسلے میں نہ لکھوں۔ باقی سب چیزیں میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ جس چیز میں تمہیں سکون ملے وہی کرو۔ اس کے سوا میں تم سے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور اس لفظ محبت میں ہر وفا کی جو خوشبو ہے اس سے زیادہ میں تم سے اور کیا وعدہ کر سکتا ہوں؟

گھر والوں کے نام ایک خط

زیورچ

۲۰۔ نومبر ۱۸۳۶ء

جہاں تک سیاسی سرگرمیوں کا تعلق ہے آپ اس بارے میں بالکل بے فکر رہیں اور ان من گھڑت قصوں سے قطعی پریشان نہ ہوں جو ہمارے اخبارات چھاپتے رہتے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ ایک جمہوریہ ہے اور چونکہ

لوگ صرف اتنا جانتے ہیں کہ جمہوریت ناممکن ہے اس لئے وہ شریف جرمنوں کو ہر روز طوائف الملوکی اور قتل و غارتگری کی باتیں سناتے رہتے ہیں۔ جب آپ مجھ سے ملنے آئیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ راستے میں آپ کو ہر جگہ دیہاتوں میں دوستانہ ماحول ملے گا وہاں خوبصورت مکان ہیں اور آپ جوں جوں زیورچ کی طرف آتے جائیں گے آپ چھوٹے چھوٹے شہروں اور گاؤں میں خوشحالی کے وہ مناظر دیکھیں گے جن کا ہم اپنے وطن میں تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ یہاں کی سڑکیں سپاہیوں، افسروں اور سست سرکاری ملازموں سے بھری نہیں رہتیں، یہاں کسی امیر آدمی کی گاڑی کے نیچے آکر کچلے جانے کا خطرہ بھی نہیں ہے اس کے برخلاف یہاں کے لوگوں میں آپ ایک قسم کی صحت مند تازگی دیکھیں گے۔ یہاں ایک سادہ، اچھی اور مکمل جمہوری حکومت ہے جو اپنا خرچ انکم ٹیکس سے پورا کرتی ہے یہ ایک ایسا ٹیکس ہے جسے ہم اپنے ملک میں طوائف الملوکی کی انتہا قرار دیں گے۔

مجھے کسی نے اطلاع دی ہے کہ منی گروڈ فوت ہوگیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اسے تین سال تک اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ اُف تین سال۔ فرانس کے ظالم لوگ تو صرف چند گھنٹوں میں کسی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ پہلے اسے موت کی سزا دیتے ہیں اور پھر گلوٹین کے ذریعے اس کا سر تن سے جدا کر دیتے ہیں۔ لیکن تین سال کی اذیتیں۔ ہماری حکومت واقعی کتنی مہذب اور نرم دل ہے یہ کسی کا خون بہتا نہیں دیکھ سکتی۔ اور شاید اسی لئے چالیس آدمی ابھی تک قید میں ہیں اور یہ طوائف الملوکی نہیں ہے بلکہ امن و امان ہے۔ یہ شریف لوگ جب سوئٹزرلینڈ کی طوائف الملوکی کا حال سنتے ہیں تو آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ خدا کی قسم! یہ لوگ اپنے لئے اچھا نہیں کر رہے ہیں ایک دن انہیں اس کا سخت خمیازہ بھگتنا ہوگا۔

لینز ۱۸۳۶ء بوشنر کا واحد بیانیہ ادب پارہ ہے۔ اس میں اس نے "اسٹرم اینڈ ڈرینگ" ڈرامہ نگار جیکب میکائیل رائن ہولڈ لینز کی زندگی کے کچھ واقعات پر مبنی کہانی بیان کی ہے جو دیوانہ ہو گیا تھا۔ یہ اس وقت کی کہانی ہے جب لینز ۱۷۷۸ء میں السائیہ میں پاسٹور اوبرلین کے ہمراہ رہ رہا تھا۔ بوشنر کی کہانی اوبرلین کی یادداشتوں پر مبنی ہے۔ اس میں اس نے نفسیاتی تجزیہ کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ لینز کے دل کی گھبراہٹ کس طرح بڑھتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے وہ خودکشی کی کوششیں کرتا ہے (ہمارا یہ اقتباس اس کہانی کا آخری حصہ ہے) لینز احساسِ تنہائی کا شکار ہے۔ وہ مذہب سے چمٹا رہنا چاہتا ہے لیکن دنیا کی بدحالی اسے دہریہ بنا دیتی ہے۔

آٹھ تاریخ کی صبح لینز بیدار نہیں ہوا۔ اوبرلین اس کے کمرے میں گیا، وہ بستر پر تقریباً بالکل برہنہ اور پریشان حال پڑا تھا۔ اوبرلین نے اسے کپڑا اُڑھانا چاہا لیکن اس نے کہا یہ بہت بھاری ہے، اتنا بھاری کہ وہ شاید چل بھی نہ سکے اور اب اسے اپنے اوپر ہوا کا وزن بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اوبرلین نے اسے سمجھانا اور تسلّی دینا چاہا لیکن وہ تقریباً سارا دن اسی عالم میں پڑا رہا، اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔

شام کو اوبرلین، بیل فوس میں ایک بیمار آدمی کو دیکھنے گیا، اس وقت موسم خوشگوار تھا، چاند چمک رہا تھا۔ راستے میں اوبرلین کو لینز مل گیا، اسی وقت وہ کافی سمجھ دار معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے اس سے بڑی آہستگی سے بات کی، اوبرلین نے اس سے کہا کہ وہ زیادہ دُور نہ جائے اور لینز نے وعدہ کر لیا کہ وہ دُور نہیں جائے گا۔ وہ آگے بڑھا لیکن پھر فوراً ہی واپس آیا اور اوبرلین کے قریب آکر کہنے لگا "سنو محترم! میں بالکل اچھا ہو جاؤں اگر مجھے یہ آواز سنائی نہ دے تو"۔

"کون سی آواز میرے دوست؟"

"کیا تمہیں سنائی نہیں دیتی؟ یہ خوفناک آواز جو دُور اُفق تک گونج رہی ہے اور جسے عام طور سے "خاموشی" کہتے ہیں۔ جب سے میں اس خاموش وادی میں ہوں اسے سُن رہا ہوں۔ اِس کی وجہ سے میں سو نہیں سکتا۔ محترم! کاش میں پھر سو سکوں!" وہ اپنا سر ہلاتا آگے چلا گیا۔

اوبرلین والڈ باش واپس آیا وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کسی کو اس کے پیچھے بھیجے کہ اسے لینز کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے فوراً بعد صحن میں کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ یہ آواز اتنی تیز تھی کہ اوبرلین یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ کسی آدمی کے گرنے کی آواز ہے۔ نرس ملازمہ دوڑتی ہوئی آئی، اس کا چہرہ زرد اور جسم کانپ رہا تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھ کر وادی سے مغرب کی طرف روانہ ہوئے۔ اس دوران وہ بالکل بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اسے اس بات کی بالکل پروا نہیں تھی کہ وہ اسے کہاں لے جا رہے تھے۔ گاڑی جب اونچی نیچی سڑک پر پہنچی اس وقت بھی بالکل ساکت اور خاموش بیٹھا رہا۔ پہاڑوں کے درمیان پورے سفر کے دوران وہ اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ شام ہوتے ہوتے وہ وادیٔ رائن پہنچ گئے۔ پہاڑ آہستہ آہستہ پیچھے رہتے جا رہے تھے، سورج کی نارنجی کرنیں اس پورے منظر کو دلفریب بنا رہی تھیں۔ جب وہ اسٹرابسگ پہنچے تو اندھیرا پھیل چکا تھا، دُور کی ہر چیز اندھیرے میں گُم ہو گئی تھی صرف قریب کے پہاڑوں کے حصے نظر آ رہے تھے۔ پورا چاند نکلا ہوا تھا جس کی روشنی میں دُنیا ایک سنہری پیالے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ لینز خاموشی سے سامنے کی طرف دیکھتا رہا، لیکن جوں جوں آس پاس کی چیزیں اندھیرے میں گُم ہوتی گئیں اسے ایک نامعلوم سا خوف محسوس ہونے لگا۔ وہ ایک سرائے میں

ٹھہر گئے۔ اس نے اپنے آپ سے پیچھا چھڑانے کی پھر کوششیں کیں لیکن اس کی اتنی سخت نگرانی ہو رہی تھی کہ وہ کامیاب نہ ہو سکا۔

اگلی صبح بادل چھائے ہوئے تھے اور بوندا باندی ہو رہی تھی، وہ اسٹراسبورگ پہنچا۔ وہ بالکل ٹھیک معلوم ہوتا تھا اور اس نے لوگوں سے صحیح صحیح باتیں کیں۔ اس نے ہر کام صحیح الدماغ لوگوں کی طرح کیا۔ لیکن اس کی آنکھوں اور چہرے پر ایک عجیب قسم کا خالی پن سا تھا۔ اسے پھر خوف محسوس نہیں ہوا، کوئی خواہش نہیں ہوئی۔ اس کے لئے اپنا وجود ناقابل برداشت بوجھ تھا۔

اور اس طرح وہ زندہ رہا....

ڈانٹن کی موت

بُوشنر نے "ڈانٹن کی موت" نامی ڈرامہ ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ۱۸۳۵ء میں لکھا تھا۔ وہ خود بھی انقلابی تحریک میں سرگرمی سے کام کرتا رہا تھا یہ اور بات ہے کہ اس کی کوششیں ناکام رہی تھیں۔ اس ڈرامے میں اس نے کوئی ایسا پیغام نہیں دیا ہے جس کا مقصد انقلابی جذبات کو اُبھارنا ہو۔ اس کے برعکس اس ڈرامے میں قنوطیت اور جبریت کا بڑا شدید احساس پایا جاتا ہے۔ ڈانٹن انقلاب کا ایک لیڈر ہے۔ اس میں اپنے سیاسی عروج کے زمانے ہی میں انقلاب اور خود زندگی سے بیزاری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کی قوتیں شل ہو گئی ہیں، اس کی تقریروں سے مایوسی اور ہر چیز سے نفرت کی بُو آتی ہے۔ اس کا مخالف سرد طبیعت کا حامل رابسپیری ہے۔ اس نے دہشت اور طاقت کے ذریعے سے آزادی اور مساوات حاصل کرنے کا تہیّہ کر رکھا ہے اس لئے وہ تاریخ کے ان پہلوؤں کا اظہار کرتا ہے جو مسائل سے پُر ہیں۔ بُوشنر نے انقلابی اسمبلیوں کے مناظر میں لمبے

ملے جُلے استعمال کئے ہیں۔ ہمارا یہ اقتباس سینٹ جسٹ کی ایک تقریر ہے جس میں اس نے بنیادی انقلابی جذبے کو خبط کی حد تک فرد کی توہین سے ملا دیا ہے۔

سینٹ جسٹ :

اس ایوان میں کچھ ایسے حساس لوگ بھی نظر آتے ہیں جن کے کان لفظ "خون" کی سماعت مشکل ہی سے برداشت کر سکتے ہیں۔ کچھ عام مشاہدوں کی وجہ سے وہ شاید یہ بھی سوچتے ہوں کہ ہم قدرت اور وقت سے زیادہ ظالم نہیں ہیں۔ قدرت خود اپنے قوانین پر خاموش اور بلا جھجک عمل کرتی ہے اور انسان جب بھی اس سے "ٹکر" لیتا ہے تباہ ہو جاتا ہے۔ ہوا کے تناسب میں کسی تبدیلی سے، کسی بھی زبردست آگ سے یا سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کے تلاطم یا کسی وبا، لاوے کے پھٹنے یا سیلاب سے ہزاروں آدمی موت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ کیا نتیجہ رہا؟ طبعی حالات میں معمولی سی تبدیلی نے اپنے پیچھے لاشوں کے سوا کوئی نشان نہیں چھوڑا۔

اس لئے اب میرا سوال یہ ہے کہ کیا روحانی فطرت کو اپنی انقلابی تبدیلیوں کے دوران طبعی قدرت کی نسبت زیادہ فراخ دل ہونا چاہیئے؟ کیا اسے بھی قانون قدرت کے مطابق ہر ایسے خیال کو تباہ کرنے کی اجازت دے دینی چاہیئے جو اس کی مخالفت کرے؟ کیا کسی ایسی حالت میں جب اخلاقی فطرت کے پورے ڈھانچے یعنی انسان کو تبدیل کیا جا رہا ہو خون بہانے کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے؟ ہمارا عالمی جذبہ ہمارے بازوؤں کو روحانی دائرے میں اسی طرح استعمال میں لاتا ہے جس طرح وہ طبعی حالات یعنی آتش فشاں پہاڑوں کے پھٹنے یا سیلاب کے موقع پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے چاہے ایک شخص کسی وبائی بیماری سے مرے یا کسی انقلاب میں؟

انسانی ترقی کی رفتار بہت سست ہے، اس کے اثرات صدیوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جس میں سے ہر ایک کے پس پردہ کئی کئی نسلوں کی قربانیوں کے نشانات ملتے ہیں۔ لاکھوں افراد کو بنیادی اصولوں اور معمولی دریافتوں کے لئے اپنی جانیں قربان کرنی پڑی ہیں۔ اس لئے یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ اس وقت جب کہ تاریخ کی رفتار بہت تیز ہوگئی ہے، زیادہ لوگوں کو اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

ہمارا مقصد بہت سادہ اور آسان ہے وہ یہ کہ تمام انسان ایک جیسے حالات میں پیدا ہوتے ہیں اس لئے سب آپس میں برابر ہیں ماسوائے اس فرق کے جو خود قدرت ہی نے رکھا ہو۔ لہٰذا ہر شخص فائدہ اٹھانے کا حقدار ہے۔ کسی بھی فرد یا چھوٹے یا بڑے گروہ کو مراعات حاصل کرنے کا حق نہیں۔ یہ ایک ایسا جملہ ہے جس کے ہر حصے کو عملی جامہ پہنانے پر لوگوں کو اپنی جانیں دینی پڑیں ہیں۔ ۱۴ جولائی ۱۰۔ اگست اور ۳۱۔ مئی اس کے مختلف مرحلے ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل میں چار سال لگے ورنہ عام حالات میں اس کے لئے ایک صدی کی ضرورت ہوتی اور کئی نسلیں اس کے مختلف مراحل سے گذرتی ہیں اس لئے کیا یہ بات تعجب خیز نہیں کہ انقلاب کا دریا ہر موڑ اور ہر مرحلے پر مرنے والوں کی لاشوں کو ایک طرف کرتا چلا جاتا ہے؟

ہمیں اپنے اس جملے میں کچھ اور نتائج شامل کرنے ہوں گے۔ کیا ہم چند سو لاشوں کو اپنی راہ میں حائل ہونے کی اجازت دیں گے؟ — حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کو بحر قلزم اور صحرا میں سے گذارا تھا یہاں تک کہ نئی مملکت کی بنیاد رکھنے سے پہلے اس کی قوم کی بوڑھی اور ضعیف نسل تتر بتر ہوکر تباہ ہوگئی تھی۔ اے قانون بنانے والو!

اس وقت ہمارے سامنے بحرِ قلزم یا صحرا کی بجائے جنگ اور گلوٹین مشین ہے۔ انقلاب دختران پیلیاس کی طرح ہے - یہ انسان کو تھکا دیتا ہے تاکہ اسے پھر سے تازہ دم کر سکے - جس طرح زمین "سیلابِ عظیم" سے اُبھری تھی اسی طرح انسان خون کے کڑھاؤ سے اتنا مضبوط بن کر نکلتا ہے کہ جیسے اس نے ابھی جنم لیا ہو۔

(زبردست تالیاں بجتی ہیں اور بعض ممبر جوش سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

یورپ اور پوری دنیا میں جو لوگ ناانصافیوں کے خلاف چھُپ کر کام کر رہے ہیں اور جن کی آستینوں میں بُروٹس کے خنجر چھپے ہوئے ہیں ـــــ وہ اب ہمارے ساتھ مل کر یہ کام کر سکتے ہیں۔

(تمام سُننے والے اور نمائندے فرانس کا قومی ترانہ گاتے ہیں)

کارل فلپ مورٹز

فلسفی اور جمال پرست کارل فلپ مورٹز (۱۷۵۶-۱۷۹۳ء) نے ناول "انیٹن ریزر" ۱۷۸۵ - ۱۷۹۰ء لکھ کر اپنے آپ کو ادیب کی حیثیت سے روشناس کرایا۔ یہ ناول خود نوشت سوانح کے انداز میں لکھا گیا ہے جو ایک نوجوان کے حالات پر مبنی ہے۔ ذہین انیٹن ریزر کے والدین اسے پڑھنے لکھنے کے بجائے دستکاری کے کام پر بٹھا دیتے ہیں۔ وہ اپنے والد کی مرضی کے خلاف ہائی اسکول میں داخلہ لے لیتا ہے۔ اپنی تعلیم مکمّل کرنے کے لئے اسے مخالفتوں اور معاشی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آخر میں وہ اپنی اس جدوجہد کو خیر باد کہہ کر تھیئٹر کی دُنیا میں چلا جاتا ہے تاکہ اداکار بن کر اپنی شخصیت کی تکمیل کر سکے یہاں بھی اسے پریشانیوں اور ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اس طرح اس نوجوان کی شخصیت ماحول کی ناسازگاری کی وجہ سے دب کر رہ جاتی ہے۔ معاشرہ، والدین اور معلمین اسے سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی صلاحیتوں کو بروئے کار آنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس کہانی میں انیٹن ریزر کی زندگی مسائل سے پُر ہونے کی وجہ سے اس کا کردار پیچیدہ ہوگیا ہے لیکن اس کے کردار کے نفسیاتی تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حیرت انگیز طور پر جدید رنگ کا حامل ہے اور اگرچہ یہ ناول انیسویں صدی سے پہلے کا ہے تاہم انیٹن ریزر کا کردار انیسویں صدی کے کرداروں سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے۔ ہمارے اس اقتباس میں انیٹن ریزر ٹوپی بنانے والے لوہنٹین کے پاس کام سیکھنے کے لئے جاتا ہے۔

کہا جاتا تھا کہ برنس وِک میں ٹوپی بنانے والا انیٹن پر خاص توجہ دے گا اور اسے اپنے بچّوں کی طرح سمجھے گا۔ وہاں اسے بہت ہلکا پھلکا کام کرنا

پڑے گا مثلاً حساب کتاب اور کمیشن پر ٹوپیاں پہنچا کر آنا وغیرہ۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اسے دو سال اسکول میں پڑھایا جائے گا جس کے بعد خود یہ سوچے گا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔ یہ صورتِ حال اور خاص طور سے اسکول جانے والی بات انیٹن کو بہت بھائی۔ اس نے اپنے والد سے اتفاق کیا اور ٹوپی بنانے والے کو دل ہی دل میں پسند کرنے لگا اور تصور میں ان خوش آئند دنوں کے خواب دیکھنے لگا جب وہ وہاں ہوگا۔

اسے نئی جگہ جانے کی کتنی خوشی ہوتی تھی۔ ہنوور کی زندگی اور وہاں کی ایک جیسی گلیوں اور مکانوں کو مسلسل دیکھ دیکھ کر وہ بیزار ہو گیا تھا۔ وہ تصور میں نئے گھنٹہ گھر، گیٹ اور محل دیکھ رہا تھا۔ وہ وہاں پہنچنے کے لئے بے چین ہو گیا اور گھڑیاں گن گن کر اپنی روانگی کے وقت کا انتظار کرنے لگا۔

آخر کار وہ دن آ پہنچا جس کا اسے بے چینی سے انتظار تھا۔ انیٹن اپنی ماں اور دونوں بھائیوں، پانچ سالہ کرسچین اور ایک سالہ سائمن سے رخصت ہو کر روانہ ہوا۔

اس کے والد اس کے ہمراہ تھے۔ دونوں نے آدھا راستہ پیدل اور آدھا سواری میں طے کیا۔ جہاں کہیں انھیں سستی سواری مہیا ہوتی وہ اس سے فائدہ اٹھاتے۔

انیٹن نے زندگی میں پہلی مرتبہ پیدل سفر کرنے کا لطف اٹھایا تھا۔ جوں جوں وہ برنس وِک کے قریب پہنچ رہے تھے انیٹن کی بے قراری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ سینٹ اینڈریوز کا گھنٹہ گھر اور اس کا سُرخ گنبد نظر آنے لگا تھا وہ شاہانہ انداز میں آسمان سے باتیں کرتا نظر آ رہا تھا۔ شام ہوتی جا رہی تھی۔ دُور فصیل پر اس نے سنتری کو پہرہ دیتے دیکھا جو اِدھر اُدھر آ جا رہا تھا۔ اس کا ذہن بے شمار خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔ وہ سوچنے لگا اس کا محسن کیسا ہوگا، وہ کتنا بڑا ہوگا، کس طرح چلتا ہوگا اس کا چہرہ کیسا ہوگا؟

ٹنگی ہوئی تھی جس پر ٹوپی بنی تھی اور لوہنسٹن کا نام لکھا ہوا تھا ایک بوڑھی خادمہ نے دروازہ کھولا اور انہیں دائیں جانب ایک بلبے سے کمرے میں لے گئی جہاں نیم تاریکی میں حواس خمسہ کو برقرار رکھنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ یہاں گھر کے مالک نے ان کا استقبال کیا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا پستہ قد آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر پیلاپن اور افسردگی سی تھی۔ جس پر کبھی کبھار زبردستی کی مسکراہٹ نظر آجاتی تھی، اس کے بال سیاہ اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ اس کی گفتگو، حرکات وسکنات اور انداز میں ایک طرح کا سلیقہ تھا جو کاریگر قسم کے لوگوں میں کم ہی پایا جاتا ہے۔ اس کی آواز صاف اور بہت آہستہ تھی۔ وہ الفاظ ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتا تھا خاص طور سے جب مذہبی اُمور پر بات چیت ہو رہی ہو۔

اینٹن نے جب پہلی بار اسے دیکھا تو اس وقت اس نے سبز سمور کی ٹوپی نیلی واسکٹ اور کالے رنگ کی قبا پہن رکھی تھی۔ عام طور سے گھر میں وہ یہی پہنتا تھا۔ پہلی ہی نظر میں اسے وہ دوست یا محسن کے بجائے ایک سخت گیر مالک نظر آیا۔ اس کے دل میں بے دیکھے جو محبت پیدا ہوئی تھی وہ اس طرح ختم ہوگئی جیسے چنگاری پانی پڑنے سے بجھ جاتی ہے۔ اس نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ وہ یہاں صرف اس کا شاگرد بن کر ہی رہ سکے گا۔

کچھ دن تک جب تک کہ اس کے والد اس کے ساتھ رہے اس کا کچھ لحاظ کیا گیا اس کے بعد جوں ہی وہ وہاں سے گئے اُسے ورکشاپ میں دوسرے کام سیکھنے والوں کی طرح کام کرنا پڑا۔ اسے بہت معمولی قسم کے کام دیئے گئے مثلاً لکڑیاں چیرنا، پانی لانا اور دکان کی صفائی کرنا۔ گو کہ یہ کام اس کی توقع کے خلاف تھے لیکن نئے پن کی وجہ سے اسے زیادہ کوفت نہیں ہوئی بلکہ اسے لکڑیاں چیرنے، پانی بھرنے اور صفائی کرنے میں بھی خوشی محسوس ہوئی۔

اس کے تصوّر جس نے ہر چیز کو خوبصورت بنا دیا تھا اسے ہمیشہ خوش رکھا، اکثر اسے اپنا ورکشاپ جس کی دیواریں کالی تھیں اور جس میں دن اور رات کا فرق صرف چندلیمپوں کی روشنی ہی سے ظاہر ہوتا تھا، ایک گرجا معلوم ہوتا جس میں وہ اپنے آپ کو مبلغ دین سمجھتا رہا۔

صبح کو وہ بڑے سے کڑھاؤ کے نیچے آگ سلگاتا جس کی وجہ سے تمام دن کام جاری رہتا اور سب لوگ تندہی سے اپنے کام میں مصروف رہتے۔ چنانچہ وہ اپنے فرائض کو بہت اہم اور باوقار سمجھتا تھا۔

ورکشاپ کے پچھواڑے اوکر بہتا تھا جس پر پانی بھرنے کے لئے چبوترے بنے تھے۔ وہ سب کام اس طرح کرتا جیسے وہ خود اس کا مالک ہے۔ وہ دکان کی صفائی کرنے، بڑے بوائلروں کو بھرنے اور ان کے نیچے آگ سلگانے کے بعد بعض اوقات ایسا محسوس کرتا جیسے اس نے سب کام صحیح طریقہ سے کر کے اُن لوگوں کی روزی کا سہارا برقرار رکھا ہے جو اس کے ساتھ کام کرتے تھے۔ کام کے دوران باقاعدگی کو دیکھ کر اسے ایک طرح کی خوشی محسوس ہوتی تھی اور وہ اپنے آپ کو اس مشین کا ایک پہیہ تصور کرتا تھا جو باقاعدگی سے گھوم رہا ہو گھر پر وہ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ٹوپی بنانے والے نے اپنے گھر میں نظم وضبط قائم کیا ہوا تھا۔ ہر کام کھانا، سونا اور کام کرنا گھڑی کے مطابق وقت پر ہوتا تھا۔ اس میں صرف ایک تبدیلی ہوتی تھی اور وہ یہ کہ ہفتے میں کم سے کم ایک بار ایسا ضرور ہوتا تھا کہ سونے کے وقت میں بھی کام جاری رکھا جاتا تھا۔ دوپہر کا کھانا ٹھیک بارہ بجے کھایا جاتا تھا اور ناشتہ اور شام کا کھانا صبح اور رات کے آٹھ بجے کھایا جاتا تھا۔ یہ مقررہ اوقات تھے جو کام کے اوقات میں شمار ہوتے تھے۔ ان ہی مصروفیات میں اینٹن کے دن گذر رہے تھے وہ صبح چھ بجے سے کام پر لگ جاتا اور جب اسے خوب زور کی بھوک لگ رہی ہوتی جو ایک صحت مند آدمی کو لگنا چاہیئے تو اس

وقت وہ ناشتہ کرتا۔ یہ ناشتہ بھی کیا ہوتا ایک پیالی کافی، تھوڑا سا دودھ اور ایک ڈبل روٹی۔ اس کے بعد وہ پھر کام میں لگ جاتا اور اگر صبح کے وقت کام میں کوفت پیدا کرنے والی یکسانیت ہوتی تو وہ دوپہر کے کھانے کے تصوّر میں اس کو اپنے لئے دلچسپ بنا لیتا۔

آؤ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ کہاں؟ وہ مارگٹ سیدھی اس کے پاس سے آ رہی ہے۔ ہاں ہاں میں سمجھ گیا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ ایگنس مر گئی، ایگنس مر گئی۔ مجھے جانے دو۔ مجھے بھاگ جانے دو۔ میں دنیا کے آخری سرے تک چلا جاؤں گا۔

الزبیتھ نے اسے سختی سے پکڑ لیا۔ اس نے انتہائی غصّے کے عالم میں الزبیتھ کو سخت بُرا بھلا کہا لیکن اس نے رو کر اس کے پیر پکڑ لئے اور وہ آگے نہ بڑھ سکا۔ صدر نے اپنی نگاہیں اس دل گداز منظر سے ہٹا لیں۔ "آہ، آہ" الزبیتھ چلائی "جب میرا محبوب مجھ سے ناراض ہوتا ہے تو اس کا ستارہ کانپنے لگتا ہے، کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟ ڈارلنگ۔ مجھے پہچانو۔ میں کس کی خاطر یہاں آئی ہوں؟ کس لئے میں نے اتنے طویل فاصلے طے کئے ہیں؟ میرے پیروں کو دیکھو جن میں چھالے پڑ گئے ہیں اور جن سے خون بہہ رہا ہے۔ او ظالم اور احسان فراموش لڑکے"، میں جہاں کہیں بھی گئی تیری محبت میرے ساتھ رہی۔ تپتی ہوئی دھوپ میں، اندھیری رات اور طوفان میں، خاروں اور دلدلوں میں ہر جگہ تیری محبت مجھے لے کر گئی اور میری محبت پھر بھی نہیں تھکی اسے ختم کرنا ممکن نہیں۔ میں ادھر اُدھر ماری پھری، جگہ جگہ اسے تلاش کیا اور آخر کار اسے پا لیا۔ ہاں میں نے اسے ڈھونڈ نکالا اور اب وہ کہتا ہے کہ وہ مجھے پہچانتا بھی نہیں۔ آہ یہ میری کتنی بدقسمتی ہے۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ جب میں تم سے ملوں گی تو کس قدر خوش ہو گے لیکن اتنے عرصے کی تگ و دو کے بعد مجھے یہ کچھ ملا۔ تم نے میرے دکھی دل کی بھی کوئی پروا نہیں کی۔ تم نے مجھے جانوروں کی طرح دھتکار دیا۔ لیکن جو

جانور اپنے مالک کے پیر چاٹتا ہے وہ اسے کبھی نہیں چھوڑ سکتا... اے لوگو! اس کا کیا مطلب ہے، تم ہی کچھ بتاؤ۔ آخر کوئی میری مدد کیوں نہیں کرتا۔ میرے حقوق کیوں نہیں دلوآتا؟ اے آسمان تو گواہ ہے، یہ شخص میرا ہے۔ اس نے اس پہاڑی پر جہاں یہ مجھ سے ملا کرتا تھا بہت عرصہ پہلے یہ قسم کھائی تھی کہ وہ میرا ہو جائے گا۔ اس وقت خزاں کی ہواؤں نے اس وعدے کو سُنا تھا اور اب ہر سال یہ ہوائیں اس خوشیوں سے بھرپور دن کی یاد دلاتی ہیں۔ میں وہاں پھر گئی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ ایک خوبصورت لڑکا ہے۔ اگر وہ ایسا ہی پاک دامن رہے تو ... لیکن سچ تو صرف بچے ہی بولتے ہیں۔ ایگنس تمہاری کیا لگتی ہے؟ تم اس سے اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکے۔ تم نے خود اس کے سامنے اعتراف کیا اور اسی لئے وہ بیمار ہو گئی۔ اس نے آج شام مجھ سے اس کی شکایت کی تھی۔ اگر تم اس کے ساتھ سچے نہیں نکلے تو میرے ساتھ اس سے زیادہ جھوٹے ثابت ہوگے"

یہ آخری الفاظ منصور کے دل پر تیر کی طرح لگے۔ اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور اپنے بال نوچنے لگا۔ صدر کو جس نے اسے اتنا سمجھایا بجھایا تھا اور جس کی تمام باتیں رائیگاں گئی تھیں، اس پر بہت رحم آیا۔ وہ محل کی طرف دوڑنے لگا، صدر اس کے پیچھے بھاگا۔ کچھ لوگوں نے اس پاگل عورت پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن اس عورت نے بجلی کی سی تیزی سے لمبا سا چاقو نکال لیا تاکہ کوئی شخص اس کے قریب نہ آسکے۔ وہ خاموش کھڑی رہی، اس کے بعد اس نے الوداعی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور جس طرف نولٹن گیا اس طرف بازو پھیلا دئیے۔ دور تک اس کے قدموں کی آواز سنائی دیتی رہی اور پھر وہ اندھیرے میں گم ہو گئی۔

ایڈورڈ موریکے

پنیٹر نولٹن

ایڈورڈ موریکے (۱۸۰۴-۱۸۷۵ء) انیسویں صدی کے عظیم جرمن شاعر گوئٹے کے بعد دوسرا بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اس نے جنوبی جرمنی میں ایک اچھی اور پُرسکون زندگی گزاری تھی۔ اس کی نظموں میں جہاں ہمیں بہت سے عناصر ملتے ہیں وہاں ان میں کلاسیکی انداز بھی پایا جاتا ہے۔ مظاہرِ قدرت سے اس کی بے پناہ محبّت اور حقیقت پسندی کا اظہار، لوک گیتوں اور ہلکے پھلکے مزاح سے اس کی شاعری کی یہ خصوصیات واضح ہوجاتی ہیں۔ اپنے اوّلین دور کے ناول پنیٹر نولٹن (۱۸۳۱ء) میں اس نے نہایت رومانی انداز میں فنکار کے مسائل کو بیان کیا ہے۔ مصوّر تھیوبالڈ نولٹن بہت زیادہ سوچ بچار اور حساس ہونے کی وجہ سے ایک غیر مرئی طاقت کے ہاتھوں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگتا ہے اگرچہ نولٹن کے کردار کے بعض پہلو تشنہ رہ جاتے ہیں مثلاً بعض لوگوں کے ساتھ اس کی غیر معمولی وابستگی ـــ لیکن ناول کے دوسرے کرداروں کی بڑے اچھے طریقے سے نفسیاتی تجزیے کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے جو انیسویں صدی کے ادب کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ ناول کے اس اقتباس میں نولٹن کو دو عورتوں کے سلسلے میں تذبذب کے عالم میں دکھایا گیا ہے جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی غور و فکر کی صلاحیت بھی اس کا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔ ایک طرف خانہ بدوش لڑکی الزبیتھ ہے جو اس کے چچا کی لڑکی ہے اور جس سے نولٹن نے اپنی ابتدائی عمر میں محبّت کی تھی۔ اب اس سے علیحدہ ہونا اس کے بس میں نہیں ہے اور دوسری طرف جنگلات کے نگراں کی لڑکی ایگنس ہے جس کے ساتھ وہ محبّت اس لئے جاری نہیں رکھ سکتا کہ درمیان میں الزبیتھ حائل ہے۔

وہ اس کے قریب آئی اور اس کا ہاتھ محبّت سے اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی، اس نے غصّے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور چلّایا " میری نگاہوں کے سامنے سے دفع ہوجاؤ " بدمعاش! میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ تم ایک چڑیل ہو۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں تم میرے لئے مصیبت پیدا کردیتی ہو۔ وہ کتنا منحوس دن تھا جب میری تم سے ملاقات ہوئی تھی۔ تمہاری جھوٹی محبّت کے فریب میں آکر مجھے اپنے پاکیزہ جذبات اور معصومیت کی کتنی بھاری قیمت اداکرنی پڑی ہے۔ میں بھی کتنا بے وقوف اور احمق تھا، مجھے سوچنا چاہیئے تھا کہ میں کس کو اپنے پلّے باندھ رہا ہوں۔ او خدایا صرف تو ہی جانتا ہے کہ میرے لئے یہ سزا کتنی سخت ہے۔ مجھ پر ایک کے بعد دوسری مصیبت ٹوٹی اور مجھے کتنی ناقابلِ برداشت اور ناقابلِ یقین اذیتیں اٹھانی پڑی ہیں۔ اُف مجھ پر کس کی نگاہِ کرم پڑی ہے۔ میرا گناہ اتنا شدید تو نہیں کہ مجھے اتنی سخت ذہنی اذیت دی گئی ہے۔ دربدر پھرنے والی اس عورت کی آنکھوں میں وہ چمک ہے جس نے ہمیشہ مجھ پر ظلم کے پہاڑ توڑے ہیں۔ مجھے اس کو مجرم نہیں سمجھنا چاہیئے۔ وہ نفرت کے بجائے میری ہمدردیوں کی مستحق ہے لیکن کس میں اتنی ہمّت اور تحمل ہے کہ آسمان اس پر نت نئے ظلم توڑتا رہے اور وہ خاموشی سے اپنی انسانیت کا مظاہرہ کرتا رہے۔ کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں ہوگی کہ مجھ پر ان پاگل کردینے والے حالات اور مصائب کا کوئی اثر ہی نہ ہو؟ اوہ میں دیکھ رہا ہوں وہ تیزی سے قریب آرہی ہے۔ میں یہاں کھڑا کیوں افسوس کررہا ہوں؟ ہم لوگ سب یہاں کیوں کھڑے ہیں، جب کہ آسمان پر فرشتہ موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے؟ وہ مررہی ہے! وہ مررہی ہے! کیا میں اسے دیکھ سکوں گا؟ کیا اب بھی وقت ہے کہ میں اسے بچا سکوں؟

ایڈلبرٹ اسٹیفر
میرے پردادا کے کاغذات

ایڈلبرٹ اسٹیفر (۱۸۰۵-۱۸۶۸ء) انیسویں صدی میں آسٹریا کا سب سے بڑا ناول نگار تھا۔ اس نے عظیم تر اخلاقی اقدار کے سہارے جرمن کلاسیکیت کی روایت کے مطابق روحانی ارتقا کا ایک ایسا آدرش تعمیر کیا جس میں صبر و تحمل کی قوتیں ایسے جذبات اور خواہشات کی جگہ لے لیتی ہیں جن پر قابو پانا ضروری ہوتا ہے۔ اسٹیفر کی تصنیفات میں قدرت ایک اہم کردار ادا کرتی ہے جسے انسان اور قدرت کے باہمی تعلق کے ساتھ ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس نے ان شاندار تحریروں میں عام طور سے اپنے وطن مالوف ہی کا تذکرہ کیا ہے۔ کہانی " میرے دادا کے کاغذات (۱۸۴۲ء) میں ایک ڈاکٹر آگسٹینس کے حالاتِ زندگی بیان کئے گئے ہیں۔ یہ حالاتِ زندگی ان یادداشتوں پر مبنی ہیں جو دادی کو اپنے پردادا کی ڈائری میں ملتی ہیں۔ آگسٹینس نے گاؤں کے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے علاقے کے لوگوں کی مثالی خدمت کی اور اس طرح تہذیبی ترقی کی تاریخ میں ایک شاندار باب کا اضافہ کیا۔ قسمت نے اس کے ساتھ مذاق کیا اور اسے زبردست نقصان سے دوچار کیا۔ اسے اپنی تیز مزاجی کی وجہ سے سخت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس نے اپنے اندر ایک ایسا انسانی جذبہ پیدا کر کے جو اس کے ضمیر کی آواز کے مطابق تھا اور جو خدمت، بھروسہ اور محبت کے جذبات پر مبنی تھا ان خطرات کو زیر کر لیا۔ اس کہانی میں کرنل اُلیسن کی زندگی کی داستان بھی بیان کی گئی ہے۔ ہمارے اقتباس میں اسی داستان کی ابتدا ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انسان سے کس طرح غلطیاں ہوتی ہیں اور وہ کس طرح اخلاقی قوتوں کو پھر سے مجتمع کرتا ہے۔

"کیا آپ نے کبھی اہیم خاندان کا نام سُنا ہے؟"

"میرا خیال ہے میں نے یہ نام سنا ہے"۔ میں نے جواب دیا۔" میں ان دنوں پراگ میں اسکول میں پڑھتا تھا جب میں نے کیسمیر وان الہیم کا نام سنا تھا"۔

" تم نے اس کا نام ایک جواری، بدمعاش اور عیاش آدمی کی حیثیت سے سنا ہوگا"۔ اس نے کہا۔

" ہاں شاید اسی حیثیت سے "۔ میں نے جواب دیا۔

اس نے کہا۔" میں ہی وہ کیسمیر وان الہیم ہوں "۔

" تم، کرنل اُلیسن ؟ " میرے منہ سے نکلا۔" نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا "۔

" ایسا ہو سکتا ہے اس لئے کہ یہ حقیقت ہے"۔ اس نے جواب میں کہا۔" میرا پورا نام کیسمیر اُلسن وان الہیم ہے۔ ہو سکتا ہے میرے بارے میں بعض افواہیں صحیح نہ ہوں اس لئے کہ میں اتنا اچھا آدمی نہیں تھا۔ کچھ خصوصیات مجھ میں ایسی تھیں جنہیں لوگ صحیح طور پر نہ جانتے تھے۔ مجھ میں جو بُرائیاں تھیں انہیں وہ بہت اچھی طرح جانتے تھے اور میری فطرت کی خوبیوں کے بارے میں انہیں کچھ پتہ نہیں تھا۔ میں نے ہمیشہ مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ میرے دوست ذرا سنو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ میں سولہ[16] سال کی عمر تک اپنے والد کے مکان میں رہا۔ میری ماں کا بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ میرا ایک بڑا بھائی تھا۔ ہمیں ایک استاد پڑھانے آتا تھا۔ میرا بھائی پڑھنے میں ہمیشہ مجھ سے آگے رہا جس کی وجہ سے میرے والد مجھ پر افسوس کرتے اور مجھ پر ناراض رہتے تھے جب میں سولہ سال کا ہوا تو میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ جب ان کا وصیت نامہ دیکھا گیا تو پتہ چلا کہ انہوں نے میرے بھائی کو اپنا واحد وارث بنایا ہے اور میرے لئے صرف اتنی رقم کی وصیت کی ہے جو مجھے قانوناً ملنی چاہیئے۔ میرے چچا جن کی شادی نہیں ہوئی تھی ہم لوگوں کا سرپرست مقرر کیا گیا تھا۔ انہیں میرے والد کی جائداد اور میری والدہ کی ان چیزوں کا انتظام کرنا تھا جو وہ میرے لئے چھوڑ گئی تھیں میں نے اپنے بھائی کو بُرا بھلا کہا اور اسے بتایا کہ میں گھر سے نکل جاؤں گا اور تیس سالہ جنگ کے ہیرو والنسٹین اور دوسرے لوگوں کی طرح جنرل اور ایک

لیڈر بنوں گا تاکہ ہر شخص کو اذیت دے سکوں۔ سر پرست صاحب نے فرمایا کہ فوج میں جانے کا خیال تو بہت اچھا ہے کیونکہ اس طرح وہاں کی تربیت سے تجھ میں معقولیت آجائے گی۔ انہوں نے کہا تھا میں تمہاری موروثی جائداد کا جہاں تک مجھ سے ہو گا بہترین طریقے سے انتظام کردں گا۔ انہوں نے ضمانت کے بغیر اس میں سے مجھے ایک پیسہ نہیں دیا۔ البتہ اپنے پاس سے کچھ رقم بطور قرض دی تاکہ میں سفر کر سکوں اور نصیحت کی کہ میں اس رقم کو بہت احتیاط سے خرچ کردں کیونکہ اس کے سوا میرے پاس اور کچھ نہیں ہو گا اور نہ مجھے کسی جگہ کچھ اور مل سکے گا۔ میں نے جواب میں کہا کہ میں یہ پیسے قرض کے طور پر لے رہا ہوں اور یہ کہ اس قرض کی ضمانت کے طور پر میری کافی رقم ان کے پاس موجود ہے۔ اپنے چچا کی نصیحتوں اور تنبیہوں کو خاطر میں لائے بغیر میں گھر سے روانہ ہو گیا۔

" جب میں فوج میں بھرتی ہونا چاہا تو انہوں نے کہا کہ وہ میرا امتحان لیں گے۔ اور مجھے اسکول بھیجیں گے۔ یہ میرے بس کا روگ نہیں تھا، لہٰذا میں الیکٹرک آف لوایا اور کاؤنٹ پیلے ٹائن کی طرف گیا وہاں بھی یہی صورت تھی چنانچہ میں نے جرمنی کو خیرباد کہہ کر مغرب کی طرف اپنا سفر جاری رکھا اور ایک دن میں دریائے رائن پار کر کے فرانس میں داخل ہو گیا تاکہ اپنی تلوار فرانس کے بادشاہ کے قدموں میں رکھ سکوں۔ میں کئی علاقوں سے گذر کر پیرس پہنچا۔ مجھے فرانسیسی زبان صرف اتنی ہی آتی تھی جتنی میں نے اپنے استاد سے سیکھی تھی یا کتابوں میں پڑھی تھی۔ پیرس میں مجھے کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جس نے میری ذرا سی بھی مدد کی ہو پھر بھی میں بے تکان کوشش کرتا رہا یہاں تک کہ مجھے بادشاہ کے حضور پیش کر دیا گیا۔

" جب میں نے اسے اپنی خدمات پیش کیں تو اس نے کہا کہ سب سے پہلے تم کیا سیکھنا چاہتے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ زبان۔ اس پر اس نے کہا کہ تم زبان سیکھو پھر مجھ سے ملنا۔ اس نے وعدہ کیا کہ میں تمہیں یاد رکھوں گا اور نوکری دوں گا۔ چنانچہ میں نے زبان سیکھنی شروع کر دی اور جو کوئی مجھ سے بات کرتا میں اس سے

فرانسیسی بولتا تاکہ جلد یہ زبان سیکھ لوں۔ جب تمام پیسے ختم ہو گئے اور سونے کے چند سکے باقی رہ گئے تو ایک رات میں اس جوئے خانہ میں گیا جس کا میں نے بہت نام سُنا تھا۔ میں اُس کمرے میں گیا جہاں، وہ لوگ کھیل رہے تھے۔ مجھے تاش کھیلنا نہیں آتا تھا۔ کچھ دیر میں نے ان لوگوں کو کھیلتے ہوئے دیکھا اور پھر ان کی طرح میں نے بھی سونے کا ایک سکہ ایک کارڈ پر لگا دیا۔ ایک آدمی تاش کے پتے ایک کے بعد ایک نیچے پھینکتا جاتا اور کچھ عجیب سے الفاظ بولتا جاتا جو میں نہیں سمجھتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس آدمی نے سونے کے بہت سے سکے میری طرف سرکا دئے۔ میں نے ان سکوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر اپنے سامنے لگا لیا۔ اس کے بعد میں نے کچھ سکے پہلے کی طرح پھر ایک کارڈ پر لگا دئے میری جیت ہوئی۔ غرض اسی طرح کبھی جیتتا، کبھی ہارتا، لیکن آخر میں جب اُٹھا تو میری جیب سونے کے سکوں سے بھری ہوئی تھی۔

" اگلی رات میں پھر جوئے خانے پہنچ گیا اور بہت سی رقم جیتی۔ اس طرح میں ہر رات وہاں جانے لگا۔ میری قسمت بہت اچھی تھی۔ کبھی کبھی میں ہارتا بھی تھا لیکن دوسری بار میں اس سے زیادہ رقم جیت لیتا تھا۔ میں سب کی نظروں میں آ گیا تھا اور دوسرے لوگ بھی اسی کارڈ پر رقمیں لگانے لگے جن پر میں پیسے لگاتا۔ میں تاش کا کھیل بھی جان گیا تھا اور اپنی عقل سے یہ اندازہ لگانے لگا تھا کہ کس وقت کس پتے پر بھروسہ کیا جائے اور کس پر نہیں۔ کب کھیل بند کر دیا جائے اور کب پھر سے شروع کیا جائے۔ میں نے اپنے لئے خوبصورت ٹوپی اور قیمتی لباس خریدے۔ کچھ ہی عرصے بعد میں نے اپنے لئے ایک ایسا عمدہ گھوڑا خریدا جیسا کہ ڈیوک آف اورلینز کے اصطبل میں ہو سکتا ہے۔ کچھ دن بعد میرے پاس تین گھوڑے ہو گئے۔ مجھے کئی گھروں میں مدعو کیا گیا اور اب میں ان عورتوں اور لڑکیوں سے باتیں کر سکتا تھا جنہیں میں کھڑکیوں میں سے جھانکتے اور خوبصورت گاڑیوں میں سواری کرتے دیکھ سکتا تھا۔ میرے دوست مجھے تفریحی مقامات

پڑ لے گئے اور مجھے اس بڑے شہر کی زندگی کا لطف آیا۔ میری پر شکوہ نیام میں شمشیر آبدار ہوتی جس کے دستے پر ایک تنا قیمتی ہیرا لگا ہوا تھا جو چند ہی لوگ خرید سکتے تھے۔

"ایک دن میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ شہر سے باہر جنگل میں گیا۔ وہاں میں نے دُبلے پتلے اور زرد رنگ کے ایک نوجوان کو دیکھا۔ اسے میں اس سے پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور کچھ کہے بغیر اپنا مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں نے اسے مخاطب کر کے کہا کہ تم کیوں میری توہین کر رہے ہو؟ اس بار بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے غصہ آگیا اور میں نے اسے چیلنج کیا کہ اگر تم گونگے نہیں ہو تو مجھ سے لڑ لو۔ اس نے کہا میں ایک بدمعاش کے مقابلے میں اپنی تلوار نہیں اٹھاؤں گا۔ میں نے کہا میں تمہیں مجبور کر دوں گا؛ اس نے کہا میں آوارہ لوگوں اور قاتلوں کے مقابلے میں اپنا دفاع کروں گا۔ میں نے اسے دھکا دیا اس نے اپنی تلوار کھینچ لی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ زمین پر گر گیا، میں سمجھا شاید مر گیا۔ اس نے کہا میں بے وقعت آدمی کے ہاتھوں مر رہا ہوں۔' میں گھبرا گیا، میرے دوستوں نے مجھے بھگا دیا اور کہا کہ ہم اس کی دیکھ بھال کر لیں گے۔ میں واپس شہر آگیا۔

"اگلے روز میرے دوست میرے پاس آئے اور مجھے بتایا کہ وہ آدمی زندہ ہے اور اسے ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ اس کی کس سے لڑائی ہوئی ہے اور یہ بات راز میں رہے گی۔ کچھ دن بعد مجھے پتہ چلا کہ جس آدمی سے میرا مقابلہ ہوا تھا وہ ڈیوک آف کوئزل ہے اور یہ کہ وہ زندہ ہے اور اب اس کے محل میں اس کا علاج ہو رہا ہے۔ میں نے اور میرے دوستوں نے اور زیادہ احتیاط سے کام لینا شروع کر دیا تاکہ یہ راز کھلنے نہ پائے۔ چار ہفتے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ وہ صحت یاب ہو رہا ہے۔ میں یتیم خانے کے ناظم کے پاس گیا اور اپنا تمام سونا، جواہرات، قیمتی کپڑے اور گھوڑے اس کے حوالے کر دئیے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں نے جو کچھ یتیم خانے کو

دیا ہے اس کی مجھے رسید دے دی جائے۔ میں نے اپنے پاس صرف اتنی ہی رقم رکھی جو میں اپنے ساتھ پیرس لایا تھا۔ میں نے ایک بھورے رنگ کا معمولی گھوڑا بھی اپنے پاس رکھا جو میں نے وہاں خریدا تھا۔

دو ہفتے بعد میں نے ڈیوک کو ایک خط لکھا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے خط کے ساتھ یتیم خانے کے ناظم کی رسید بھی رکھ دی۔ ڈیوک نے مجھے بلایا۔ میں اس سے ملنے گیا اس نے اپنے تمام نوکروں کو باہر بھیج دیا اور مجھ سے کہا کہ اب میں تم سے بات کروں گا اور اس کے بعد فرانس کا کوئی بھی شریف آدمی تمہیں اپنے محل میں بلا کر بات کر سکے گا۔ میں نے اپنے کاغذات دکھائے کہ میں جرمنی کا ایک شاہی نواب ہوں اور کہا کہ میں نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا اس کی معافی چاہتا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ اب تک میں نے یہ بات چھپائے رکھی تھی کہ میری کس سے لڑائی ہوئی تھی اور سوچا تھا کہ اسے مکمل طور سے صحت یاب ہونے تک اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کروں گا۔ بہرحال اب میں تمہارے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کروں گا بلکہ یہ اعلان کر دوں گا کہ میں نے ایک شریف آدمی کی توہین کر کے خود اسے اپنے خلاف لڑنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ شریف آدمی غلط راستے پر چل پڑا تھا اور اب اس نے ان غلطیوں کا احساس کر کے انتہائی خوبصورت طریقے سے ان کی اصلاح کر لی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اب مجھے اپنے مدمقابل پر فخر ہے۔ یہ الفاظ سننے کے بعد میں نے پیشکش کی کہ آپ جس قسم کا معاوضہ یا بدلہ چاہیں لے سکتے ہیں۔ ڈیوک نے کہا، اب ہمارا اور آپ کا کوئی تنازعہ نہیں۔ ہم میں سے کوئی کسی سے معاوضہ یا بدلہ نہیں لے گا۔ میں نے جواب دیا کہ میں جب تک بدلہ چکانے کے لئے فرانس میں ہوں یہاں کے دیگر امراء سے ملاقات نہیں کر سکوں گا کیونکہ میں نے جرمنی جانے کا فیصلہ کر لیا ہے تاکہ اپنے ملک کی فوج میں خدمات انجام دے سکوں۔ اس نے کہا "یہ ایک نہایت باوقار فیصلہ ہے"۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا امید ہے ہم پھر ملیں گے۔ ہم نے نہایت گرمجوشی سے ہاتھ ملائے۔ میں اپنے کاغذات لے کر وہاں سے رخصت ہو کر اپنی قیامگاہ پر واپس آیا وہاں مجھے ایک خط ملا۔ جس میں مجھے بادشاہ کی فوج میں ایک بہت اچھے عہدہ کی پیشکش کی گئی تھی میں نے اسے اپنی تلوار سے چاک کیا اور دوسرے غیر ضروری کاغذات کے ساتھ اپنے تھیلے میں ڈال دیا۔

اگلے روز میں اپنے معمولی گھوڑے پر سوار ہوا اور مشرق میں دریائے رائن کی طرف روانہ ہو گیا۔"

پیٹر روزگر
جنگل میں مردم شماری

پیٹر روزگر (۱۸۴۳ء - ۱۹۱۸) ایک کسان کا لڑکا تھا جو آسٹریا کے پہاڑی جنگلات میں رہتا تھا۔ اس کا بچپن اور نوجوانی انھیں جنگلات میں گزری اس کے بعد وہ گراز شہر چلا گیا جہاں اُس نے ۱۸۷۰ء کے بعد اپنی اہم تصنیفات مکمل کیں۔ اس نے بیشتر کہانیوں میں اپنے ملک کے کسانوں کی زندگی کی عکاسی کی ہے جو اس زمانے کے صنعتی شہروں کی زندگی سے بالکل مختلف تھی۔ روزگر کی تحریروں سے اس کے بیانیہ اندازِ تحریر کی خوبی، اعلیٰ خیالات اور مشاہدے کی قوت کے ساتھ ساتھ خلوص کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ انھیں خوبیوں کی وجہ سے روزگر کی تحریریں خاص طور سے سوانحی تحریریں بہت زیادہ مقبول ہوئیں۔ اس کی مردم شماری کی رپورٹ میں بھی جو ہم یہاں بیان کر رہے ہیں، تمام خوبیاں یکجا ہو گئی ہیں اسکی تحریریں مقامی رنگ کا شاندار نمونہ ہیں جو ہر قسم کے گھٹیا جذباتیت سے پاک ہیں۔

کچھ ہفتے پہلے میں نے کاغذ قلم لے کر جنگل کی تمام جھونپڑیوں کا چکر لگایا۔ میں نے ہر گھر کے سربراہ سے ان کے حالات کے بارے میں معلوم کیا ان کے گھر میں کتنے فرد ہیں، ان کی پیدائش کے سن کیا اور بچوں کے نام کیا ہیں۔ یہاں پیدائش کا سال عام طور سے اس سال کے حالات اور پیش آنے والے واقعات کے حوالے سے یاد رکھا جاتا ہے۔ وہ ان گرمیوں میں پیدا ہوا تھا جب زبردست سیلاب آیا تھا یا وہ اس وقت دنیا میں آئی تھی جن سردیوں میں ہمیں گھاس کی ردی کھانی پڑی تھی ایسے واقعات اہم تاریخی واقعات کے طور پر یاد رکھے جاتے ہیں۔

ان کے ناموں میں بھی کوئی زیادہ فرق نہیں ہو تا مردوں کے نام عام طور سے ہینز، سیپ، برتھولڈ، یا ٹونی یا میتھنز ہوتے ہیں۔ عورتوں میں زیادہ تر کیتھرائن یا ماریا نام ہوتے ہیں جنھیں بگاڑ کر مینی، میرزل، میرل، ملّی، میرز، مارز وغیرہ پکارا جاتا ہے۔ اسی طرح اور دوسرے ناموں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص جوان کی برادری کا نہ ہو اور وہاں آئے تو جلد ہی اس کا نام بھی وہ اپنی زبان میں رکھ لیتے ہیں۔ کچھ عرصے تک وہ مجھے ائیدرے ڈل کہتے رہے لیکن اتنا لمبا نام مجھ جیسے چھوٹے آدمی کے لئے انھیں پسند نہیں آیا لہٰذا اب وہ مجھے صرف ریڈل کہتے ہیں۔

بہت کم لوگوں کو خاندانی ناموں کے بارے میں کچھ معلوم ہوگا۔ بہت سے تو شاید اپنے ہی خاندانوں کے نام بھول گئے ہوں گے۔ یہاں کے لوگ چیزوں کے تعلق کو بڑے ہی خاص انداز سے ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً ہنسل، ٹونی، سیپ کے ہاں۔ یہ ایک گھر کا نام ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سیپ کا مکان ہے جس کے باپ کا نام ٹونی اور دادا کا نام ہنسل تھا۔ اسی طرح کاٹھی، ہانی، میرز، مارگریٹ یعنی کاٹھی جو مارگریٹ کی سگڑ دادی ہے۔ یہ خاندان بہت عرصے تک اس جگہ رہا ہوگا۔

اسی طرح یہاں ایک آدمی کے نام کے ساتھ عموماً آدھی درجن نام لگے ہوتے ہیں اور ہر آدمی اپنے ساتھ اپنے آباؤ اجداد کے ناموں کا دم چھلّا لگائے رکھتا ہے۔ یہی چیز یہاں کی واحد میراث اور یادگار ہے۔

بہرحال یہ الجھن جاری نہیں رہنا چاہیئے۔ نام کلیسا کے رجسٹر کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔ خاندانی نام مسیحی ناموں کی طرح کے دریافت کئے جانے چاہئیں۔ اگر ہم کوشش کریں تو یہ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ لوگوں کے نام ان کی خصوصیات یا پیشوں یا حیثیتوں کے مطابق رکھے جائیں اور ان ہی ناموں کو آسانی کے ساتھ آئندہ بھی رکھا جا سکتا ہے۔

مثلاً لکڑی کا کام کرنے والے پال کا جس کی شادی اینا میرل سے ہوئی تھی، پورا نام ہسل فیرائنزل پال تھا۔ لیکن میں نے زیادہ عرصے تک اُسے اس نام سے نہیں پکارا

اور اس کا مختصر نام پال وڈنگ رکھ دیا اور اُسے اسی نام سے پکارنے لگا چونکہ وہ درختوں کے تنوں کو پھسلا کر کوئلے کی بھٹیوں تک پہنچانے کا کام کرتا تھا جسے یہاں کی زبان میں وڈنگ کہتے ہیں۔ اس لئے میں نے اس کے نام کے ساتھ یہ لفظ لگا کر اُسے پال وڈنگ کر دیا۔

ٹری ٹیپر (درختوں کی چھٹائی کرکے انھیں محفوظ رکھنے والا کارکن) سیپ جو اپنے والد کا نام بھول گیا تھا اُسے بھی اسی طرح صرف ٹری ٹیپر کہنا شروع کر دیا اب وہ اور اس کی اولاد چاہے جو کچھ بھی اپنا نام رکھے ٹری ٹیپر ضرور کہلائے گی۔

یہاں ایک جھونپڑی ہے چونکہ اُس کے سامنے چشمہ بہتا ہے اس لئے میں اسے اسپرنگ ہٹ کہتا ہوں اب میں اس کے مالک کو ہیسل، مائیکل، ہیسل، ہنز کہنے کے بجائے کیوں نہ مسٹر اسپرنگ ہٹ کہوں اسی طرح اس کی بیوی مسز اسپرنگ ہٹ کہلائے گی اور اگر اس کا لڑکا کہیں باہر جائے گا تو چاہے وہ سپاہی بنے یا گاڑی بان یا کچھ اور لیکن ہر جگہ اور ہمیشہ وہ اسپرنگ ہٹ ہی رہے گا۔

اسی طرح ایک شخص کو ہم نے اسٹارم ہینز کہا کیونکہ وہ طوفانی بھیڑیئے کی کھوہ میں پل کر جوان ہوا تھا۔ کوئلہ اٹھانے والا سیپ بہت چھوٹے قد کا تھا اور اس کی گردن پر بڑی سی رسولی تھی اس لئے اُسے بہت عرصے تک یوڈل نیک کہا جاتا رہا۔ ایک دن میں نے اس ٹھگنے آدمی سے پوچھا کہ اگر میں اس کا نام ان فہرست میں جوزف یوڈل نیک لکھوں تو اُسے کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔ وہ فوراً راضی ہو گیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اس کے بچے اور اس کے بچوں کے بچے بھی یوڈل نیک کہلائیں گے۔ یہ سن کر وہ مسکرایا اور بڑبڑایا کہ "مجھے اب چاہے دس ہزار بار یوڈل نیک کہا جائے" پھر اس نے کہا "خدا کا شکر ہے اب ہم لوگوں کا بھی نام ہوگا۔"

گھاٹی میں اونچے آبشار کے پاس فر کے تین سایہ دار درخت کھڑے ہوئے ہیں ان درختوں کو لکڑہارے جوزل، ہنسل، اینٹن نے اس لئے لگا رہنے دیا تھا تاکہ آدمی اور جانور ان کے سائے میں سستا سکیں۔ اس کے صلے میں اسے ہمیشہ کے لئے اینٹن شیلڈ

فر کہا جانے لگا۔

نئے ناموں کو پسند کیا گیا اور ہر شخص جس کو یہ نیا نام ملا تھا اب پہلے کی نسبت زیادہ خود اعتمادی سے سر اونچا کر کے چلتا تھا۔ اب اُسے پتہ تھا کہ وہ کون ہے۔ اب ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ اپنے نئے نام کے ساتھ اچھی شہرت حاصل کریں اور اُسے باوقار بنائیں۔

ایک آدمی تھا وہ خطرناک جنگلوں میں پھرا کرتا تھا مجھے نہیں معلوم کہ اس کا کوئی نام تھا یا نہیں اور اگر تھا تو وہ نام کیا تھا۔ ظاہر ہے کوئی برا ہی سا نام ہو گا۔ وہ آدمی مجھ سے اور ہر ایک سے ملنے سے کتراتا تھا۔ وہ اکثر لمبے عرصے کے لئے غائب ہو جاتا۔ کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ کہاں گیا اور پھر اچانک کسی وقت نمودار ہو جاتا وہ کہاں جاتا تھا اور پھر کیوں اچانک نمودار ہو جاتا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ میں نے اس کا نام لوفر رکھا۔

ولہیم رابے

"دی شڈرمپ"

ولہیم رابے ۱۸۳۱ء ۔ ۱۹۰۰ ایک حقیقت پسند انسان تھا اس نے زندگی کی حقیقت کو اُس کے اصلی روپ میں دیکھا تھا جس کی وجہ سے اُس کے خیالات میں قنوطیت پیدا ہوگئی تھی اور اسی لئے اُس نے تہذیب و تمدن پر بھرپور طنز کئے۔ اس نے روحانی قوتوں اور جذبات کو نجات کا ذریعہ اور انسانی فطرت میں اعتدال اور توازن برقرار رکھنے والی ایک ایسی قوت سمجھا تھا جس کو اپنا کر انسان سچائی اور حقیقت کو پا سکتا ہے۔ اسکے خیال میں یہی وہ شے ہے جو حسِ لطیف کو جلا بخشتی ہے اسکے ناول "شڈرمپ" ۱۸۶۹ء میں بھی اس کی اسی قنوطیت پسندی کا اظہار ہے۔ اینٹونیا ہاٹر ایک یتیم لڑکی ہے جو ایک دیہات لوئن ہوف میں پلی بڑھی ہے۔ زمیندار ہیننگ کی ماں نے اس کی بڑے ناز و نعم سے پرورش کی تھی۔ جب وہ سولہ سال کی ہوئی تو ایک شخص نے اپنے آپ کو اس کا دادا ظاہر کیا وہ ایک دھوکے باز شخص تھا جس نے اپنی فریب کاریوں سے کافی دولت جمع کر لی تھی۔ اس نے اپنے مستقبل کے منصوبوں کو کامیاب بنانے کے لئے اُسے ایک آدمی سے زبردستی شادی کرنے پر مجبور کر دیا۔ انٹونیا سے اس کا پُرسکون دیہاتی ماحول چھوٹ گیا اور اُسے ویانا جیسے بڑے شہر میں آ کر اعلیٰ طبقے کے ایسے گھناؤنے ماحول میں رہنا پڑا جس میں بے حیائی، خودغرضی اور لالچ کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ اپنی روح کی پاکیزگی کو بچانے کی کوشش کرتی ہے اور اسی کوشش میں بیمار ہو کر مر جاتی ہے اور اس طرح بدی جیت جاتی ہے۔

اسکوائر دان لوئن کی بے چینی اور بے قراری بڑھتی جا رہی تھی اس کے جاننے والے جو لوگ اس کی آسائشوں کو دیکھ کر اس پر رشک کرتے تھے وہ نہیں جانتے تھے کہ اس پر کیا گزرتی ہے وہ خود یہ سمجھتا تھا کہ وہ کروڈبیک میں زندگی کے دن اس طرح

گزار رہا ہے جیسے یہ اس کی زندگی نہیں ہے اب وہ اتنا بڑا ہوگیا تھا اور خود مختار بھی کہ اپنی مرضی کسی دوسرے پر ٹھونس سکے خواہ وہ اس کی ماں ہی کیوں نہ ہو چنانچہ اس نے کئی بار یہ کیا کہ اپنی مرضی کے مطابق کسی کام کے کرنے کا اعلان کیا لیکن اتفاق سے ہر مرتبہ اس کا یہ عمل بے محل اور بے موقع رہا۔

اس شام جب اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ وہ ایک بار پھر لمبے عرصے کے لئے باہر جائے گا اور اس کا یہ فیصلہ اُسے اور لوئن ہوف کے موجودہ سرپنچ ہر فرد سچلر کو ماننا ہی پڑے گا تو وہ بہت پریشان اور ناراض ہوئی۔ اس نے صاف صاف الفاظ میں کہدیا کہ اگر مجھے اس سفر پر نہیں جانے دیا گیا تو میں ختم ہوجاؤں گا۔ اس نے کہا تھا کہ میں گھر میں مستقل رہنے سے پہلے دنیا دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہر آدمی پیرس اور اٹلی میں رہا ہے لیکن ڈموئیش پہاڑ پر جانے کی اتنی شدید خواہش کا اظہار شاید کسی نے بھی نہیں کیا ہوگا اور خدا کے لئے کوئی اس کی یہ بات مان لے اور اسے ایک بار پھر اپنی زنجیریں توڑ لینے دے۔ اس نے ایک اچھے سردار گوئنر وان برلیچنگن کی طرح یہ وعدہ کیا کہ وہ اس کے بعد پھر کبھی کروڈ بیک کی حدود سے باہر قدم نہیں رکھے گا۔

ماں نے اسے سمجھانے بجھانے اور اس کی دلیلوں کو رد کرنے کی بھرپور کوشش کی اس نے غصے میں یہ تک کہہ دیا کہ کوئی اسکوائر وان لوئن کبھی اس طرح باہر نہیں گیا کہ جب ہیٹر کی طرح واپس آیا ہو تو بالکل خالی ہاتھ ہو۔ خاص طور سے سرزمین اٹلی کے بارے میں اس نے کبھی کوئی اچھی بات نہیں سنی تھی۔ وہ اسکوائر وان لوئن بھی جو سیلنچین برگ کے شہنشاہ لوتھر کے ساتھ وہاں رہا تھا، اپنی اولاد تک کو اس واہیات جگہ پر نہ جانے کی نصیحت کرگیا تھا اور نائٹ آف گلابیجرن تو اب بھی اس کو منحوس سمجھتا ہوگا۔

اس نے کھنکھارا اور اپنی بات جاری رکھی نائٹ آف گلابیجرن نے اس کے بارے میں واضح طور پر کچھ نہیں بتایا لیکن ڈی موئے سیلے آف سینٹ ٹرائن نے

اپنی یہ رائے صاف الفاظ میں بیان کر دی تھی کہ جہاں تک فرانس کا تعلق ہے وہ اس کی اتنی زیادہ مخالف نہیں تھی وہاں اور لین کے رہنے والے لوگ جمہوریت پسند اور بوناپارٹ کے حامی غرض سب راستے کے خطرات اور مشکلات میں ساتھ دیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ اتنا زیادہ دور نہیں تھا کہ اس کے لئے مہم جوئی کا شوق چرانے لگے۔

تمہارے جانے کا خیال بالکل احمقانہ اور فضول بات ہے اور میں اپنی طرف سے تمھیں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔ ویسے تمھاری مرضی ہے جو دل چاہے کرو۔ فرو ایڈل ہیڈوان لوئن نے دکھ کا اظہار کیا اور سخت اضطراب کے عالم میں میز پر سے اٹھ کر چلی گئی۔

یہ گفتگو فروری کی ایک طوفانی رات میں ہوئی تھی اس رات وہ اس قدر افسردہ تھی کہ طوفانی ہواؤں کی پرواکئے بغیر وہ صحن میں سے گزر کر اپنی خادمہ مالکی میئر کے کمرے کی طرف چلدی تاکہ اُس سے مل کر دل کا بوجھ ہلکا کر سکے۔ زندگی میں پہلی بار اس پر ٹھنڈ کا اثر ہوا اور وہ سخت بیمار ہوگئی۔

کچھ دن بعد جب وہ اپنے بستر میں دبکی ہوئی پڑی تھی۔ اس نے سخت بخار اور درد کے باوجود اپنے بیٹے کا سر کھینچ کر اپنے سینے سے لگالیا اور اس کے کان میں سرگوشی کے سے انداز میں کہنے لگی۔

"پیارے بیٹے، اس دنیا میں اگر مجھے کسی چیز سے نفرت ہے تو وہ لمبوترا چہرہ ہے ـــــ اور تم جانتے ہو ہیننگ کے تم ایک اچھے لڑکے ہو۔ تم جب یہ سوچتے ہو کہ اپنی نوجوانی کے دنوں میں کچھ کرو تو اس میں تم حق بجانب ہوتے ہو۔ میں نے بھی ہمیشہ وہی کچھ کیا ہے جسے صحیح سمجھا ہے اور لوگوں کی ناک بھوں چڑھانے کی کبھی پروا نہیں کی۔ ہیننگ میں تمھیں ایک بات بتانا چاہتی ہوں۔ لوئن ہوف پر تمھارا حق ہے۔ میں تمھارے پاس نائٹ اور ڈی موئے سیلی کو چھوڑتی

جارہی ہوں مجھے یقین ہے تم ان بے چاروں کا ہمیشہ خیال رکھو گے۔ اب جاؤ اور نائٹ کو میرے پاس بھیجدو۔ وہ بڑی قابلیت کا انسان ہے ہمیشہ آڑے وقت میں کام آتا ہے ہیننگ بیٹے تم نائٹ کی پوری پوری عزت کرنا اور اُسے اپنا بڑا سمجھ کر ہمیشہ اس سے مشورہ لینا حتیٰ کہ جب تم یہ سمجھو کہ تمھارا خیال زیادہ صحیح ہے اور اس کے مشورے پر عمل نہ کرنا چاہو تب بھی اس سے ضرور رائے لینا۔ میں نے ہمیشہ یہی کیا اور کامیاب رہی "

گوٹفرائیڈ کیلر

"گرین ہینری"

گوٹفرائیڈ کیلر (۱۸۱۹۔۱۸۹۰) کا تعلق سوئٹزرلینڈ سے تھا۔ اس نے اپنی بہت سی کہانیوں میں روشن حقیقتوں کو ہلکے پھلکے اور متاثر کرنے والے انداز میں بیان کیا ہے اس نے انسانی وجود کے تاریک اور خطرناک گوشوں کو بالکل نظرانداز کیا اور زندگی کے اعتدال پسند، صحت مند اور فطری پہلوؤں کو فخریہ بیان کیا ہے۔ کیلر کا بورژوا انداز فکر اور ریاست میں اس کا طبقاتی مقام اس کی اکثر تحریروں سے عیاں ہے۔ "گرین ہینری" ۱۸۵۴ء کے ابتدائی ناولوں میں سے ایک ہے جس میں اس کی شخصیت بطور ادیب اپنے پورے عروج پر نظر نہیں آتی۔ ہینرچ (ہنری) ایک مصور ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اسمیں فنکارانہ خوبیاں موجود ہیں۔ اگرچہ اس کی پرورش ایک شفیق ماں کے ہاتھوں اس کے وطن سوئٹزرلینڈ ہی میں ہوئی تھی تاہم اس میں جذباتی کج روی کی وجہ سے ایک طرح کی بے یقینی کی سی کیفیت اور قوتِ فیصلہ کی کمی کا عنصر پیدا ہو گیا تھا۔ میونخ میں اپنی تعلیم کے زمانے میں اسے انجانے خطروں کا احساس ہو گیا تھا اور وہ اپنے ماحول سے بہت زیادہ خوفزدہ رہنے لگا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ نہ صرف اپنے فن میں بلکہ زندگی میں بھی ناکام رہا۔ ذہنی انتشار کا شکار ہو کر جب وہ اپنے گھر واپس پہنچا تو وہاں اس کی ماں دل برداشتہ ہو کر فوت ہو چکی تھی۔ احساس تنہائی اور اپنے آپ کو مجرم سمجھنے کا احساس شدید ہو جانے کی وجہ سے ہینرچ خود بھی جلد ہی مر گیا۔ کئی سال بعد کیلر نے یہ ناول دوبارہ لکھا اور اس کا اختتام بدل دیا۔ اُس نے اس اختتام کو زیادہ مثبت انداز فکر کا حامل بناتے ہوئے اس میں دکھایا ہے کہ جب ہینرچ واپس آتا ہے تو وہ زندگی کے اصل مقصد کو پالیتا ہے جو قوم اور برادری کی تندہی سے خدمت کرنے میں مضمر ہے۔ ہمارے اس اقتباس میں ہینرچ سوئٹزرلینڈ میں اپنے آبائی گھر میں اپنی نوجوانی کے واقعات کو یاد کرتا ہے۔

کام کا آغاز

میں اُس وقت وہاں موجود نہیں تھا جب اینا اور اس کے والد اس رات وہاں سے روانہ ہوئے تھے اور اسی لئے وہ چلتے وقت مجھے الوداع نہ کہہ سکی۔ اگرچہ مجھے اس کو دوبارہ نہ دیکھ سکنے کا سخت افسوس تھا لیکن میں نے جوانی کی ترنگ میں اپنے ان جذبات کو چھپالیا۔ میں پورے ایک گھنٹے اپنے کمرے میں کھڑکی کے قریب لیٹا رہا اور دُور آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھتا رہا۔ چاند کی روپہلی کرنیں دور وادی میں روشنی پھیلا رہی تھیں اس کی شعاعیں میرے چہرے پر بھی پڑ رہی تھیں جو مجھے شبنم کی طرح میٹھی اور ٹھنڈی لگ رہی تھیں۔

مجھ پر ابھی تک شدید جذبات اور تصورات کا غلبہ تھا میں دوسرے کمرے میں اپنے رشتہ داروں کے پاس چلا گیا وہاں ایک پڑوسی جو کارخانہ دار تھے میرا انتظار کر رہے تھے تاکہ مجھے اپنی چھوٹی سی گاڑی میں شہر لے جائیں۔ یہ بات پہلے سے طے ہوگئی تھی کہ میرا واپسی کا انحصار ان صاحب کے شہر جانے پر ہے کیونکہ وہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں شہر جانے والے تھے اس لئے یہ طے کرلیا گیا تھا کہ جب وہ جائیں گے تو مجھے بھی ساتھ لے جائیں گے کیونکہ ان کے ساتھ میرا سفر آرام سے گزرے گا۔ میں نے اس سلسلے میں زیادہ معلوم نہیں کیا تھا۔ البتہ یہ کارخانے دار صاحب میری توقع سے پہلے ہی تشریف لے آئے تھے میرے چچا اور ان کے بیوی بچوں کا کہنا تھا کہ میں ابھی ان صاحب کے ساتھ نہ جاؤں اور کچھ دن اور یہاں رہوں۔ میرا اپنا دل بھی اینا اور پُرسکون جھیل کو یاد کر کے رنجیدہ ہو رہا تھا۔ لیکن میں نے ان لوگوں کو یقین دلایا کہ میرا اس وقت جانا اور اس موقع سے فائدہ اٹھانا بہت ضروری ہے۔ میں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا۔ اپنا سامان اکٹھا کیا اور رشتے داروں سے رخصت ہو کر کارخانہ دار کے ساتھ اس کی چھوٹی سی گاڑی میں آ بیٹھا جو فوراً ہی گاؤں کی طرف چل دی اور وہاں سے پھر شاہراہ پر آگئی۔ میں نے یہ سب کچھ گھبراہٹ میں اس لئے کیا کہ ایک تو مجھے یہ خیال ہوگیا تھا کہ یہ لوگ فوراً سمجھ جائیں گے کہ میں

یہاں اینا کی وجہ سے ٹھہرا ہوا ہوں اور میں اُس سے محبت کرنے لگا ہوں دوسرے اپنے اس نامعلوم جذبے کے تحت بھی میں ایسا کرنے پر مجبور تھا جو میری کسی رائے یا فیصلے کو قائم نہیں رہنے دیتا اور جس کی میں وضاحت کرنے سے قاصر ہوں۔

ابھی میں گاؤں سے سو ہی قدم دور گیا ہوں گا کہ میں اپنی روانگی کے فیصلے پر پچھتانے لگا۔ میرا دل چاہا کہ میں گاڑی سے نیچے چھلانگ لگا دوں اور واپس چلا جاؤں۔ میں نے اپنا منہ پہاڑیوں کی طرف پھیر لیا جو جھیل کے چاروں طرف واقع تھیں اور انھیں بے مقصد گھورنے لگا۔ ان پہاڑیوں کا منظر گہرے سرمئی رنگ میں تبدیل ہو رہا تھا اور ان کا سائز بھی میری آنکھوں کے سامنے گھٹتا جا رہا تھا۔

گھر پہنچنے پر پہلے کچھ دن تو میں ایسا کھویا کھویا سا رہا کہ یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ میں کہاں ہوں۔ شہر کے شریفانہ ماحول کے باوجود میری آنکھوں کے سامنے گاؤں کا وہ منظر تھا جو مجھے جنت کی طرح پُرسکون معلوم ہو رہا تھا اور اب مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ ماحول کتنا خوبصورت، سادہ، ریا کاری سے پاک اور پُرسکون تھا۔ جب کبھی میں اپنے شہر کے باہر سب سے اونچی چوٹی کو دیکھتا جس کے پیچھے دور اُفق کے نیلے پس منظر میں زمین کا وہ ٹکڑا تھا جس پر وہ گاؤں آباد تھا، جس کے قریب اسکول ماسٹر کی جھیل تھی، تو مجھے یہ منظر سب سے اچھا معلوم ہوتا مجھے اس طرف سے آنے والی ہوا زیادہ صاف اور فرحت بخش معلوم ہوتی اور بہت دور واقع وہ دھبہ سا جو نیلگوں دھندلکے میں چھپا ہوا تھا اور مجھے نظر نہیں آتا تھا اور جہاں اینا کا گھر تھا، مجھے اس پورے روئے زمین پر سب سے زیادہ پُرکشش معلوم ہوتا۔ حتیٰ کہ جب گھاٹی سے نیچے اترتے ہوئے وہ نقطہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تو میں آسمان کے اس کنارے کو دیکھ کر تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتا جو وہاں تک پھیلا ہوا تھا۔

اُدھر میرے لیے یہ سوال پھر اُٹھ کھڑا ہوا کہ مجھے کونسا پیشہ اختیار کرنا چاہیئے اور یہ مسئلہ روز بروز زیادہ شدید ہوتا گیا کیونکہ میں اب اس بارے میں فیصلہ کیے

بغیر مزید بیکار نہیں رہ سکتا تھا۔

میں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور اپنی اس بدنصیبی کو کوس رہا تھا کہ اب مجھے مصوری کے شوق کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ میری ماں سے میرا یہ دکھ نہ دیکھا گیا اور اس نے دوبارہ سوچنا شروع کیا اور آخرکار مجھ سے کہہ دیا کہ چاہے کچھ بھی ہو میں تمھاری مرضی کے خلاف تمھیں کچھ کرنے پر مجبور نہیں کروں گی۔ تم جو چاہو کر سکتے ہو۔

چنانچہ میری ماں نے ایک ایسے آدمی کو تلاش کرلیا جو شہر سے باہر عورتوں کے ایک پرانے کانونٹ میں عجیب وغریب فن کا مظاہرہ کیا کرتا تھا۔ وہ بیک وقت ایک مصور، تانبے پیتل کی چیزوں پر کھدائی کرنے والا چھپائی کے لئے پتھر کی پلیٹیں بنانے والا اور چھپائی کا کام کرنے والا سب ہی کچھ تھا۔ وہ سوئٹزرلینڈ کے مشہور ومعروف مناظر کو ایک ایسے انداز میں جو بہت پرانا ہو گیا تھا، پیتل پر کھودتا، ان کی نقلیں چھاپتا اور انھیں نئے نئے لڑکوں سے رنگ کراتا۔ یہ تصویریں وہ سب جگہ بیچتا اور ان سے کافی پیسے کماتا۔

اس کے اس تمام کام میں اس کے کچھ ہونہار شاگرد اس کی مدد کرتے رہتے تھے اور وہ لوگ جس جگہ یہ کام کرتے تھے وہ غالباً کسی زمانے میں اس کانونٹ میں کھانے کا کمرہ رہا ہوگا۔ یہ ایک لمبا سا کمرہ تھا جس کی دونوں طرف کی دیواروں میں آدھی درجن کے قریب لمبوتری کھڑکیاں تھیں۔ ان کھڑکیوں میں چھوٹے چھوٹے گول شیشے لگے ہوئے تھے جن میں سے روشنی تو چھن کر ضرور اندر آجاتی تھی لیکن بہت زیادہ دھندلے ہوجانے کی وجہ سے ان شیشوں میں سے باہر کا منظر نظر نہیں آتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ایک صنعت کے طور پر چلنے والے آرٹ کے اس اسکول کی تجارت میں بہت منافع ہو رہا تھا۔ ان میں سے ہر کھڑکی میں آرٹ کا ایک طالب علم کھڑا رہتا تھا جس کی پشت اپنے پیچھے والے آدمی کی طرف ہوتی تھی اور نگاہیں اس کے سامنے والے آدمی کی گدی پر۔ اس کے شاگردوں کی اس فوج میں چار پانچ نوجوانوں کو خاص اہمیت حاصل تھی جن میں سے کچھ لڑکے تھے جو

سوئٹزرلینڈ کے خوبصورت مناظر کی تصویر کشی کرتے اور انھیں شوخ رنگوں سے بھرتے۔ اس کے بعد ایک بیمار سا آدمی آیا جو مسلسل کھانس رہا تھا۔ اس نے پیتل کے ٹکڑوں کو بیردزے سے مانجھنا شروع کر دیا۔ وہ پیتل کی چیزوں پر کھدائی کرنے والا تھا۔ اس کے بعد لیتھوگرافر آیا۔ وہ ایک خوش مزاج اور بے تکلف قسم کا انسان تھا۔ جس کا حلقہ مالک کے بعد سب سے زیادہ وسیع تھا۔ اس کمرے کے پیچھے دو سیاہ فام لڑکے کام کر رہے تھے وہ پیتل اور پتھر میں کھدائی کرنے والوں کے نائب تھے ان کے ہاتھوں میں بہت پھرتی تھی اور وہ اپنے اپنے پریس کے ساتھ کھڑے ہو کر آرٹسٹ کے ڈیزائن کا چربہ کاغذوں پر اتار رہے تھے سب سے آخر میں اس پورے مجمع کے پیچھے مالک تھا جس کا نام مسٹر ہیبرساٹ تھا اور جو آرٹسٹ اور آرٹ کے کاموں کا ڈیلر، پیتل پر کھدائی اور لیتھو گرافی کے ایک ادارے کا مالک تھا۔ وہ ہر اس کام کے لئے تیار تھا جو آپ اُس کے سپرد کرنا چاہیں۔ اپنی میز پر بیٹھ کر وہ ہر چیز پر نظر رکھتا اور سب سے زیادہ اہم اور مشکل کام میں مصروف رہتا۔ وہ عام طور سے حساب کتاب کرتا رہتا، خطوں کے جواب لکھتا رہتا یا اُن چیزوں کی پیکنگ کراتا رہتا جو اس کے ادارے میں تیار ہو کر باہر بھیجی جانے والی ہوتیں۔

میری ماں کو کسی نے مشورہ دیا تھا کہ وہ اس بارے میں اُس سے ملاقات کرے اور اُس کے کاروبار کو دیکھے، چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے خاص طور سے یہ بات کی کہ وہ مجھ سے محض کام لینے کے بجائے مجھے اپنے بہترین فن سے آگاہ کرے اور اس کے لئے میری ماں نے اُسے کافی فیس دینے کا وعدہ کیا۔ وہ اس کام کے لئے تیار ہو گیا اور بخوشی ایک نوجوان کو صحیح قسم کا آرٹسٹ بنانے پر رضامند ہو گیا اس نے میری ماں کے اس جذبے کی بھی تعریف کی کہ وہ اس کام کے لئے رقم خرچ کرنے کے لئے تیار تھی۔ میری ماں یہ سمجھتی تھی کہ اب وقت آگیا ہے کہ وہ اپنی کفایت شعاری کو ختم کر کے میرے اس ارادے کی تکمیل کے لئے روپیہ خرچ کرے۔ چنانچہ

ایک معاہدہ ہوگیا جس کے تحت باقاعدگی کے ساتھ ہر تین ماہ بعد فیس ادا کی جاتی تھی اور مجھے دو سال اس جگہ گزارنے تھے تاکہ آرٹ کی تربیت حاصل کر سکوں جو میرے لئے نہایت مفید ثابت ہو۔ دونوں فریقوں کی طرف سے اس معاہدے پر دستخط ہو جانے کے بعد ایک پیر کی صبح کو میں اس پرانی خانقاہ میں پہنچ گیا اور اپنی پچھلی کاوشوں کے نمونے بھی اپنے ساتھ لے گیا تاکہ طلب کرنے پر انہیں دکھا سکوں۔ میرے یہ عجیب و غریب کاغذات دیکھ کر اس نے خوشی کا اظہار کیا اور میرے شوق اور عزم کی تعریف کی۔ اُس نے اپنے ادارے کے لوگوں سے میرا تعارف کرایا۔ اُس نے کہا کہ وہ ایک شاگرد کو باقاعدہ تربیت دے کر اور اس میں اپنی پوری زندگی کے تجربات اور فن کو ودیعت کرکے بہت خوش ہوگا۔

رنگ کرنے والے ایک نوجوان لڑکے کو کھڑکی کے پاس سے اپنی جگہ چھوڑنی پڑی اور وہ کسی دوسرے کے پیچھے جا بیٹھا۔ اور اس کی جگہ مجھے کھڑا کر دیا گیا۔ میں خالی میز کے سرے پر کھڑا ہوا پُراشتیاق نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا اور اپنے کام کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں مسٹر ہیبرساٹ نے اپنے تھیلے سے ایک منظر کی تصویر نکالی یہ لیتھو پر چھپی ہوئی کسی تصویر کا خاکہ تھا۔ ایسی تصویریں میں اسکول میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ سب سے پہلے مجھے نہایت احتیاط کے ساتھ اس تصویر کی نقل کرنی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اُسے شروع کرنے کے لئے بیٹھتا مالک نے مجھے واپس بھیجا کہ میں کاغذ اور پنسل لے آؤں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ کام کس طرح شروع کرنا ہے اس لئے میں نے ان دونوں چیزوں کے بارے میں بالکل سوچا ہی نہیں تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مجھے کن کن چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ چونکہ میرے پاس پیسے نہیں تھے اس لئے میں واپس گھر گیا اور پھر مطلوبہ چیزیں خریدنے کے لئے ایک دکان میں گیا جہاں سے میں نے اچھا اور عمدہ قسم کا سامان خریدا۔ جب میں دوبارہ وہاں پہنچا تو اس وقت دوپہر ہونے میں آدھا گھنٹہ رہ گیا تھا۔ یہ تمام باتیں کہ انھوں نے مجھے کام شروع کرنے کے لئے کاغذ کا ایک ٹکڑا اور

پنسل تک نہیں دی بلکہ یہ سب لانے کے لئے واپس بھیج دیا اور مجھے بیکار سڑکوں پر پھرنا پڑا اور اپنی ماں سے پیسے بھی مانگنا پڑے اور پھر مجھے اس وقت کام کرنے کو دیا گیا جب ہر شخص دوپہر کے کھانے کے لئے چلا گیا۔ یہ سب باتیں میرے تخیل کے خلاف تھیں جو میں نے ایک آرٹ کے ادارے کی کارکردگی کے بارے میں قائم کیا تھا۔ اس سے میں دل برداشتہ ہوگیا۔

تاہم میرا یہ پہلا تاثر جلد ہی دور ہوگیا کیونکہ انھوں نے مجھے میری توقع سے زیادہ کام دیا، ہیبرساٹ مجھے کام سکھانے پر خاص توجہ دیتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ میں بالکل اسی سائز میں نقل بناؤں جیسا کہ وہ اصل میں ہے۔ لیکن میری نقل ہمیشہ اصل سے بڑی رہتی البتہ اتنا ہوتا کہ اس کا تناسب بالکل صحیح رہتا اس کو وہ مجھے بتاتا کہ آرٹ کتنی مشکل چیز ہے اور پیار سے مجھے یہ بھی سمجھاتا کہ یہ کام اتنی جلدی کا نہیں جتنا کہ میں سمجھتا ہوں۔

شروع شروع میں اُس نے مجھے آزادانہ کام نہیں کرنے دیا کیونکہ میں شفاف گہرے اور کھردرے رنگوں میں تمیز نہیں کرسکتا تھا اس نے اس زمانہ میں خاکے اور ہیئت پر زیادہ توجہ دی۔ لیکن بعد میں مسلسل مشق کی وجہ سے میں اس کی تہہ تک پہنچ گیا اور برش کی مدد سے میں نے ایک خاص طرز کی بہت سی تصویریں بنا ڈالیں۔ مجھے بس یہی پتہ تھا کہ میں نے اتنی تعداد میں تصویریں بنائی ہیں۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میرے تھیلے کا حجم بڑھ رہا ہے۔ جہاں تک پسند کا تعلق ہے ان میں اس وقت سب سے زیادہ متاثر کرنے والی تصویریں بھی مجھے بعد میں مشکل ہی سے اچھی لگیں میں نے پہلی سردیاں ختم ہونے سے پہلے ہی اپنے ماسٹر کی دی ہوئی سب نقلیں پوری کرلی تھیں اور شاید اسی طرح بنائی تھیں جس طرح کہ وہ خود بنا سکتا تھا۔ مجھے یہ احساس ہوگیا کہ میں نے کام سمجھ لیا ہے اور اب اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے زیادہ محتاط اور صاف ستھرے طریقے سے کام کرنے کی ضرورت ہے میں نے رنگوں کو بے ترتیبی سے ملانے کی بہت حد تک کی آسان ڈگری جلد حاصل کرلی تھی اصل میں یہی ڈگری خود ماسٹر کے پاس بھی تھی لیکن میں نے شاید یہ ڈگری اس سے بھی پہلے حاصل کرلی تھی کیونکہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے میرے کام کا معیار بہت پست تھا۔

تھیوڈور اسٹارم

تھیوڈور اسٹارم (۱۸۱۷ء تا ۱۸۸۸ء) ایک ایسا ادیب ہے جس کی کہانیوں میں داخلیت زیادہ ملتی ہے۔ وہ معاشرہ کی تصویر کشی سے زیادہ انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کو اہمیت دیتا ہے۔ اس کی کہانیوں میں جا بجا ایسے مسائل ملتے ہیں جن کا لوگوں کے باہمی تعلقات سے گہرا ربط ہے۔ اکثر مضامین حزنیہ ہیں لیکن ان میں بھی بیان کی رنگینی اور زبان کی چاشنی موجود ہے۔ اس کی تمام کہانیوں میں اس کے اپنے وطن شمالی جرمنی کی مکمل تصویر نظر آتی ہے۔

سفید گھوڑے کا سوار :۔ یہ اس کی آخری کہانی ہے لیکن تمام کہانیوں سے بہتر ہے۔ اس میں ایک ایسے نوجوان کی داستان بیان کی گئی ہے جس نے اپنی زندگی سخت جدوجہد میں گذاری۔ جب وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو مقدر آڑے آیا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناکامی کے سمندر میں غرق ہوگیا۔ اس نوجوان کا نام "ہاک ہین" تھا۔ اس کا خسر بہت بڑا افسر تھا جو ساحل سمندر پر ایک پشتہ تعمیر کرا رہا تھا۔ اس علاقے کے لوگوں کے لئے یہ پشتہ زندگی اور موت کے درمیان حد فاصل کی حیثیت رکھتا تھا۔

کیونکہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ سمندر کی طوفانی لہریں علاقوں میں پھیل جاتی تھیں جس کے نتیجے میں اس علاقے کے گاؤں کے گاؤں نذرِ آب ہو جاتے تھے۔ ہاک ہین نے اپنے خسر کے ساتھ اس کام میں ہاتھ بٹایا۔ اسے اپنے وطن سے بے پناہ محبت تھی۔ اس نے شب و روز محنت کی اور پشتہ کو تعمیر کرایا۔ بد قسمتی سے ایک دن خسر کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ اس کی جگہ ہاک ہین کو افسرِ اعلیٰ مقرر کر دیا گیا۔

ہین نے اب پہلے سے بھی زیادہ دلچسپی سے پشتہ کی تعمیر مکمل کرائی ۔ اس کے بعد اس کے سامنے کی زمین پر کام شروع کرایا۔ یہ زمین بڑی زرخیز اور ساتھ ہی ساتھ ہموار بھی تھی۔ اس نے طے کیا کہ اُسے عظیم سبزہ زار میں منتقل کردیا جائے۔ چنانچہ کاشتکاروں سے زمینیں حاصل کرکے وسیع و عریض سبزہ زار تیار کرایا گیا۔ اس کا نام سرکاری طور پر ایک شہزادی کیرولین کے نام پر نیو کیرولین سبزہ زار رکھا گیا۔ لیکن عوام الناس اُسے ہاک ہین سبزہ زار کہا کرتے تھے۔ ہین نے جب یہ سنا کہ اُسے اس کے نام سے پکارا جارہا ہے تو اس کا سر فخر سے بلند ہوگیا۔ وہ اپنے سفید گھوڑے پر بیٹھ کر سارے علاقے کا معائنہ کرتا۔ اُسے ایسا لگتا جیسے کہ یہ سارا علاقہ اس کی اپنی انتھک جدوجہد کا انعام ہے۔ اس کا نام ابد تک زندہ و پائندہ ہوچکا ہے اس کے کانوں میں ہر وقت "ہاک ہین سبزہ زار" ہاک ہین سبزہ زار" کے الفاظ گونجا کرتے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ پشتہ اور سبزہ زار دنیا کے آٹھویں عجائب ہیں۔

ہاہین نے اس پشتہ کی تعمیر کی خوشی میں ایک دن زبردست جشن کا اہتمام کیا۔ بڑے بڑے سرکاری افسر ضیافت میں شریک ہوئے۔ بعدہٗ سب نے پشتہ کا معائنہ کیا۔ معائنہ کے دوران ان لوگوں نے شمال مغرب کی سمت سے ٹھنڈی ہوائیں اور سمندر میں طوفانی موجیں اٹھتی دیکھیں ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر کا پانی پشتہ سے ٹکرا رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے دیکھا کہ پشتہ کی مٹی بہہ بہہ کر نیچے جارہی ہے لیکن ان کا یہ اعتراض افسرانِ اعلیٰ کی موجودگی میں حلق ہی میں اٹک کر رہ گیا۔ کسی کی ہمت نہ پڑی کہ اس کی خامیاں بیان کرسکے البتہ تعریفیں کرنے والے متعدد تھے۔

کچھ ہی عرصہ گزرا ہوگا کہ یہ عظیم الشان پشتہ سمندر کی لہروں میں تحلیل ہوگیا۔ پانی سبزہ زار میں داخل ہوگیا۔ نوآبادکاروں میں تباہی پھیل گئی اور

ہاک ہین کی آنکھوں کے سامنے اس کی زندگی بھر کی کمائی خاک میں مل گئی۔قدرت نے اسی پر اکتفا نہ کی۔ آناً فاناً اس کی بیوی اور بچے سمندر کی لہروں کی نذر ہو گئے ہاک ہین بڑے پُر اعتماد انداز میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوا ایک نظر ٹوٹے ہوئے پشتے پر ڈالی اور سمندر کی گہرائیوں میں کھو گیا۔

شاہی یونیورسٹی کے کیوریٹرز کی خدمت میں!

ہنوور کے باشندے ۱۸۳۳ء میں ایک حریت پسند اور تعصبات سے بلند آئین بنوانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لیکن چار سال بعد ہی نئے بادشاہ ارنسٹ آگسٹ کے تخت نشین ہوتے ہی اس آئین کو مسترد کر دیا گیا شاہی اعلامیہ میں اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ اس آئین کی منظوری کے وقت شاہ اور عوامی نمائندوں میں کامل اتفاق رائے نہیں تھا۔اس کے علاوہ شاہ کے اعزا و اقربا دنیز حکومت کے حقوق کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں دی گئی تھی۔ شاہی اعلامیہ کی مخالفت کی کسی کو جرأت نہ ہوئی اس راہ میں سب سے پہلے گاٹنجن یونیورسٹی کے سات پروفیسر آگے بڑھے۔انھوں نے یونیورسٹی کے کیوریٹرز کے نام ایک مشترکہ اجتماعی مراسلہ روانہ کیا۔پروفیسروں کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ اس مراسلے کی تشہیر ہو وہ تو یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد کو اپنے جذبات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے لیکن بُرا ہو ان اخبار والوں کا جنھوں نے اس مراسلے کو شائع کر کے تمام دنیا میں پھیلا دیا۔سارے جرمنی میں آگ سی لگ گئی۔شاہ نے ان ساتوں پروفیسروں کو برطرف کر دیا اور ان میں سے تین کو ملک بدر کرنے کے احکامات صادر کر دیئے۔تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا۔حق کی آواز نے قوم کے تنِ مردہ میں ایک نئی روح پھونک دی ــــــ گیارہ سال بعد یہی ساتوں پروفیسر فرینکفرٹ قومی اسمبلی کے رکن بن کر قوم کی نمائندگی کرنے لگے۔

ذیل میں ان کے مراسلے کو مختصراً پیش کیا جا رہا ہے
گاٹنجن

۱۸ نومبر ۱۸۳۷ء

شاہی یونیورسٹی کے چند اراکین کے نیازمندانہ معروضات
یکم نومبر کے شاہی اعلامیہ کے بارے میں

ہم دستخط کنندگان ذیل اپنے ضمیر کی پکار سے مجبور ہو کر یونیورسٹی کے کیورٹیروں کی خدمت میں چند گزارشات پیش کر رہے ہیں۔

ہم شاہی فرمان کے احترام میں کوئی کمی کئے بغیر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارے ضمیر اس دعوے سے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں کہ اساسی آئینی قانون کو ناجائز قرار دے دیا جائے کیونکہ آنجہانی بادشاہ نے اس قانون کی تکمیل کے وقت معاہدہ کو بنیاد نہیں بنایا۔ اس کے بجائے اسمبلی کی بعض تجاویز کو مسترد کر دیا اور اسمبلی کے مشورے کے بغیر بعض ترامیم شامل کر دیں۔ اس سلسلے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ مسلّمہ قانونی ضوابط کے مطابق جائز کو خلاف قانون طریقوں سے کالعدم نہیں کیا جا سکتا۔ شاہی فرمان میں جن بے قاعدگیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ مخصوص شعبوں کے بارے میں ہیں اُن کے کالعدم قرار دیئے جانے سے پورے کے پورے آئین پر ضرب نہیں پڑتی۔ اسی طرح اگر اساسی آئینی قانون کی بدولت شاہ کے لواحقین کے حقوق متاثر ہوتے ہیں تو ان شقوں کی ترمیم ہو سکتی ہے البتہ اس موقع پر یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ لواحقین کے حقوق کی خاطر آئین میں ترمیم خود شاہی اختیارات پر پابندی عاید کر سکتی ہے جہاں تک شاہ کے اختیارات خصوصی کا تعلق ہے ہم دستخط کنندگان ذیل بڑے ادب سے گزارش کرتے ہیں کہ اساسی آئینی قانون ان پر کوئی قیود عاید نہیں کرتا۔ اس قسم کے تمام الزامات بے بنیاد ہیں۔ ۲۶ ستمبر ۱۸۳۳ء کے آئین میں شاہی اختیارات اور مراعات کو اس قدر اور مکمل تحفظ دیا گیا تھا کہ جرمن وفاقی اسمبلی نے نہ صرف اسی ایک کام کے لیے ایک کمیشن مقرر

کیا تھا جس نے کافی غور و خوض کے بعد اپنی تجاویز مرتب کی تھیں اور اسمبلی نے انھیں منظور کیا تھا۔ پھر یہ کہ اسمبلی کے ایک رکن نے بھی اس جزو پر اعتراض نہیں کیا۔ اس کے برخلاف اس آئین کی صحتمند میانہ روی اور محتاط انداز کی سارے جرمنی میں تعریفیں ہوئیں۔ پس اگر ہم فدویان مسئلہ کے تمام نشیب و فراز پر خوب اچھی طرح غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ اساسی آئینی قانون اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے ہر طرح باضابطہ اور جائز ہے تو پھر ہمیں اس کی مذمت پر رضامند نہیں کیا جا سکتا تاوقتیکہ ہم اپنے ضمیر کا گلا نہ گھونٹ دیں گو ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس مقصد کی پشت پر ایک بہت بڑی طاقت موجود ہے جو ہر قسم کی بازپرس سے بے نیاز ہے۔ بریں بنا ہم ببانگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ ہم ہمیشہ کی طرح اب بھی اپنے فرض سے غافل نہیں رہ سکتے۔ ہم اساسی آئینی قانون پر حلف کے پابند ہیں اس لئے ہم اساسی آئینی قانون کے ماسوا کسی دوسرے اصول یا قاعدے کی بنیاد پر نہ تو اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیں گے نہ کسی نامزدگی کو قبول کریں گے۔ اور نہ اسمبلی کی آئینی حیثیت کو تسلیم کریں گے۔

ہم دستخط کنندگان ذیل اپنے دستخطوں کے ساتھ اپنے نام بھی فرداً فرداً لکھ رہے ہیں تاکہ آنجناب کو ہمارے درمیان مکمل اتفاق رائے کا اندازہ ہو جائے اور اگر کسی وقت کوئی تنازعہ کھڑا ہو تو ہم میں سے کسی سے بھی رابطہ قائم کیا جا سکے۔ ہم ہر وقت اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم نے ہمیشہ اپنی سرکاری ذمہ داریوں کو بدرجۂ اتم پورا کیا ہے، طلبہ کو سیاسی انتہاپسندی میں ملوث ہونے سے بچایا ہے اور حتیٰ الامکان انھیں حکومت کا وفادار بنانے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال ہماری تمام مساعی کی کامیابی کا بیشتر دارومدار علمی اقتدار سے زیادہ ذاتی کردار پر ہے۔ اگر ہم ایک طرف

قمار بازی میں پڑے رہیں اور دوسری طرف پند و نصائح کے دفتر کھولیں تو نوجوان سے ہماری تعلیمات کا اثر زائل ہونا لازمی ہے۔ آپ خود ہی بتائیے کہ اگر ہم ایک طرف شاہ معظم کی وفاداری کا حلف اٹھائیں اور دوسری طرف اِس حلف کی دھجیاں بکھیر دیں تو شاہ معظم کی عزت و تکریم میں کیونکر اضافہ ہو سکتا ہے؟

ایف سی ڈاہلمین، ای۔ البرخت، جیکب گرم، دلہلم گرم، جی گرفیس، ایچ ایوالڈ، ولہلم دیبیر۔
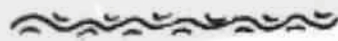
کارل مارکس

کارل مارکس (۱۸۸۳ - ۱۸۱۸) نے سیاسیات، فلسفہ اور تاریخ کی تعلیم برلن اور بون میں حاصل کی ۱۸۴۳ء میں وہ پیرس آگئے۔ یہاں انھوں نے فریڈرک انجیلز کے ساتھ مل کر تعلیمی کام شروع کیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد انھیں پروشین حکومت کی درخواست پر کمیونسٹ تحریروں کی بنا پر پیرس سے نکال دیا گیا چنانچہ وہ برسلز چلے گئے لیکن یہاں بھی انھیں چین نصیب نہ ہوا ۱۸۴۸ء میں یہاں سے بھی جلا وطن ہونا پڑا۔ بالآخر انھوں نے لندن میں مستقل سکونت اختیار کی۔ مالی اعتبار سے یہ زمانہ ان کے لئے انتہائی تنگدستی اور حسرت کا تھا لیکن اُن کی شہرۂ آفاق تصنیف "داس کیپٹال" یہیں تحریر ہوئی جو سائنس اور فلسفہ کے امتزاج کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ اس کی پہلی جلد انگریزی زبان میں ۱۸۵۶ء میں شائع ہوئی۔ باقی حصے ۱۸۸۵ء اور ۱۸۹۴ء میں شائع ہوئے۔ مارکس کے مغربی ممالک کی مزدور تحریکوں کے قائدین سے براہ راست رابطے قائم تھے۔

ذیل میں مارکس کا ایک خط دیا جا رہا ہے جو انھوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں اپنے والد کے نام لکھا تھا۔ اُس وقت ان کی عمر محض ۱۹ سال تھی

اور وہ یونیورسٹی میں سال اوّل کے طالب علم تھے۔ یہ خط مارکس کے ذہنی ارتقا کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس عمر میں ہی ان کا ذہن، شعور کی اس منزل پر فائز تھا کہ انھوں نے قیاسی عینیت پسندی کی کھلی مذمت کی تھی۔ وہ ایک ایسی دنیا کی تلاش میں تھے جہاں سائنس کی حکمرانی ہو اور تجربات کی روشنی۔ اس خط میں کہیں کہیں جینی کا ذکر آیا ہے یہ مارکس کی منگیتر کا نام ہے جو بعد میں ان کی بیوی بن گئی۔

برلن

۱۰ نومبر ۱۸۳۷ء

پیارے آبا جان!

زندگی میں بعض لمحے ایسے بھی آتے ہیں جو سرحدی ستونوں کی طرح ایک دور کے اختتام اور دوسرے دور کی نئی سمت کا تعین کرتے ہیں۔

ایسے عبوری مرحلے میں ہمیں اپنے ذہن کی عقابی نظروں سے ماضی و حال کا جائزہ لینا چاہیئے تاکہ ہماری حیثیت کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکے۔ عالمی تاریخ شاہد ہے کہ اس قسم کی خود احتسابی اور ماضی فہمی ہمیشہ پسندیدہ سمجھی گئی ہے۔ حالانکہ اس طرزِ عمل کو بالعموم گڑے مردے اکھاڑنے یا تساہل پر محمول کیا جاتا ہے مگر فی الواقع اس کا مقصد کامل اطمینان قلب کے ساتھ ماضی اور اس کے اعمال کا دانشمندانہ جائزہ اور ذہن کا امتحان ہے۔

عام طور پر لوگ ایسے لمحات میں اپنا مزاج شاعرانہ بنا لیتے ہیں۔ کیونکہ ہر تبدیلی نغمہ بھی ہوتی ہے اور کسی شاہکار نظم کا ابتدائیہ بھی۔ ایسی نظم جس میں شاندار مگر مبہم رنگوں میں سے صحیح نغمہ بیدار کرنے کی سعی موجود ہو۔ بایں ہمہ ہمیں ماضی کے تجربات کی ایک یادگار قائم کرنی چاہیئے۔ انھیں ہمارے احساسات و جذبات میں وہ مقام ملنا چاہیئے جو انھیں عمل کے میدان میں نہ مل سکا۔۔ اور والدین کے قلوب سے بڑھ کر ان کی پناہ گاہ اور کیا ہو سکتی ہے۔۔؟ ان کے قلوب نہایت نرم خو منصف، مخلص ترین ہمدرد اور محبت کے ایسے آفتاب ہیں جن کی تپش ہماری مساعی کو حرارت بخشتی ہے۔ آپ ہی فرمایئے کہ قابلِ اعتراض اور لائقِ گرفت اعمال سے نجات حاصل کرنے اور معافی طلب کرنے کا اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے

ہے کہ انھیں اشد ضرورت کا لازمی نتیجہ قرار دے دیا جائے کیونکہ کبھی کبھی اتفاقات کی بدزیب صورتیں جو غلطیوں کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں دل کی کھوٹ کے الزام سے بری ہو سکتی ہیں۔؟

اس لئے اگر اب ایک سال بعد میری آنکھیں گذشتہ حالات پر جا کر ٹھہر جاتی ہیں تو اے میرے پیارے بابا۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنی حالت پر بھی غور کرتا چلوں جس طرح میں زندگی پر گہری نظر ڈالتا ہوں اور اُسے ذہنی مصروفیت کا عکس پاتا ہوں۔ ذہن کی مصروفیت ہر سمت میں بھی ہوتی ہے اور ہر سطح پر بھی۔ مثلاً علم، فن اور نجی معاملات۔

آپ سے رخصت ہونے کے بعد میں ایک نئی دنیا میں پہنچ چکا ہوں یہ دنیا جھوٹی محبت اور تمناؤں کی دنیا ہے۔ برلن کے سفر میں بھی میری بڑی ہمت شکنی ہوئی۔ اس سے قبل کبھی ایسا نہ ہوا تھا کیونکہ برلن کا سفر مجھے مظاہر قدرت کے مطالعے کا موقع فراہم کرتا تھا اور زندگی سے محبت کا جذبہ بھی فراواں کر دیتا تھا۔ اس کے برخلاف اس بار مجھے زبردست دھکا لگا کیونکہ جو پتھریلی چٹانیں مجھے نظر آئیں وہ میری روح کے شدید جذبات کے مقابلے میں ہیچ تھیں، جو شہر مجھے دکھائی دیئے وہ میرے خون سے زیادہ متمدن نہ تھے، جو سرائیں راہ میں ملیں انمیں خوردنی اشیا اتنی وافر مقدار میں نہ تھیں جتنا وزن میں اپنے ساتھ فکر و نظر کا لئے ہوا تھا اور ان سب سے قطع نظر فن کے مظاہر بھی جینی سے زیادہ حسین نہ تھے ایک مرتبہ جب میں برلن پہنچا تھا تو میں نے اپنے تمام سابقہ رشتے منقطع کر لئے تھے البتہ کبھی کبھی بادل ناخواستہ سائنس اور آرٹ میں دلچسپی لے لیتا تھا۔

میرے پیارے ابا جان۔ اب جہاں تک میرے قانون کے پیشے کا تعلق ہے مجھے ایک اسیسر شمد تھینر ASSESSOR SCHMIDTHANNER نے

مشورہ دیا ہے کہ میں قانون کا تیسرا امتحان پاس کرنے کے بعد جج کا عہدہ سنبھا لوں کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ میں انتظامی عہدہ سے زیادہ قانون کو پسند کرتا ہوں اسی دوست نے یہ بھی بتایا کہ وہ خود اسی پیشے میں تین سال کے اندر اسیسر بن گیا۔ غالباً اگر آدمی پوری محنت اور لگن سے کام کرے تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے کیونکہ برلن اور دوسرے مقامات کے مقابلے میں یہاں ترقی کی منازل باآسانی طے ہوجاتی ہیں۔ پھر اگر کوئی اسیسر کی حیثیت میں گریجویٹ بھی ہوجائے تو اُسے ہر گارٹنر کی طرح یونیورسٹی میں لیکچرر بھی لگایا جاسکتا ہے۔ ہرگارٹنر نے صوبائی قانونی کتب پر ایک تصنیف بھی کر ڈالی وہ اس سے قبل ہیگل مدرسۂ اصولِ قانون کے مقلد کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ تاہم اے میرے پیارے اباجان! کیا یہ ممکن نہیں کہ اِن تمام مسائل پر خود آپ سے بالمشافہ گفتگو کی جائے۔؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایڈورڈ کی حالت، میری شفیق ماں کی علالت اور خود آپ کی ناسازیٔ طبع (جس کے متعلق مجھے امید ہے کہ شدید نوعیت کی نہ ہوگی) کے پیشِ نظر میرا فرض ہے کہ میں جلد از جلد آپ کے پاس پہنچوں۔ میں تو شاید اب تک پہنچ بھی چکا ہوتا اگر مجھے آپ کی ناراضگی کا خوف نہ ہوتا۔

میرے پیارے اباجان! آپ مجھ پر یقین کیجیے کہ میں ذاتی مفاد سے الگ ہو کر سب کچھ لکھ رہا ہوں (حالانکہ جینی کو دوبارہ دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی ہوتی ۔!) میرے پیشِ نظر بعض خیالات ہیں جنھیں میں ظاہر نہیں کرسکتا۔ بعض لحاظ سے میرا اگلا قدم مشکل تر ہوتا لیکن جیساکہ میری ہمدم جینی نے لکھا ہے کہ جو عظیم کام مجھے انجام دینا ہے اس کے مقابلے میں اس قسم کے خیالات کی کوئی حیثیت نہیں۔

میرے پیارے اباجان! آپ سے دست بستہ گزارش ہے کہ آپ میرے بارے میں جو رائے بھی قائم کریں میرا یہ خط یا کم از کم یہ صفحہ میری فرشتہ صفت

ماں کو نہ دکھائیں۔ شاید میری اچانک آمد سے اس عظیم اور بزرگ خاتون کو کچھ سکون میسر آجائے۔

میں نے اماں کو جو خط لکھا تھا وہ جینی کا خط آنے سے پہلے لکھا تھا اس لئے ممکن ہے اس میں کچھ ایسی باتیں بھی بلا ارادہ لکھ گیا ہوں جنھیں نہ لکھنا چاہیئے تھا یا کسی حد تک ناموزوں ہوں۔

مجھے امید ہے کہ میرے خاندان پر سیاہ بادلوں کا جو سایہ ہے وہ آہستہ آہستہ کم ہوتا جائیگا اور خود مجھے آپ کے ساتھ آزمائش و ابتلا سے گزرنے کا اعزاز میسر آئے گا اور میں ثابت کرسکوں گا کہ مجھ میں کتنی گہری ہمدردی اور بے پناہ محبت کا طوفان موجزن ہے جس کا اکثر برملا اظہار بھی کر چکا ہوں۔ آپ خود میرے پیارے ابا جان! میرے ذہنی خلفشار کو نظر انداز کریں گے جو مجھے کبھی ایک طرف لے جاتا ہے اور کبھی دوسری طرف۔ آپ میرے غلطیوں سے لبریز قلب کو بھی معاف فرمائیں گے جو دراصل منتخب روح میں ڈوبا ہوا ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ جلد صحتیاب ہو کر میرے دل کے قریب آجائینگے اور میرا دل وہ سب کچھ بتا دے گا جو میرے ذہن میں موجود ہے۔

آپ کا پیارا بیٹا

کارل

پیارے ابا جان! میری بدخطی اور اوٹ پٹانگ عبارت کو معاف فرمائیے رات کے چار بج چکے ہیں اور موم بتی پوری جل چکی ہے۔ میری آنکھوں میں نیند بھری ہوئی ہے اور طبیعت بوجھل ہو رہی ہے جن اندیشوں اور تفکرات کے بھوت میرے گرد ناچ رہے ہیں ان کو آپ لوگوں کے پاس پہنچکر ہی مغلوب کرسکتا ہوں۔

براہِ کرم میرا ہدیۂ محبت میری پیاری دلنواز جینی کو پہنچا دیجئے۔ اس کا خط میں درجنوں بار پڑھ چکا ہوں اور ہر مرتبہ اس میں نئی دلکشی محسوس ہوئی ہے۔ یہ خط ہر لحاظ سے حسنِ صوری و معنوی سے مزین ہے۔ میرے خیال میں کوئی عورت اس سے بہتر عبارت نہیں لکھ سکتی۔

کمیونسٹ پارٹی کا منشور

۱۸۴۷ء میں انصاف پسندوں کی لیگ (LEAGUE OF THE JUST) یا کمیونسٹ لیگ نے کارل مارکس اور فریڈرک انجیلز کو کمیونسٹ پروگرام مرتب کرنے پر مامور کیا۔ ان دونوں کا تیار کیا ہوا کمیونسٹ منشور ۱۸۴۸ء میں دنیا کی کئی زبانوں میں شائع ہوا۔ اس میں بڑے بڑے موثر انداز میں بین الاقوامی انقلاب کا مکمل پروگرام اور تاریخی مادہ پرستی (MATERIAL-ISM) کے بنیادی خصائص پیش کئے گئے تھے اسی کو بعد میں "مارکسزم" کا نام دیا گیا۔ مارکس نے اس کے آغاز میں ہیگل کا فلسفہ دیا لیکن اس کی پیش کردہ عینیت "ترغیب" کو قبول نہیں کیا۔ اس نے عالمی تاریخ کو خالص مادی رنگ میں پیش کیا کیوں کہ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے تاریخ کے ارتقاء کو سائنسی اصولوں پر جانچا اور پرکھا ہے اور اسی روشنی میں مستقبل کے بارے میں پیشنگوئی کی ہے۔ مارکس کا عقیدہ تھا کہ معاشی حالات انسانی زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور تاریخ میں موثر قوت انہی کی رہی ہے۔ تاریخ بقول مارکس، طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے جو موجودہ زمانے میں اپنے نقطۂ عروج پر ہے۔ کیونکہ آج کا معاشرہ بورژوائی سرمایہ دارانہ طرز کا ہے جس میں صنعتی معاشیات پھیلی ہوئی ہے۔ اس معاشرہ میں مزدور خود اپنے لئے کام نہیں کرتا بلکہ اپنی محنت کو بورژوائی کارخانہ دار

کے ہاتھ تھوڑی سی اُجرت کے لئے فروخت کر دیتا ہے۔ وہ جتنا پیدا کرتا ہے اس سے بہت کم صرف کرسکتا ہے۔ اس کا فرق کارخانہ دار اپنے پاس بطور منافع رکھ لیتا ہے۔ اس طرح دولت مرتکز ہوتی ہے اور چند لوگ امیر سے امیر تر ہوتے جاتے ہیں جبکہ غریبوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور وہ "پرولتاری" بن کر ہولناک مصائب میں اپنی زندگی گزارتے رہتے ہیں۔ نتیجتاً دونوں میں کشیدگی پیدا ہوتی ہے اور استحصال کرنے والوں اور اس سے متاثر ہونے والوں میں طبقاتی جنگ چھڑ جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ سوشلسٹ معاشرے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ کمیونزم کی شکل اختیار کرکے دنیا کو امن و انصاف سے ہمکنار کر دے گا۔

مارکس کے پیش کردہ فلسفے کے مطابق دنیا میں تبدیلیاں آنی شروع ہو چکی ہیں۔ گو فلسفہ مارکس مسائل کے صرف ایک رُخ پر روشنی ڈالتا ہے اور اپنے اندر بہت سی خامیاں رکھتا ہے تاہم اس میں بے شمار صحیح اور ٹھوس حقائق بھی ملتے ہیں جن کی مدد سے موجودہ دور کے سیاسی سماجی اور معاشی حالات کا تجزیہ کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ ذیل میں کمیونسٹ پارٹی کے منشور کے اہم اقتباسات مختصراً دیئے جا رہے ہیں۔

دنیا کی تاریخ دراصل طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے۔

آزاد ہو یا غلام، باحیثیت ہو یا بے حیثیت، آقا ہو یا غلام، مقیم ہو یا مسافر یا اُن سب کے بجائے اگر دو لفظ استعمال کئے جائیں تو ظالم ہو یا مظلوم سب ایک دوسرے کے خلاف برد آزما ہیں۔ یہ جنگ ہمیشہ سے جاری ہے البتہ کبھی کھلم کھلا ہوئی تو کبھی چھپے چوری۔ کبھی اس جنگ کے نتیجے میں معاشرے میں وسیع پیمانے پر انقلابی تبدیلیاں عمل میں آئیں اور کبھی دونوں طبقوں کی تباہی کا موجب ہوئیں۔

آج کا بورژوائی معاشرہ بھی اسی کشمکش کا شکار رہے البتہ جاگیردارانہ نظام کی جگہ نئے طبقے، ظلم کے نت نئے طریقے، اور جدوجہد کی نئی نئی شکلیں وجود میں آ گئی ہیں۔ آج کے دور میں ایک چیز بہت نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے اور وہ ہے صرف دو واضح طبقات جو ایک دوسرے کے خلاف مصروف عمل ہیں۔ انھیں بورژوائی اور پرولتاری کہا جا سکتا ہے۔ آج کل کی حکومتیں صرف بورژوائی طبقے کے مفادات کی نگرانی کرتی ہیں۔

اس طبقے نے تاریخ میں بڑا انقلابی رول ادا کیا ہے۔ جب کبھی اس کو اثر و رسوخ حاصل ہوا اس نے سابقہ جاگیردارانہ، امیرانہ اور غریب رشتوں سے ناطہ توڑ لیا ہے۔ وہ صرف ذاتی مفاد دیکھتا ہے اور سکوں کی کھنک۔ اس نے اپنی انا کے سرد پانی میں مذہبی جوش و خروش اور روحانی کیف و سرور کو غرق کر دیا ہے۔ انسان کی ذاتی قدر و قیمت کو دولت کے عیوض بیچ دیا اور بے شمار ناقابل تنسیخ حقیقی آزادیوں کے بدلے صرف ایک اور صبر آزما آزادی قبول کی جسے عرف عام میں "آزاد تجارت" کہا جاتا ہے۔ اسی بات کو مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ بورژوائی طبقے نے اپنے استحصال کو جاری رکھنے کے لئے سیاسی اور مذہبی توہمات کی آڑ میں برہنگی بے حیائی، براہِ راست اور وحشیانہ استحصال کو جاری و ساری رکھا ہے۔ اس نے ہر پیشے کے وقار کو خاک میں ملا دیا۔ اس نے طبیب، قانون داں، واعظ، شاعر اور سائنسداں غرض ہر شخص کو تنخواہ دار مزدور بنا دیا ہے۔

تجارت کے میدان میں بھی بورژوائی طبقے نے دنیا بھر میں استحصال کر کے پیداوار اور صرف کو آزادہ روی عطا کر دی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ دوسروں کو بھی اپنے طریقے اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے اور اگر کوئی اس

کے خلاف مزاحمت کرے تو اسے مٹا دینے کی بھی دھمکیاں دی جاتی ہیں ۔ اس طرح پورے معاشرے اور اس کی تہذیب کو بورژوائی رنگ میں رنگا جاتا ہے ۔ انھوں نے بمشکل سو سال میں پیداواری قوتوں کو اتنے بڑے پیمانے پر اپنے گرد مرتکز کرلیا ہے کہ ان سے قبل کی پوری تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کرسکتی ۔ انھوں نے قدرت کی قوتوں کو تابع بنایا ، مشینیں بنائیں ۔ علمِ کیمیا کو صنعت اور زراعت میں استعمال کیا ، جہاز رانی ، ریل اور برقی مواصلات کو اپنے قبضۂ قدرت میں لیا ، پورے پورے براعظموں کو زیرِ کاشت لائے ، دریاؤں کو نہروں میں تقسیم کیا اور اس طرح نبی نوع انسان کو زمینوں سے بے دخل کر دیا ۔ پچھلی صدیوں کو ان نت نئی طاقتوں کا کوئی اندازہ تک نہ تھا ۔

لیکن جن ہتھیاروں سے بورژوائی طبقے نے جاگیرداری کا خاتمہ کیا تھا وہ خود اس کی ہلاکت کا باعث بن گئے ۔ اور پھر اس نے جدید محنت کش طبقے کو بھی جنم دیا جنھیں پرولتاری کہا جاتا ہے ۔ جوں جوں بورژوائی طبقہ پروان چڑھتا رہا پرولتاری بھی بڑھتے رہے لیکن مشینوں کے بڑھتے ہوئے استعمال اور محنت کی تقسیم در تقسیم کی بنا پر مزدور کی ناگزیر حیثیت متاثر ہوتی گئی ۔ وہ مشین کی بخ ہو کر رہ گیا ۔ آج وہ ایک ایسا ہنرمند ہے جس کا کام انتہائی آسان اور کبھی نہ بدلنے والا ہے ۔

اُس کی زندگی بھی ایک ڈگر پر چلتی ہے ۔ ایک پرولتاری پیدا ہوتے ہی کسی بورژوا سے برسرِ آزما ہو جاتا ہے ۔ پہلے وہ تنہا ہی مقابلہ کرتا ہے پھر ایک فیکٹری کے تمام مزدور مل کر جدوجہد کرتے ہیں اور اس کے بعد ایک ہی پیشے سے وابستہ تمام محنت کش متحد ہو کر استحصالی قوتوں کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں ۔ اس مقابلے میں اکثر مزدور ہی ظفرمند ہوتے ہیں لیکن یہ جیت وقتی ہوتی ہے ۔ مستقل اور دیرپا فتح کے لئے محنت کش طبقے کا

وسیع تر اتحاد ہونا چاہیئے۔ یہ اتحاد ذرائع مواصلات کی ترقی پر منحصر ہے کیونکہ اگر مختلف طبقوں اور قومیتوں کے مزدور متحد ہو کر ایک پلیٹ فارم سے لڑیں تو انھیں بآسانی کامیابی میسر آسکتی ہے۔

اس لڑائی میں چھوٹے کارخانے داروں، دوکانداروں، فنکاروں اور زمینداروں وغیرہ سے مدد ملنا مشکل ہے کیونکہ یہ لوگ درمیانے درجے کے سب سے نچلے لوگ ہیں۔ انھیں اپنے حال سے زیادہ مستقبل سے امیدیں وابستہ ہیں۔ یہ رجعت پسندوں سے چمٹے رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں لیکن پرولتاری انقلاب کے سامنے یہ لوگ چند سیکنڈ بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ ایک پرولتاری صحیح معنوں میں انقلابی ہے کیونکہ نہ تو اس کے پاس زمین جائداد ہے نہ اس کے بیوی بچوں سے بورژوائی تعلقات ہیں۔ آج کا مزدور سرمایہ دار کی محکومی اور صنعتی غلامی کی وجہ سے اپنا قومی تشخص کھو چکا ہے خواہ وہ انگلینڈ کا ہو یا فرانس کا، امریکہ کا ہو یا جرمنی کا۔ وہ قانون اخلاق اور مذہب کو ایسی دیوار سمجھتا ہے جس کی آڑ میں بورژوائی مفادات کی حفاظت کی جاتی ہے۔

ہم قدیم بورژوائی معاشرہ کی جگہ ایک ہمہ گیر ادارے کی بنیاد ڈالیں گے جہاں سب کی آزادانہ ترقی ہو کمیونسٹ اپنے نظریات اور مقاصد کو چھپانا مکروہ فعل تصوّر کرتے ہیں۔ وہ ببانگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ ان کے اغراض و مقاصد صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں جبکہ معاشرہ کی تمام موجودہ صورتوں کو طاقت کے ذریعے تہس نہس کر دیا جائے۔ اے حکومت کرنے والو۔ ڈرو اس دن سے جب کہ کمیونسٹ انقلاب انھیں آدبوچے۔ اس انقلاب میں پرولتاری کے پاس سے اس کے پاؤں کی زنجیروں کے سوا کچھ بھی نہ جائے گا۔ تمام دنیا ان کے فاتحانہ قدم چومنے کو تیار کھڑی ہے۔

"تمام ملکوں کے پرولتاری ——— ایک ہو جاؤ"

ہرمن شلزے ڈیلٹش

ہرمن شلزے ڈیلٹش (۱۸۸۳ ـ ۱۸۰۸) کا نام درمیانے طبقے کے تاجروں کی سماجی حالت سدھارنے کے سلسلے میں ہمیشہ ہمیشہ یاد رکھا جائیگا۔ اس نے ۱۸۵۰ء میں دنیا کی پہلی انجمن امداد باہمی قرضے دینے کے لئے قائم کی۔ ان انجمنوں کے قیام کا واحد مقصد یہ تھا کہ باہمی امداد کی بنیاد پر صنعتیں قائم کی جائیں تاکہ منافع تمام شرکت داروں کو لاگت کے تناسب سے مل جایا کرے اِن خیالات کے باوجود وہ مارکسسٹ نہ تھا اس دعوے کے ثبوت میں ذیل میں ایک مضمون "معاشرہ کے حقوق و فرائض" کی تلخیص دی جارہی ہے جو اس کی ایک تقریر سے ماخوذ ہے۔

معاشرہ کے حقوق و فرائض:۔ آج دنیا میں جس قدر تنازعات اور مسائل سر اٹھا رہے ہیں ان کی بنیادی وجہ سماجی نوعیت کی ہے نہ کہ سیاسی۔ سیاست کے بڑھتے ہوئے طوفان میں جو جذبہ کارفرما ہے اس کا مرکز انسان بذاتِ خود ہے اور انسان اپنا زندہ رہنے کا حق مانگتا ہے۔ سیاسی ادارے بھی اسی حق کے حصول کا ایک ذریعہ ہیں جب مسائل کو اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو انسانوں کے بنیادی حقوق اور فرائض اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ انہی دونوں الفاظ کے پیچھے ہمارے دور کے اہم ترین مسائل پوشیدہ ہیں اور یہی روحانی و مادی تقاضوں کو متاثر کرتے ہیں۔

معاشرتی حقوق اور فرائض کو بخوبی سمجھنے کے لئے ہمیں انسانی معاشرے کی ماہیت اور مقصد وجود پر غور کرنا پڑے گا اور یہ دیکھنا پڑے گا کہ خود انسان کا معاشرے سے کیا رشتہ ہے اس رشتے کو برقرار رکھنے سے انسان

پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ صرف اسی طرح ہم معاشرہ کے عیوب و محاسن اور اس کے بنیادی اسباب کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔

فرد اور معاشرہ :- سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ انسان بحیثیت فرد کے خود اپنے ساتھ کیا تعلق رکھتا ہے اس کے بعد چند مسلّمہ اصولوں کی روشنی میں کسی فیصلے پر پہنچیں گے۔ چونکہ انسان ایک نامیاتی ہستی ہے اس لئے وہ چند اٹل قوانین قدرت کا پابند ہے۔ وہ تمام تر جانداروں کی طرح خود بھی ایک ٹکے بندھے راستے پر گامزن ہے اور حیوانوں کی سی جبلتیں رکھتا ہے لیکن اس کی ایک خوبی اُسے تمام جانوروں میں ممتاز بنا دیتی ہے۔ یہ خوبی اس کی اپنی ایک شخصیت ہے۔ یعنی وہ شعور بھی رکھتا ہے اور خود ارادیت بھی۔ حیوان اپنی جبلّت کی بدولت بُرے بھلے کی تمیز کرتا ہے اس کے برخلاف انسان کو بذاتِ خود چیزوں کا مشاہدہ کر کے اپنی بہتری کے لئے کچھ فیصلے کرنے پڑتے ہیں اور یہی فیصلے اس کے اقدامات کی رہنمائی کرتے ہیں۔ دوسرے لوگ اس کے اقدامات دیکھ کر اس کی قوّت اور کمزوری کا اندازہ کرتے ہیں۔ جانور قدرتی راستے پر بے چون و چرا گامزن ہے اس لئے غلطی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف انسان کے سامنے دونوں راستے کھلے ہوئے ہیں۔ اگر اس میں صرف حق پر چلنے کی صلاحیت ہوتی تو اس کی ذہانت اور عقل و شعور کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ نتیجتاً آزادیٔ عمل مفقود ہوتی۔ اس طرح انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہ رہ جاتا۔

مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہم خود اپنی ذات سے وابستہ اصولوں کو خیرباد کہہ دیتے ہیں اور ہمارا عمل ان اصولوں کے برعکس ہوتا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں انہی اصولوں کی روشنی میں کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خود ہمارا وجود "قانون تغیر" کا مرہون منت ہے یعنی ہماری نامیاتی ہستی ہر لمحہ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ہمیں زندہ

رہنے کے لئے مسلسل کھانا، پانی اور تازہ ہوا وغیرہ چاہیئے۔ چونکہ انسان اپنی مرضی کا مالک ہے اس لئے وہ چاہے تو فاقہ کشی کرکے یا دم گھونٹ کر اپنے کو ہلاک کرلے لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ بھوکا رہے یا سانس لینا چھوڑ دے اور پھر بھی زندہ رہے۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک کام کرلے تو وہ قانونِ وجود کی خلاف ورزی کرتا ہے اور جونہی وہ دم توڑے گا قانون خودبخود روبہ عمل ہوجائے گا۔

اسی طرح خودارادی اور خودشعوری کیفیات میں انسانی سرشت کا نقطۂ عروج ملتا ہے۔ انسان میں سچائی اور آزادی کی ایک تڑپ ہوتی ہے یہی تڑپ اس کو فکروعمل عطا کرتی ہے۔ جس انسان میں فہم وفراست موجود ہوتی ہے وہ حق، راستی، حسن اور خوبصورتی کو پا ہی جاتا ہے لیکن اس کے لئے ایک بنیادی شرط آزادی بھی ہے۔ اگر آزادی اور حق کی پہچان کسی میں نہ ہوں تو وہ تباہی کے کنارے پر پہنچ سکتا ہے۔ انفرادی ترقی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ خود ارادیت اور خودشعوری کیفیات سے متعلق دوسری شرائط کی کہاں تک پابندی کرتا ہے یعنی وہ اپنی ذات اور اپنے اردگرد کے ماحول کے قوانین کو منظور کرکے رضاکارانہ طور پر اور نتائج کو بخوبی سمجھتے ہوئے کس حدتک ان پر عمل پیرا ہوتا ہے۔

اب ہم ایک انسان کے دوسرے انسان سے روابط پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انسان کا معاشرہ سے گہرا تعلق ہے وہ تن تنہا زندگی نہیں گزار سکتا، جس طرح جنگلی جانور گزار لیتے ہیں۔ اگر وہ مکمل تنہائی اختیار کرے تو وہ ہرگز اپنے اوجِ کمال پر نہیں پہنچ سکتا۔ یعنی تمام نامیاتی ہستیاں جنمیں انسان بھی شامل ہے صرف اسی وقت اوجِ کمال پر پہنچ سکتی ہیں جب ان کی خفتہ قوتیں اور فطری رجحانات مکمل نشوونما پا جائیں۔

لیکن اکیلا آدمی تنہائی کی زندگی میں خود بخود ارتقا کے مراحل طے نہیں کرسکتا۔ اس کے لئے مشترکہ زندگی اور باہمی امداد و تعاون اوّلین شرط ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے مخصوص حالات میں اس طرح تن تنہا زندگی گزار بھی لے تو اس کا بیشتر وقت زندہ رہنے کی جدوجہد میں گزر جائے گا وہ اعلیٰ ترین صلاحیتوں کو نشوونما دینے سے معذور رہے گا۔ کسی آدمی کی سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ اس کو بالکل اکیلا رہنے پر مجبور کردیا جائے تنہائی میں اس کو اپنا وجود گراں گزرے گا کیونکہ اس طرح وہ اپنی زبان سے بھی محروم ہو جائیگا۔ یہ زبان ہی تو ہے جو کسی کو منظم فکر عطا کرتی ہے۔ اس لئے کوئی غریب سے غریب آدمی اس زندگی کو برداشت نہیں کرسکتا۔ دنیا میں کوئی آدمی بھی ایسا نہیں ہے جو مکمل تنہائی کی زندگی گزار رہا ہو اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ انسانی سرشت کے خلاف ہے۔

اس لئے معاشرتی زندگی کوئی خود اختیاری فعل نہیں ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اس کے فطری تقاضے کی غمازی کرتی ہے۔ جہاں جہاں انسان ملیں گے معاشرہ بھی ملے گا۔ معاشرتی جبلت دراصل خود حفاظتی جبلت کا ایک جزو ہے۔ فرد کا معاشرہ میں تبدیل ہونا ایک فطری عمل ہے جو چند نامیاتی قوانین کا پابند ہے۔ ان قوانین کو سمجھنے سے پہلے ہمیں معاشرہ کے مزاج کو سمجھنا پڑے گا اس سلسلے میں دو نکات قابلِ ذکر ہیں۔

سب سے پہلے انسان کا انفرادی ارتقا، یہ بتاتا ہے کہ وہ اپنے مقصد وجود کے حصول کے لئے معاشرہ کا تابع ہے اور یہ اتباع ایک مخصوص سمت میں ہے۔ معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ تمام افراد اپنی اپنی جگہ جدوجہد میں مصروف ہیں اور معاشرہ ان کی ہر ممکن امداد کررہا ہے۔ یہ معاشرہ کا قانونی پہلو ہے۔ اس معاشرتی سرگرمی میں جو

اصول کارفرما ہے وہ قانون کی دنیا میں امتناعی سے زیادہ ابتدائی نوعیت کا حامل ہے۔ یعنی جو چیز ہم خود اپنے لئے پسند نہ کریں وہ دوسروں کے لئے بھی روا نہ رکھیں۔

علاوہ ازیں، ہمیں معاشرہ کی ایک اور شکل بھی صاف نظر آتی ہے۔ جس سے ایک ارفع نقطۂ نظر منکشف ہوتا ہے۔ چونکہ انسان ایک باشعور مخلوق ہے اس لئے وہ اپنے وجود اور اپنے افعال کو ثبات بخش سکتا ہے اس کے نتائج دیرپا ہو سکتے ہیں۔ فکر و عمل معین ہو سکتے ہیں۔ اپنے افعال کے نقوش بیرونی اشیاء پر چھوڑ سکتا ہے اور خود اپنے مقاصد کے لئے انھیں دوسری شکلیں عطا کر سکتا ہے۔ اس طرح فرد اتنی اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ اس کے اثرات اس کے اپنے وجود کے دائرہ کار سے باہر بھی محسوس کئے جاتے ہیں۔ اس طرح وہ نہ صرف اپنے ماحول پر اثرانداز ہوتا ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے بھی نقش قدم چھوڑ جاتا ہے۔ اس طرح ہمارے افکار اور اعمال تمام زمانوں کے لئے ایک مشترک سرمایہ بن جاتے ہیں۔ صدیوں کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سرمایہ بڑھتا رہتا ہے اور ہر آنے والی نسل کو یہ عظیم ورثہ ملتا رہتا ہے۔ جانوروں میں ایسا نہیں ہوتا وہ ازل سے آج تک ایک ہی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ یہ نوع انسانی کی خوش قسمتی ہے کہ اسے وہ تمام کوشش، جانفشانیاں، اور عرق ریزی نہیں کرنی پڑتیں جو اس کے آباؤ اجداد علم و فکر کی قندیلیں روشن کرنے کے لئے کر گئے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ قبل تاریخ کے کسی ذہین ترین آدمی اور آج کے ایک معمولی پڑھے لکھے بچے میں کتنا فرق ہے۔ اوّل الذکر نے چیزوں کا علم اپنے خام اور ناپختہ خیالات کی روشنی میں حاصل کیا تھا لیکن آج کا بچہ بڑے بڑے فطری اصولوں کو محض "مسلمات" سمجھ کر قبول کر لیتا ہے اور اس کی توضیحات بھی جان لیتا ہے۔ اسی طرح ابتدائی ادوار کے لوگوں جنھوں نے

محض اپنی قوت بازو کے بل بوتے پر سامان کے بغیر زمین کھود کر ضروریات زندگی حاصل کیں اور جدید دور کے انسانوں میں جنھیں ہر قسم کی مشینیں اور مختلف توانائیاں میسر ہیں کتنا عظیم تفاوت موجود ہے۔ اس طرح ایک نسل دوسری نسل کے لئے عظیم ترکہ چھوڑ جاتی ہے دوسری نسل اس میں اضافے کرکے اگلی نسل کے لئے چھوڑتی ہے اس طرح ایک تسلسل قائم ہوجاتا ہے اور افراد صرف اپنے دور ہی میں ایک دوسرے سے وابستہ نہیں رہتے بلکہ ایک نسل دوسری نسل سے منسلک ہوجاتی ہے اس لئے سب کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ محفوظ وجود کی ضمانت نہ تو فرد کی نمایاں حیثیت سے حاصل ہوتی ہے اور نہ آرام و آسائش کے وسائل مہیا ہونے سے۔ اس کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ہم دوسروں کے وجود کا بھی خیال رکھیں انھیں اس مقصد کے حصول میں ہر ممکن مدد بہم پہنچائیں۔

اب تک ہم نے معاشرتی حقوق و فرائض کا ایک خاکہ پیش کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اخلاقی ضوابط جو معاشرے کی ارفع سطح کو باقاعدگی عطا کرتے ہیں، ریاست کے اقتدارِ اعلیٰ کی حمایت نہ ہونے کے باوجود محض خیر سگالی کے جذبات نہیں پیدا کرتے ہیں بلکہ ہم میں قوتِ عمل پیدا کرتے ہیں یعنی ہمارے وجود کے لئے ان کی ناگزیر حیثیت ہمارے شعور میں داخل ہوجاتی ہے۔ اگر اخلاقی ضوابط قائم رہتے ہیں تو فرد اور معاشرہ دونوں قائم رہتے ہیں لیکن اگر انھیں توڑا جاتا ہے تو پھر ان دونوں کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ زندگی کی سب سے بڑا دانائی یہ ہے کہ انسانیت کا پاس کیا جائے اور قوت اور وسائل کا سب سے مفید استعمال یہ ہے کہ انھیں انسانیت کی خدمت میں صرف کیا جائے۔ اخلاق سے مادی فوائد ہی حاصل نہیں ہوتے ہیں بلکہ فرد کی رُوحانی ترقی بھی ہوتی ہے جب انسان کے قول و عمل میں ہم آہنگی

ہوگی تب ہی اس کو اپنا وجود انبساط آگیں معلوم ہوگا اور تبھی اس کو صحیح معنوں میں اطمینان قلب نصیب ہوگا۔ اس بات کی اہمیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم معاشرہ کے روابط پر نظر کرتے ہیں۔ فرد معاشرہ کو جو کچھ دیتا ہے اس کا کئی گنا وصول بھی کرلیتا ہے۔ صحیح معنوں میں زندگی اُسے کہتے ہیں کہ فرد تہذیب کے ارتقاء سے روحانی غذا حاصل کرے، جذبۂ انسانیت سے اپنے سینے کو کشادہ کرلے، اپنے دور کو تاریخی اہمیت دلوانے کے لئے دل وجان سے کوشش کرے کہ وہ بنی نوع انسان کی عظمت کی علامت بن جائے۔ جو ان مقاصد کے خلاف کام کرے وہ دراصل روحانی اعتبار سے مرچکا ہے۔

کاش میرے یہ احساسات اہلِ ثروت اور اہلِ علم حلقوں میں زیادہ سے زیادہ پھیلتے جائیں۔ مقاصد بہت عظیم ہیں ان کے حصول کے لئے فرد کی مساعی بالکل معمولی ہی ہوں گی لیکن بہت سے لوگوں کی متحدہ کوششوں سے ان کا حصول ناممکن نہ ہوگا۔ صورت حال مایوس کن نہیں ہے۔ امداد باہمی کی تنظیمیں برابر اس سمت میں آگے بڑھ رہی ہیں اور موجودہ معاشرہ پر خوش گوار اثرات مرتب کررہی ہیں۔ امداد باہمی کی تنظیموں کی آزادانہ سرگرمیاں ایک اخلاقی قوت بن کر ابھر رہی ہیں۔ جن سے ارفع ثقافتی مقاصد کا حصول ممکن ہوسکے گا جو آج کا زبردست مسئلہ ہے۔ اس طرح فطرتِ انسانی پر ضوابط ٹھونسنے کے بجائے ان کا مستقل حل خودبخود نکل آئے گا۔

فریڈرک ولہلم ریفیسن

(۱۸۱۸ - ۱۸۸۸)

ہرمن شولز ڈیلیٹش کی طرح فریڈرک ولہلم ریفیسن نے بھی کاشتکار طبقے کی مالی اعانت کے لئے امدادِ باہمی کی انجمنوں کی داغ بیل ڈالی تھی۔ کیونکہ یہ لوگ تیز رفتار صنعتی ترقی کی وجہ سے بدحالی کا شکار ہو چکے تھے۔ ریفیسن کی اس تحریک میں مذہبی اور اخلاقی جذبات کارفرما تھے۔ ریفیسن نے اپنے پیشرو کے مقابلے میں ایک نیا خیال بھی پیش کیا تھا یعنی امدادِ باہمی کی انجمنوں میں تمام کام صرف "اپنی مدد آپ" کے اصولوں پر ہی نہ ہو بلکہ حکومت کی مدد بھی شامل ہونی چاہیئے۔ اس نے قرض اور بچت کے لئے بینک بھی قائم کئے۔ ذیل میں اس کی ایک کتاب "ریاستی دفاتر قرض دا انجمن ہائے امداد باہمی ــــــ دیہی آبادی کے مسائل کا حل" سے اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔

انجمن ہائے امدادِ باہمی کے قیام کی ضرورت

"وہ زمانے اب خواب ہو چکے ہیں جب ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کے آڑے وقت پر کام آجایا کرتا تھا۔ ضرورت پڑنے پر بڑی بڑی رقمیں بغیر کسی لکھت پڑھت کے دے دیتا تھا۔ اب تو کوئی کسی پر اعتماد نہیں کرتا۔ بھائی بھائی کے کام نہیں آتا۔" آج کل یہ جملے اکثر سنائی دیتے ہیں۔ لوگ موجودہ دور سے عاجز آ چکے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ وہی پچھلے دور کی سادہ لوحی اور خلوص لوٹ آئے۔

میرے خیال میں یہ اندازِ فکر منفی ہے۔ ہمارا اپنا دَور بھی برا نہیں ہے جدید ایجادات اور سائنسی ترقی کی وجہ سے شہری اور دیہی زندگی کا

توازن بگڑ چکا ہے۔ لوگ صنعتوں کی طرف زیادہ دوڑتے ہیں اور چھوٹی تجارت اور زراعت پس پشت پڑ گئے ہیں لیکن اگر موجودہ حالات کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالا جائے تو کوئی مشکل نہیں کہ حالات کا رخ موڑا نہ جا سکے۔

اگر چھوٹے تاجروں اور کسانوں کے مسائل کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا اصل مسئلہ "پیسے کی کمی" ہے۔ دیہات کی دولت کھنچ کھنچ کر شہروں پر لگ رہی ہے چنانچہ اگر اس مسئلہ پر توجہ دی جائے تو مشکلات ختم ہو سکتی ہیں۔

اس مسئلہ کے حل کے لئے ہمیں بڑے بڑے صنعت کاروں اور تاجروں کے طریقۂ کار کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ان کی کامیابی کا راز صرف یہ ہے کہ انھوں نے سائنسی ایجادات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور انھیں اپنی صنعت و حرفت میں استعمال کیا اسی طرح اپنے سرمائے کو کم دیکھ کر انھوں نے کئی آدمیوں کے اشتراک سے تجارت شروع کی۔ پس "علم اور روپیہ" دو بنیادی چیزیں ہر کامیابی کے لئے ضروری ہیں۔ انہی دو چیزوں کی بدولت امیر لوگ زیادہ امیر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لئے کاشتکاروں اور دستکاروں کو بھی ان دو چیزوں سے استفادہ کرنا چاہیئے۔

اب جہاں تک علم کا تعلق ہے وہ اپنے کام کی حد تک ہونا چاہیئے۔ نہ تو وہ عالم فاضل بنانے والا ہو اور نہ ایسا کہ ابجد بھی نہ سکھا سکے، کاشتکار اور دستکار دونوں ہی کو اپنی ذہنی اور جسمانی قوتیں بدرجۂ اتم استعمال کرنا چاہیئے۔ تاکہ وہ اپنے آلات، زمین، کھاد، اور دیگر ضروری اشیاء کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ یہ باتیں بظاہر آسان معلوم ہوتی ہیں لیکن فی الواقع ان کا فقدان ہے۔ لوگوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ ہر نئی چیز سے بھاگتے ہیں۔ اسی لئے ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

آج سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ نئی نسل کو ایسی ہمہ جہت تعلیم دی جائے کہ وہ وقت کے تقاضوں کو سمجھ سکیں۔ ان کی اسکول کی تعلیم کم از کم

اتنی ہونی چاہیئے کہ وہ تقریر و تحریر کو سمجھ سکیں اور اپنے حالات پر ان کو منطبق کر سکیں۔ اس کام کے لئے تربیت یافتہ اساتذہ کی ضرورت پڑے گی۔ اچھے اساتذہ کو تنخواہ بھی معقول دینا پڑے گی۔ اگر انہیں معقول مشاہرہ ملنے لگے تو وہ پھر ٹیوشن اور دوسرے جز وقتی کاموں پر تکیہ نہ کریں گے بلکہ طلبا کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھیں گے۔ اس طرح خود زرعی ترقی کی نئی نئی راہیں کھل جائیں گی۔

علم کے ساتھ ساتھ سرمائے کی فراہمی کے لئے امدادِ باہمی کی انجمنوں کی داغ بیل ڈالی جائے۔ ان انجمنوں سے کسی معجزے کی توقع رکھنی فضول ہے ہاں اگر صاف ستھری تنظیم ہو تو فائدے یقینی ہیں ایسی انجمنوں کے تمام شرکا کو تنظیمی کاموں میں پوری پوری دلچسپی لینی چاہیئے۔ بعض اہل ثروت ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں واقعی غربا سے ہمدردی ہوتی ہے اس لئے وہ غریبوں کو سُود پر روپیہ فراہم نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کے لئے امداد باہمی کی انجمنیں انتہائی ضروری ہیں۔ زمین کی بہتر دیکھ بھال، پانی کی نکاسی، کھیتوں اور باغات کے بہتر استعمال اور پھلوں کا کوئی معقول بندوبست، یہ سب زمین کے پوشیدہ خزانے ہیں۔

مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ انجمن امدادِ باہمی بہت ضروری چیز ہے۔ جوں جوں غربت اور احتیاج میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اخلاقی حالت بھی بگڑتی جاتی ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ مادّی تعاون کے بغیر روحانیت بھی چلا نہیں پا سکتی خواہ وہ کسی قدر خلوص نیت سے ہو۔ مضبوط قوت ارادی اور مخلصانہ جد و جہد بھی اخلاقی پستی کو دُور نہیں کر سکتی۔ خیرات، زکات، فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچاتے ہیں۔ تعاون کی بنیاد یہ جملہ ہونا چاہیئے: "جو کام نہ کرے گا وہ کھانا بھی نہ کھائے گا"۔ ہمیں ایسی راہ اختیار کرنی چاہیئے کہ ضرورت مندوں میں خود بخود صلاحیت اور طاقت پیدا ہو جائے تاکہ وہ اپنی مدد آپ کے اصول پر مناسب دولت کما سکیں۔

فرڈنینڈ لزالے

فرڈنینڈلزالے (۱۸۲۵ - ۱۸۶۴) جرمنی میں سماجی جمہوری تحریک کا بانی تھا۔ وہ انقلابی جمہوریت پر یقین رکھتا تھا اور اسی وجہ سے اُسے متعدد بار جیل جانا پڑا۔ اپنے اشتراکی خیالات کی وجہ سے اس پر طبقہ وارانہ منافرت پھیلانے کا الزام بھی لگایا گیا۔ ۱۸۶۳ء میں اس نے جرمن مزدوروں کی انجمن قائم کی اور اُسے اس کا پہلا صدر چنا گیا۔

ذیل کے مضمون میں اُسے آپ محنت کشوں کے ترجمان کی حیثیت میں پائیں گے۔ لیکن وہ مارکسسٹ نہیں تھا۔ وہ اس بات کے حق میں تھا کہ صنعت میں مزدوروں کو منافع سے حصہ ملے اور حکومت میں ووٹ کا حق ملے۔ اس طرح وہ مارکس سے واضح طور پر مختلف تھا۔ وہ طبقہ وارانہ جدوجہد پر دل سے یقین نہ رکھتا تھا اس لئے اس نے بسمارک تک سے گفتگو کی تاکہ مملکت محنت کشوں کی تحریک کو قانونی حیثیت عطا کرے۔

محنت کش طبقے کا تصوّرِ ریاست

صحافت کے پیش نظر سیاست کے اصول بورژوائیوں سے مختلف ہیں۔ صحافت براہ راست عام انتخابات اور اخلاقی قدروں پر ایمان رکھتی ہے۔ جبکہ بورژوائی محض اپنے طبقے کے مفادات کو دیکھتے ہیں۔ بورژوا طبقے کے نزدیک ریاست کا اخلاقی تصوّر یہ ہونا چاہیئے کہ ہر شخص کو اپنی صلاحیتوں کو بلاروک ٹوک روبہ عمل لانے کی ضمانت ملنا چاہیئے۔ اگر ہم سب برابر قوت، عقل و شعور، تعلیم اور دولت رکھتے ہوں تو پھر یہ اخلاقی تصوّر جائز ہے۔ چونکہ ایسا ممکن نہیں ہے اور دنیا میں چالاک اور بے وقوف، تعلیم یافتہ

اور جاہل سبھی بستے ہیں اس لئے مذکورہ بالا اخلاقی تصور بدترین بداخلاقی کو جنم دے گا۔ جو جتنا طاقتور ہوگا اتنا ہی چالاک ہوجائے گا اور دولتمند غریب کا استحصال کرنے لگے گا۔ لہذا محنت کش طبقہ اس قسم کی بے لگام انفرادی آزادی کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ اس میں کچھ اضافہ چاہتا ہے۔ اس کے خیال میں معاشرہ اخلاقی اعتبار سے منظم ہو یعنی سب کے مفادات محفوظ ہوں اور ترقی میں سب کو یکساں مواقع حاصل ہوں۔

بورژوا طبقے کے نزدیک ریاست کا اصل مقصد انفرادی آزادی اور جائداد کا تحفظ ہے۔ یہ اندازِ فکر پولیس والوں کا سا ہے۔ پولیس والوں کا اصل کام لوگوں کو چوری ڈکیتی سے محفوظ رکھنا ہے۔ فرض کیجئے کہ ملک چور اور ڈاکوؤں سے پاک ہوجائے تو پھر ریاست کا وجود لایعنی ہوگا۔

حضرات! تاریخ ایک مسلسل جدوجہد کا دوسرا نام ہے۔ جدوجہد مصائب غربت، جہالت اور کمزوری کے خلاف اور ان سب کے نتیجے میں غلامی کے خلاف جس میں نسلِ انسانی زمانۂ قبل تاریخ سے گرفتار ہے۔ اس جدوجہد میں اس وقت تک کامیابی نصیب نہیں ہوسکتی جب تک "اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ" والا اصول کارفرما ہے۔ ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ اجتماعی طور پر آزادئ بنی نوع انسان کی جدوجہد کرے۔ فرد جب ایک اجتماعی شکل اختیار کرتے ہیں تو ان کی طاقت لاکھوں گنا بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے ریاست محض انفرادی آزادی اور جائداد ہی کا تحفظ نہ کرے بلکہ اجتماعی طور پر ان مقاصد کے حصول کی جدوجہد کرے جو انفرادی طور پر کبھی نہ حاصل ہو سکتے ہوں۔ یعنی انسانوں کو تعلیم، طاقت اور آزادی کی نعمتوں سے بہرہ ور کریں۔ پس ریاست کا مقصد انسانوں کا مثبت ارتقا ہے جس سے حقیقی آزادی حاصل ہو سکے۔ میرے خیال میں ریاستیں اس مقصد کے حصول کی کوشش لاشعوری طور پر کرتی رہی ہیں اور اس سلسلے میں قائدین کی مرضی کے

خلاف بھی کام ہوا ہے۔

لیکن محنت کش طبقے کی ہمیشہ یہی خواہش رہی ہے کہ ریاست ان کے مصائب کے ازالے کے لئے اجتماعی قدم اٹھائے کیونکہ وہ انفرادی طور پر اپنی مصیبتوں کو ختم نہیں کر سکتے۔ اگر ریاست اس تصوّر پر کام کرے تو وہ حالات کے دھارے میں لاشعوری طور پر نہ بہہ سکے جیسا کہ اب تک دنیا کی ریاستوں میں ہوتا رہا ہے بلکہ نہایت واضح شعور اور مکمل ادراک کے ساتھ اخلاقیات کو اپنا مشن قرار دے سکتی ہے اور اس طرح انسانی روح اپنی معراج پا سکتی ہے اور ہر طرف بے مثال مسرت و انبساط، تہذیب و ثقافت اور آزادی و مساوات کا دور دورہ ہو سکتا ہے۔

حضرات! یہ ہے محنت کش طبقے کا تصوّرِ ریاست اور مقصدِ ریاست جو بورژوائی طبقے کے نظریات سے یکسر مختلف ہے۔ اوّل الذکر عام حق رائے دہی پر ایمان رکھتے ہیں جبکہ آخرالذکر مردم شماری کو اصول مانتے ہیں۔

جن خیالات کا میں نے اظہار کیا ہے انھیں محنت کش طبقے کا نظریہ سمجھنا چاہیئے۔ تاریخ جدید میں اس نظریئے کو بروئے کار لانا ہے ہمیں ایک دوسرے کو مبارکباد دینا چاہیئے کہ ہم ایسے وقت میں پیدا ہوئے جبکہ تاریخ کا عظیم الشان کارنامہ ہمارا مقدّر بن چکا ہے اور یہ کارنامہ خود ہمارے ہاتھوں ظہور پذیر ہوگا۔

الیگزنڈر فان ہمبولڈ

فطرت پسند الیگزنڈر فان ہمبولڈ (۱۸۵۹ - ۱۷۶۹) اپنے بھائی ولہلم کی طرح جرمنی کے شاندار ماضی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا لیکن اس نے ترقی پذیر طبعی علوم کو اپنی شاندار تصنیف میں بڑی اہمیت دی ہے۔ اس نے اپنے فرانسیسی دوست بونپلاں کے ہمراہ ۱۷۹۹ء سے ۱۸۰۴ء تک مرکزی اور جنوبی امریکہ کا سفر کیا۔ اس سفر نامے کو اُس نے تیس جلدوں میں سپرد قلم کیا ہے جو پندرہ سال میں مکمل ہوا۔ اس کے مطالعے سے ہمبولڈ کی مہارت کا پتہ چلتا ہے۔

ذیل کے اقتباس میں وہاں کے باشندوں کی غلامی اور ہسپانوی حکمرانوں کی فتح اور مشنری قانون کا عمیق تاریخی جائزہ ملتا ہے۔ ہمبولڈ نے ان سطور میں حکمرانوں کے ابتدائی جوش و جذبہ کا بھانڈا پھوڑا ہے اس کے خیال میں ان کا جوش و جذبہ دراصل معاشی مفادات پر نظریاتی آڑ کے مترادف تھا۔

امریکہ کے استوائی علاقوں میں سفر

جہاں کیومانا میں میری قیام گاہ ستاروں کے مطالعے اور موسمی تبدیلی کے مطالعے کے لئے بہت موزوں تھی، وہاں اس کے گرد و نواح دن کے وقت نہایت تکلیف دہ منظر بھی پیش کرتے تھے۔ سامنے بہت بڑا چوراہا تھا جہاں چاروں طرف لکڑی کی گیلریاں بنی تھیں اور ان میں داخل ہونے کے لئے بہت بڑے بڑے پھاٹک اور محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ غلاموں کی خرید و فروخت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہاں سب سے زیادہ افریقہ کے حبشی فروخت ہوتے تھے۔ انھیں لانے میں یورپ کے تمام ممالک پیش پیش

تھے ۔ خدا جانے ان کا قومی افتخار اور جذبۂ انسانیت اِن ارذل کاموں کے وقت کہاں دفن ہوجاتا تھا؟ فروخت کے لئے لائے جانے والے غلام زیادہ تر پندرہ سے بیس سال تک کے نوجوان تھے ۔ ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ روزانہ صبح کے وقت انہیں ناریل کی گری تقسیم کر دی جاتی وہ اس کو اپنے جسم اور چہرے پر رگڑتے اور خوب خوب چمکاتے تھے ۔ اس طرح ان کا سیاہ رنگ اور چمکیلا ہوجاتا تھا۔ خریدار ان کی چمک دیکھنے کے علاوہ اُن کے دانت بھی گنتے تھے ۔ دانتوں سے ان کی عمر اور صحت کا اندازہ ہوجاتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ دانت دیکھنے کا قاعدہ جانوروں کی خرید کے لئے رائج ہے وہاں یہی قاعدہ انسانوں پر نافذ کیا جاتا تھا۔ یہ فعل قبیح افریقہ سے رائج چلا آتا ہے جہاں الجزیرہ میں عیسائی غلاموں کی خرید و فروخت کا چلن تھا۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ جزائر غرب الہند میں آج تک یورپی نوآبادکار اپنے غلاموں کے جسم پر گرم لوہا داغ دیتے ہیں تاکہ اگر وہ بھاگ جائیں تو ان کا سراغ لگایا جاسکے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ انعام کن لوگوں کو دیا جاتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو یورپی باشندوں کی زمینوں کو جوتتے بوتے اور سرسبز و شاداب کرتے ہیں۔ یہ تمام کریہہ مناظر دیکھ کر مجھے یک گونہ خوشی بھی ہوتی کہ میں ایک ایسی قوم کا فرد ہوں اور ایک ایسے برّاعظم کا باشندہ ہوں جہاں یہ مناظر شاذ ہی نظر آتے ہیں اور غلاموں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ۱۸۰۰ء میں وہاں کے دو صوبوں کیوماناا اور برکیلونا کی آبادی تقریباً ایک لاکھ اسّی ہزار تھی اس میں چھ ہزار غلام شامل تھے۔ بہرحال افریقی غلاموں کی تجارت اتنی زیادہ نہیں ہے جتنی سولھویں صدی میں خود امریکی غلاموں کی ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے کی حالت کا صاف اور سچا نقشہ جیرلامو بنیزونی نے کھینچا ہے جس نے ۲۲ سال کی عمر میں ترافرما-TERRA

FIRMA کاسفر کیا تھا۔ اس نے ۱۵۴۲ء میں بارڈونس، کیریاکو اور پر یا کے ساحلوں پر مہم جوئی کی تھی۔ اس نے غلاموں پر مظالم کی دل ہلا دینے والی داستانیں لکھی ہیں۔ اس نے ان چشم دید واقعات کے ذکر میں جس صاف گوئی کا مظاہرہ کیا ہے وہ اس دور کے مورخین میں بالعموم ناپید تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ غلاموں کو نیوکیڈز لے جاکر ان کی پیشانیوں اور بازوؤں کو گرم لوہے سے داغا جاتا تھا وہاں سے انھیں جزیرۂ ہیتی بھیج دیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی ان کے مالک بغیر بکے ہوئے بدل جایا کرتے تھے کیونکہ وہ جوئے میں داؤں پر لگا دیئے جاتے تھے۔

یہ محض اتفاق ہے کہ ہم نے سب سے پہلے جزیرہ نمائے آریاہی کا سفر کیا جو کبھی غلاموں کی فروخت اور موتی نکالے جانے کے لئے بڑا مشہور تھا۔ یہاں آنے کا واحد مقصد قلعہ کے آثار دیکھنا تھا۔ اس کے علاوہ طبقات الارض اور نمک کی چٹانوں کے بارے میں مشاہدات کرنے تھے۔ ہم رات کو دو بجے یونمز زیر پہنچے۔ موسم بہت خنک تھا۔ ہر طرف جگنو دمکتے پھر رہے تھے۔ بڑا سہانا منظر تھا۔ دریا نہایت سکون سے بہہ رہا تھا۔ آسمان پر ستارے بھی رنگینی بخش رہے تھے اچانک ہماری نظر دور ایک آگ پر پڑی۔ ہم آگے بڑھے اور اس آگ کے قریب پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ حبشی گتار کی دھن پر رقص کر رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ افریقی حبشی بڑے زندہ دل ہوتے ہیں اور ان کی چستی اور پھرتیلا پن کبھی نہ تھکنے والا ہوتا ہے۔ ہفتہ بھر تک جان توڑ محنت کرنے کے بعد ہفتے کو رات بھر جاگتے ہیں اور خوب مزے میں رقص و موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ رنگ رلیاں ان کی پر محن اور دردناک زندگی کی تلخیوں میں کچھ رس گھول دیتی ہیں۔

کولمبس نے پہلی مرتبہ جب سرزمین امریکہ پر قدم رکھا تو وہ جگہ بریا کی سطح مرتفع تھی۔ سولہویں صدی کے آغاز میں بدقسمت ہندیوں کے ساتھ

ساحلی علاقوں میں وہی سلوک کیا جاتا تھا جیسا ہمارے زمانے میں گنی والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس جزیرہ کی زمین بڑی زرخیز ہے۔ پرانی دنیا کی تمام سبزیاں یہاں اُگائی گئی ہیں۔ نوآبادی کا طریقہ یہاں مدتوں سے رائج ہے۔ہسپانوی باشندے جب یہاں پہنچے تو ان کے سامنے یہ مقصد تھا کہ یا تو بذریعہ تشدد یا بذریعہ تبادلہ غلام، موتی، سونا اور رنگ والی لکڑی حاصل کی جائے ان کی ہر ممکن کوشش تھی کہ اس کام کو وہ ذاتی منفعت بتانے کے بجائے مذہبی اور شرعی مقاصد کا حامل بتایا جائے۔ تانبے جیسے ہندوستانیوں کی خرید و فروخت بھی اسی طرح غیر انسانی بنیادوں پر جاری تھی جس طرح افریقی نیگرو باشندوں کی۔ان کے نتائج بھی ظاہر تھے یعنی فاتح اور مفتوح دونوں کچھ زیادہ ہی برافروختہ ہوجاتے تھے۔ نتیجتاً مقامیوں میں آپس میں ہی جدال و قتال شروع ہوجاتا تھا۔غیر ملکی ان کو قیدی بناکر اور پاؤں میں بیڑی ڈال کر جہازوں میں بٹھا دیتے تھے اور اپنے ساتھ اپنے وطن لے آتے تھے۔ اس زمانے میں سب سے زیادہ مہذب قوم ہسپانوی تھے۔ ان کے علاوہ اٹلی کے فن اور ادب کی شعاعیں دنیا کے اُن تمام ممالک کو منوّر کر رہی تھیں جن کی زبان کا ماخذ ڈانٹے اور پیٹرارک کا سا ہے۔ اب یہ توقع برمحل تھی کہ ذہن کے چلاچانے سے دنیا بھر کی قوموں کے عادات و اطوار اور آدابِ معاشرت میں انقلاب آجائے گا لیکن حقیقت بڑی تلخ ہے۔ یورپی اقوام کی دولت کی طلب جب کبھی اقتدار کی ہوس میں تبدیل ہوئی انھوں نے تاریخ کے ہر دور میں ایسی کردار کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیودہم کے شاندار دور میں بھی نئی دنیا میں اتنے مظالم ہوئے کہ انتہائی وحشیانہ دور بھی شرما گئے۔ بہرحال ہمیں فتح امریکہ کے ہولناک واقعات پر اتنا تعجب نہیں ہوتا جب ہم افریقہ کے مغربی ساحل پر ہونے والے مسلسل ظلم کا تصور کر لیتے ہیں۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ آج انتہائی انسانی قوانین کے فائدے عام لوگوں تک پہنچ رہے ہیں۔

چارلس پنجم کے اصولوں سے نئی دنیا میں غلاموں کی خرید و فروخت کا سلسلہ بند ہوگیا۔ لیکن پیرو اور میکسکو کے حملہ آوروں نے جھڑپوں کا سلسلہ جاری رکھا جس سے امریکی آبادی کم ہوتی گئی قومی عصبیتوں کی دیواریں بلند تر ہوتی گئیں اور ترقی پذیر تہذیب کی بنیادوں کو ہلا پھینکا۔ بالآخر مشینری والوں نے لامذہبیت کے پردے میں امن و آشتی کا درس دیا۔ درحقیقت یہ مذہب ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو خود کردہ گناہوں کے باوجود سکون بخشا، مقامیوں کی وکالت بادشاہوں کے حضور کی، پیرو اور میکسکو والوں کی جارحیت کا مقابلہ کیا اور خانہ بدوش قبائل کو یکجا کرکے انھیں چھوٹی چھوٹی مشینری جماعتوں کی شکل عطا کی۔ اس کے نتیجے میں ان کی زراعت میں بھی ترقی ہوئی۔ لیکن یہ جماعتیں بالآخر کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوئیں کیونکہ ان کی بنیاد بہت کمزور تھی۔ چنانچہ جس مقصد سے یہ جماعتیں تشکیل دی گئی تھیں وہ مقصد سرے سے فوت ہوگیا ہندوستانیوں کی حالت میں کچھ زیادہ تبدیلی نہ آئی کیونکہ بہرحال یہ لوگ بھی الگ تھلگ رہتے تھے ان کے خیالات بھی محدود رہے۔ رفتہ رفتہ ان کے کردار کی انفرادیت اور جذبۂ قومیت ختم ہوتے گئے جو کسی بھی معاشرہ میں آزادی کے بے بہا انعام ہوتے ہیں۔ ان پر طرح طرح کے قوانین کے نفاذ سے ان کی خانگی زندگی بھی مجہول کر دی گئی اور ان کو یہاں تک وفادار بنانے کی کوشش کی گئی کہ وہ بالکل خبطی ہوکر رہ گئے۔ خوراک کی فراہمی اور امن و سکون کی فراوانی کے باوصف ان پر اتنی بندشیں عاید کی گئیں کہ ان کے چہرے لٹک گئے۔ وہ ہر وقت اداس نظر آنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ انھوں نے اپنی آزادی کو امن و سکون کی تلاش میں قربان تو کیا ہے لیکن بڑے غم و اندوہ کے ساتھ۔

خانقاہی زندگی سے ملک بڑے مفید شہریوں سے محروم ہوجاتا ہے البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ لوگوں کے جذبات ٹھنڈے ہوجاتے ہیں، اندیشۂ سود و زیاں

جاتا رہتا ہے اور فکر و نظر میں وسعت پیدا ہونے لگتی ہے۔ لیکن ایک نئی دنیا کے جنگلات اس طرزِ زندگی کے لئے قطعاً ناموزوں تھے اس لئے جان لیوا ثابت ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نسل در نسل ذہنی ارتقاء سے محروم رہا اور بین قومی ارتباط نہ ہو سکا۔ انہی وجوہ کی بنا پر مقامی باشندوں کو دنیا سے دور مشن میں رکھا جاتا ہے یعنی بے حس و حرکت رکھا جاتا ہے۔ جب کبھی ذہن انسانی کا ساتھ معاشرہ نہیں دے پاتا تو اس کی نہ صرف ترقی رک جاتی ہے بلکہ وہ ترقیٔ معکوس میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

جوہان پیٹر ہیبل

۱۸۲۶ — ۱۸۶۰

جوہان پیٹر ہیبل جنوبی مغربی جرمنی کا رہنے والا تھا۔ وہ ایک دینی پیشوا ہونے کے ساتھ ساتھ معلّم اور ادیب بھی تھا۔ شاعری میں بھی اُسے ملکہ حاصل تھا جنوبی جرمن بولی میں وہ شاعری کا بانی مبانی تھا۔ جہاں تک نثر نگاری کا تعلق ہے اس نے اپنی تحریروں میں زبردست قوت بیان کا مظاہرہ کیا ہے۔ کہانیوں اور تبصروں میں وہ ایک معلّم کی حیثیت میں صاف پہچانا جاتا ہے اس کے مضامین میں جہاں ایک طرف سادگی، خلوص، اور علم و آگہی کے موتی ملتے ہیں تو دوسری طرف مزاح اور بذلہ سنجی کے بحرِ بیکراں سے بھی گزرنا ہوتا ہے۔ اس کے اسلوب کا کمال یہ ہے کہ اس کے تمام افسانوں کے پلاٹ اور کردار روایتی اور عمومی ماحول سے تعلق رکھنے کے باوجود معنوی اعتبار سے بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ اس کے افسانوں کے مجموعے ۱۸۰۸ء سے ۱۸۱۱ء تک مسلسل شائع ہوئے۔

بارش کی متعدد قسمیں

اگر آپ سے یہ پوچھا جائے کہ اچھی بارش کسے کہتے ہیں تو آپ یہی کہیں گے کہ وہ بارش جو کھیتوں اور باغات کو سیراب کر دے اور اچھی فصل کا پیغام دے وہی سب سے اچھی ہے لیکن اگر آسمان سے خون یا گندھک مینڈک یا پتھر اور سپاہیوں کے ہیٹ وغیرہ برسنے لگیں تو آپ کیا جواب دیں گے۔ تو میرا جواب حاضر ہے۔!

گندھک کی بارش موسم بہار کے فوراً بعد اگر بارش کا سلسلہ شروع ہو جائے تو اکثر گڑھوں میں پانی بھر جاتا ہے اور اس کے کنارے کنارے زرد

رنگ کی مٹی نظر آتی ہے جو بالکل پسی ہوئی گندھک کی مشابہت رکھتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ طوفانی بارش کے وقت بادلوں میں گندھک کے بخارات شامل ہو جاتے ہیں اور یہ بخارات پانی کے ساتھ مل کر زمین تک پہنچتے ہیں۔ آبی بخارات اور گندھک کے بخارات دونوں ایک ساتھ شکل تبدیل کرتے ہیں۔ ایک روایت یہ بھی اکثر لوگوں میں سنی جاتی ہے کہ کسی زمانے میں آسمان سے سودوم اور گومدراہ میں آگ اور آتشی پتھروں کی بارش ہوئی تھی خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگ اس زمانے میں نہ ہوئے۔ خیر! تو میں عرض کر رہا تھا کہ پانی کی سطح پر تیرتا ہوا زرد پاؤڈر گندھک نہیں ہے یہ تو درختوں کے پھولوں سے گرے ہوئے زرد دانے ہیں۔ اگر کوئی زرد چیز جلنے لگے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ گندھک ہی ہے۔ لالہ کے پھول کو دیکھئے اس میں چھ نازک ڈنڈیاں ایک دائرے کی شکل میں کھڑی ہیں اور ان کے سروں پر سیاہ دانے چپکے ہیں جب کوئی آدمی اس کو سونگھتا ہے تو یہ سیاہ دانے اس کی ناک میں لگ جاتے ہیں اور ناک کی نوک سیاہ نظر آتی ہے۔ اسی طرح سوسن کے پھول میں یہ دانے زرد رنگ کے ہیں۔ زیادہ تر پھولوں میں یہ دانے زرد رنگ کے ہوتے ہیں موسم بہار میں باغات پر شباب ہوتا ہے پھول اور کلیاں زرد دانوں سے لدے ہوتے ہیں جب تیز بارش ہوتی ہے تو اس کے زور سے یہ زرد دانے ٹوٹ ٹوٹ کر پانی کی سطح پر تیرنے لگتے ہیں یہی زرد دانے پھل اور بیج کی افزائش کے لئے لازمی ہیں۔ اسی لئے آپ نے سنا ہو گا کہ جس سال موسم بہار کے بعد بارش ہو جائے اس سال پھل زیادہ نہیں ہوتے۔ جب جوہڑوں کا پانی بخارات بن کر اڑ جاتا ہے تو یہی زرد دانے زمین کی تہہ پر نظر آتے۔ اس بات کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ موسم خزاں اور گرمی کے بعد کی بارشوں میں یہ دانے نظر نہیں آتے بلکہ ان کی جگہ سیب، اخروٹ اور دوسرے پھل نظر آتے ہیں۔ اس وقت اپنی خیالی گندھک کو بھول جاتے ہیں۔

خون کی بارش آپ نے دیکھا ہوگا کہ موسم بہار یا موسم گرما میں اکثر زمین پتوں اور دوسرے ہلکے رنگ کی چیزوں کے اوپر بارش کے قطروں کی طرح سرخ سرخ قطرے نظر آتے ہیں۔ چونکہ لوگوں کو ان کی اصلیت کا پتہ نہیں ہوتا اس لئے اُسے مافوق الفطرت سمجھتے ہوئے خون کے قطرے سمجھ لیتے ہیں اور پھر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ آسمان سے خون کی بارش ہوئی ہے جو جنگ کی نشانی ہے۔

جس طرح ہر زرد چیز گندھک نہیں ہو سکتی ٹھیک اسی طرح ہر سرخ قطرہ خون نہیں ہو سکتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ درختوں اور جھاڑیوں میں چھوٹے چھوٹے انڈے چپکے ہوتے ہیں جو موسم بہار میں سورج کی تمازت سے خود بخود سیتے ہیں اور انمیں سے تتلی کے پہلے روپ نکلتے ہیں۔ چند ہفتوں میں یہ بڑے اور گول شکل کے ہو جاتے ہیں وہ رینگ کر کسی اونچی جگہ جاتے ہیں پھر پچھلے حصے کو زمین کی طرف دبا کر اور اگلے حصے کو نیچا کر کے اپنی کھال اتار پھینکتے ہیں۔ نئی شکل کو پیلہ یا تتلی کا دوسرا روپ کہتے ہیں۔ اس وقت اس کے نہ تو آنکھیں ہوتی ہیں نہ سر پیر اور نہ بازو۔ دیکھنے والے کو کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ کیا چیز ہے! کیا بننے والی ہے۔ لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد تتلی کی شکل بننی شروع ہو جاتی ہے چند گھنٹے وہ بے حس و حرکت پڑی رہتی ہے اس کے بعد اس کے پچھلے حصے سے سات آٹھ سرخ رنگ کے قطرے زمین پر گرتے ہیں بس ان قطروں کے گرتے ہی وہ تتلی بن جاتی ہے اور پھڑوں پھڑوں گھومنے لگتی ہے۔ یہ سوائے خدا کے اور کس کا کام ہو سکتا ہے کہ ایک بھدے اور بے ہنگم کیڑے کو بدل کر دلکش اور ہنس مکھ تتلی بنا دیتا ہے۔ چنانچہ پیڑ پودوں پہ لگے ہوئے مکڑی کے جالے تتلیوں کے انڈوں کے امین بن جاتے ہیں۔ تتلیوں کے دوسرے روپ سینکڑوں سرخ قطرے چھوڑتے ہیں۔ ایک سو تتلیوں سے سات آٹھ سو سرخ قطرے نکل سکتے ہیں یہی قطرے خون معلوم ہوتے ہیں لوگ

اسی کو خون کی بارش سمجھ لیتے ہیں اور پھر اس سے کیا کیا عقیدے منسلک کرتے ہیں۔

مینڈکوں کی بارش

لوگ اکثر مینڈکوں کی بارش کا بھی ذکر کرتے ہیں لیکن کسی نے آج تک اپنی آنکھ سے ان کی بارش نہ دیکھی ہوگی۔ اس کی صورت یہ ہے کہ گرمیوں میں بعض مینڈک باغات اور جنگلات میں نکل جاتے ہیں جہاں انھیں ٹھنڈے پیڑوں کے سائے مل جاتے ہیں وہ ایسی جگہ چھُپ کر بیٹھتے ہیں کہ کوئی دیکھ بھی نہیں پاتا۔ ہلکی بارش میں وہ باہر نکل آتے ہیں اور اپنی ٹرٹوں ٹرٹوں لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ آس پاس کے سادہ لوح لوگ جب اتنی بڑی تعداد میں مینڈک ایک جگہ دیکھتے ہیں تو وہ سوچنے کی زحمت گوارا کیے بغیر یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ آسمان سے برسے ہوں گے۔

پتھروں کی بارش

پتھروں کی بارش کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ یہ تخیل کی پیداوار نہیں ہے۔ بلکہ فی الواقع آسمان سے ایک یا ایک سے زیادہ پتھر برسے ہیں۔ اس کا ثبوت تاریخ سے بھی ملتا ہے اور حال کے عینی شواہد سے بھی۔

محفوظ تاریخ میں سب سے پہلے ترکی کے شہر رومیلی میں ۴۶۲ق م میں ایک بہت بڑا پتھر آسمان سے گرا تھا۔ اس وقت سے لے کر آج تک کوئی اڑتیس ایسے پتھروں کا گرنا تاریخ سے ثابت ہے۔ مثلاً ۴ نومبر ۱۴۹۲ء کو ۲۶۰ پونٹ وزنی پتھر انسیہائم (ENSISHEIM) پر گرا تھا۔ اٹلی میں ۱۶۷۲ء میں دو پتھر جن کے وزن دو سو اور تین سو پونڈ تھے گرے تھے۔ یہ واقعات تو پرانے ہیں ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بھائی کس نے دیکھا ہے جو مورخین نے لکھ دیا وہ مان لیا لیکن ماضی قریب کی تاریخ سے کون نظریں پھیر سکتا ہے۔ ۱۷۹۰ء اور ۱۷۸۹ء میں فرانس میں اور ۱۷۹۴ء میں اٹلی میں ایسے ہی متعدد پتھر آسمان سے گرے۔ اس کے بعد ۲۶ اپریل ۱۸۰۳ء کو فرانس کے ایک گاؤں میں تقریباً دو تین ہزار پتھر بڑی گھن گرج کے ساتھ آسمان سے گرے۔ اتوار ۲۲ مئی ۱۸۰۸ء کو آسٹریا کے

ایک شہر موراویا میں پتھروں کی بارش ہوئی۔ شہنشاہ نے فوراً ماہرین کو طلب کرکے اس کی تحقیقات کا حکم دے دیا۔ ماہرین نے اپنی رپورٹ میں لکھا۔
ایک سہانی صبح تھی لوگ بڑے اطمینان سے گرجا کی طرف جا رہے تھے اچانک فضا میں گرد و غبار کے بادل چھا گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آس پاس کی چیزیں نظروں سے اوجھل ہونے لگیں۔ چند ہی لمحے اس ہولناک منظر میں گذرے ہوں گے کہ بندوق کی گولیوں اور ڈرم لڑھکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ بعضوں کو سیٹیوں کی آوازیں بھی معلوم ہوئیں۔ لوگ یہ سمجھے کہ شاید فوج تزک موسیقی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے وہ مارے خوف و دہشت کے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھے۔ اچانک ان کے چاروں طرف ایسی بارش شروع ہوگئی جس سے بچاؤ کے لئے نہ تو اوورکوٹ کام آئے اور نہ کوئی دوسری چیز۔ اور دور تک پتھروں کی بارش ہو رہی تھی۔ پتھر مختلف سائزوں اور وزن کے تھے۔ پتھروں کا سائز اخروٹ سے لے کر بچوں کے سر تک کا تھا جبکہ وزن ایک اونس سے لے کر دس پونڈ تک تھا۔ بارش کی طرح بعض پتھر بالکل عموداً نیچے گر رہے تھے اور بعض ترچھے۔ جب یہ بارش بند ہوئی اور پتھر اٹھا کر دیکھے گئے تو وہ بہت گرم تھے بعض پتھر جن کے وزن زیادہ تھے زمین کے اندر دو فٹ تک دھنس گئے۔ وہ بھورے رنگ کی ریت کے بنے تھے جن پر سیاہ چمکدار چھلکا تھا۔ وہ اتنی بڑی تعداد میں گرے تھے کہ ان کی گنتی نہ ہو سکی۔ کچھ پتھر تو کھیتوں میں گرے تھے اور ہو سکتا ہے اب بھی مٹی میں دھنسے ہوئے ہوں۔ یہ بارش کوئی آٹھ منٹ تک جاری رہی دوپہر تک مطلع صاف ہوگیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کہ یہاں کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ ابھی تک ماہرین نے اس واقعہ پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے اگر کوئی ان سے پوچھتا ہے تو وہ خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔

ہیٹوں کی بارش اس سلسلے میں سب سے آخری کڑی جو سب سے زیادہ ناقابل فہم ہے وہ سپاہیوں کے ہیٹوں کی بارش ہے۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں سیکسونی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں کوئی کسان اپنے کھیتوں میں شام کے وقت کام کر رہا تھا۔ قریب ہی ایک پہاڑ بھی تھا۔ اچانک فضا پر طوفان منڈلانے لگا اور دور کہیں گرج کی آوازیں آنے لگیں۔ آسمان پر سیاہ بادل حد نظر تک پھیل گئے۔ پلک جھپکتے میں اس بے چارے کسان کے چاروں طرف ہیٹوں کی بارش شروع ہوگئی پورا کھیت ہیٹوں سے سیاہ ہو گیا اور کسان ذرا دیر میں ہزاروں ہیٹوں کا مالک ہو گیا جب ذرا بارش تھمی تو وہ بھاگتا ہوا گھر پہنچا اور اپنے ساتھ تھوڑے سے ہیٹ بھی لے گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے سب کو ہیٹ دکھائے اور سارا قصہ کہہ سنایا گاؤں کا ہیٹ ساز تو یہ ماجرا سن کر بہت بددل ہوا۔ باقی لوگوں نے خوب مزے سے یہ واقعہ سنا۔ کچھ دن بعد اصل حقیقت معلوم ہوئی یعنی پہاڑ کے پیچھے ایک میدان تھا وہاں ایک فوجی دستہ اپنی مشقوں میں مصروف تھا۔ اچانک تیز آندھی آئی جس سے ان فوجیوں کے ہیٹ اڑ گئے اور پہاڑ پر سے اڑتے ہوئے قرب وجوار کے کھیتوں میں گرے ممکن ہے یہ واقعہ درست ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اتنے بہت سے ہیٹ کوئی زبردست آندھی سے ہی اڑ سکتے ہیں واللہ اعلم بالصواب۔

کچھ کائنات کی ساخت کے بارے میں ایک سادہ مزاج قاری جب اپنے لجانے پہچانے پہاڑوں اور درختوں کے بیچ میں اپنے اہل خاندان کے ساتھ بیٹھتا ہے یا اگلی ان میں بیٹھ کر دور تک سے چاروں طرف نگاہ ڈالتا ہے تو اسے بڑا سکون ملتا ہے اور وہ دنیا کے تفکرات سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ لیکن آفتاب کا پُرشکوہ طلوع یا غروب ہر ناظر کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ سورج کہاں سے آتا ہے اور کہاں جاتا

ہے۔ پہاڑوں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا کون سا خفیہ راستہ یہ اختیار کرتا ہے۔ اور اپنی روشنی کو رات کے وقت کہاں چھپاتا ہے۔ اسی طرح چاند کا بڑھنا گھٹنا اور اس کی چمک میں زیادتی، کمی ہونا کیونکر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ جگمگ کرتے ہوئے ستاروں کو دیکھ کر بھی یہ خیال آتا ہے کہ ان سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور پہنچتا ہے لیکن یہ سب کچھ کیونکر ہوتا ہے یہ اُسے نہیں معلوم۔ پیارے دوستو! یہ کوئی قابل تعریف بات نہیں ہے کہ روزانہ اپنے چاروں طرف ایسی عجیب وغریب چیزوں کو دیکھو اور اس کا سبب نہ معلوم کرو۔ سنو! یہ وسیع وعریض آسمان ایک بہت بڑی کتاب ہے جس میں خدا کی بزرگی اور قدرت کا بیان درج ہے علاوہ ازیں اس کتاب میں گناہ اور ضعیف الاعتقادی سے بچنے کے لئے بعض مجرب نسخے لکھے ہوئے ہیں۔ ستارے اس کتاب کے سنہرے حروف ہیں لیکن اس کتاب کی زبان عربی ہے اس لئے کسی ترجمان کے بغیر اس کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اگر کوئی اس مقدس صحیفے کو ایک مرتبہ پڑھ کر اس پر عمل کرنے لگے تو کبھی اس کا ذہن منتشر نہ ہو اور اگر کبھی رات کی تاریکی اُسے گناہ کی طرف راغب کرے تو وہ خود بخود اس سے بھاگے گا۔

میری فان ایبنز ایشین باخ

(۱۸۳۰ تا ۱۹۱۶)

میری فان ایبنز ایشین باخ جو بحیثیت ناول نگار اور افسانہ نویس ایک منفرد مقام کی حامل ہیں وی آنا میں آسٹری سوسائٹی اور کسانوں کے مسائل کا گہرا نفسیاتی شعور رکھتی ہیں ۔ ان کا برملا اظہار بھی اپنی تصانیف میں کیا ہے ۔ وہ اخلاقی رجحانات اور سماجی عدل کی زبردست علمبردار تھیں ۔ ان کی تنقیدوں میں انہی جذبات و احساسات کی جھلک ملتی ہے ۔ ان کی نظمیں اور پریوں کی کہانیوں پر مشتمل تمثیلوں کے مجموعے ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئے ۔ ذیل میں اسی کتاب سے ایک کہانی بعنوان " ہمسائے " پیش کی جا رہی ہے جو قابل فہم استعاروں میں ہونے کے باوجود اپنی سادگی کی وجہ سے ہمیشہ پسند کی جائے گی ۔

ہمسائے

ایک گاؤں میں دو گڈریے رہتے تھے ایک کے سر کے بال سیاہ تھے اور دوسرے کے بھورے ۔ دونوں کے مکان برابر برابر تھے ۔ دونوں ہی شریف انسان تھے اور اپنے اپنے قبیلہ کے سردار تھے ۔ دونوں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے ۔ وقت پڑنے پر ایک دوسرے کے کام آتے تھے ۔ اپنی پیداوار ضرورت کے مطابق ایک دوسرے کو دیتے تھے " حساب دوستاں دردل " کے مصداق انھوں نے کبھی اپنے لین دین کا حساب نہ کیا ۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پت جھڑ کے موسم میں زبردست آندھی آئی جس سے بھورے بالوں والے دوست کے باغات کو بڑا نقصان پہنچا ۔ چھوٹے چھوٹے پودے جڑ سے اکھڑ گئے ۔ بڑے تناور درختوں کی موٹی موٹی شاخیں ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گریں ۔

مالک نے اپنے سب ملازمین کو اکٹھا کیا اور ان کو حکم دیا کہ تمام شاخوں کو یکجا کرکے ان کے گٹھے بنا دیئے جائیں۔ ملازمین نے حکم ملتے ہی تمام لکڑیوں کو اکٹھا کرکے گٹھے باندھ دیئے۔ گیلی لکڑی کے کھمبے کٹوا لئے گئے تاکہ مالک نے جو مرغیاں پالی ہوئی ہیں اُن کے لئے باڑھ بنوالی جائے۔

اتفاق کی بات کہ سیاہ بالوں والے آدمی کے ایک ملازم نے ان کھمبوں کو باڑھ میں لے جاتے دیکھ لیا۔ وہ ملازم تھا کچھ بے پرواسا۔ ٹھیک طرح دیکھے بغیر اس نے یہ سمجھ لیا کہ بے شمار کھمبے جا رہے ہیں وہ بڑا خوفزدہ ہوا اور بھاگا بھاگا اپنے مالک کے پاس پہنچا اور اس سے کہا" حضور! بڑا غضب ہوگیا۔ ہمارا پڑوسی ہمارے خلاف بہت بڑی سازش کر رہا ہے اس کی نیت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس کے ہاں ڈنڈے اکٹھا ہوتے دیکھے ہیں"۔

اس خبر کے سنتے ہی ہر شخص گھبرانے لگا۔ تمام ملازمین میں دہشت پھیل گئی ان سب کے کہنے سننے سے بھورے بالوں والے پڑوسی کے دل میں بھی شک پیدا ہوگیا اور اس نے حکم دے دیا کہ "تم لوگ بھی ڈنڈے اکٹھا کرو تاکہ حملہ آور کا مقابلہ کیا جاسکے۔ اگر اس نے ایک باڑھ میں ڈنڈے اکٹھا کئے ہیں تو ہم ایسی ایسی تین باڑھیں ڈنڈوں سے پاٹ دیں گے"۔ چنانچہ باغات میں ہر طرف لکڑہارے پھیلا دیئے گئے۔ انھوں نے نہایت بے دردی سے چھوٹے بڑے تمام پیڑ پودے کاٹنے شروع کر دیئے۔ ذرا دیر میں لہلہاتا چمن ویران ہوگیا اور سیاہ بالوں والے پڑوسی کے پاس ہزاروں ڈنڈوں کا ڈھیر لگ گیا۔

جب اس کی خبر بھورے بالوں والے کو ملی تو اس کو بھی بڑی تشویش ہوئی۔ اس کے احساسات بھی ویسے ہی ہوگئے جیسے کہ پہلے سیاہ بالوں والے کے ہوئے تھے۔ تمام ملازمین نے یک زبان ہوکر کہا کہ "ہمیں بھی تیاری کرنی چاہیئے آقا! ہمارا فرض ہے کہ جنگ کے دوران ہمارے ڈنڈے زیادہ ہوں"۔ چنانچہ دونوں پڑوسی ڈنڈے اکٹھا کرنے کے مقابلے میں لگ گئے دونوں ہی یہ بھول گئے کہ وہ

آخر کس چیز کی حفاظت کرنے کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں۔ غربت و افلاس کے علاوہ ان کا اثاثہ اور کیا ہوگا۔

باغات کا عالم ہی عجیب تھا۔ حد نظر تک نہ کوئی کھیت نظر آتا تھا اور نہ کوئی باغ، ہل، پھاوڑا، گینتی، کلہاڑی کچھ بھی تو نہ بچا تھا تیاریوں کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ خلقت دعائیں مانگنے لگی کہ "اے پروردگار! اب تو جنگ چھڑ دے تاکہ دشمن کے ڈنڈوں سے ہمارا قصہ پاک ہو جائے۔ اب تو ہم سے فاقہ کشی نہیں ہو سکتی" دونوں پڑوسی بھی اس صورت حال سے تنگ آ چکے تھے کیونکہ رعایا کی بھوک اور بیکاری اب ان سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔ چنانچہ وہ دونوں بھی دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے کہ خدا انھیں موت دے دے۔ اب بڑھاپے میں یہ نقشہ دیکھا نہیں جاتا۔

لیکن مقدر نے ایک بار پھر یاوری کی ــــ!

دونوں اپنی تباہ شدہ زمینوں کا جائزہ لینے کے لئے پہاڑ پر دو طرف سے چڑھے۔ دونوں ایک دوسرے سے بے خبر تھے۔ یہاں تک کہ دونوں ایک ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے۔ یہاں یہ دونوں کی زمینوں کی سرحد تھی۔ جب دونوں ہمسائے وہاں پہنچے تو ان کا برا حال تھا۔ اُن کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی دونوں کے ہاتھ پہلے اپنے بچاؤ میں اوپر اٹھے لیکن چشم زدن میں نیچے آگئے ان کے ہاتھوں کے ڈنڈے نیچے گر پڑے۔ پچاس سالہ محبت کے سامنے جو نفرت کی دیوار کھڑی ہو گئی تھی وہ دھڑام سے گر پڑی۔ دوست نے دوست کو چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ اب نہ کوئی بھورے بالوں والا تھا اور نہ کوئی سیاہ بالوں والا۔ اب تو دونوں ہی کے بال سفید ہو چکے تھے۔ دونوں یک زبان ہو کر چلائے "اے سن سفید دوست" اور یہ کہتے ہوئے دونوں جھپٹ کر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ اس وقت دونوں میں سے کسی کو یہ ہوش نہ تھا کہ پہلے کس کے ہاتھ پھیلے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح انھیں یہ نہ معلوم ہو سکا تھا کہ پہلے ڈنڈے

کس نے اکٹھا کیے تھے۔ انھیں یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ بے اعتمادی کی فضا کیونکر پیدا ہوئی جس کی وجہ سے ہر چیز قربان ہوگئی اور دونوں دوست اور اُن کی رعایا کی زندگیاں اجیرن ہوگئیں۔

ہاں ایک بات پر دونوں کو اتفاق تھا کہ دنیاوی مال و متاع کے چھن جانے کے خوف نے انھیں ایسی عزیز ترین شے سے محروم کر دیا جس کا بدل دنیا کی کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔
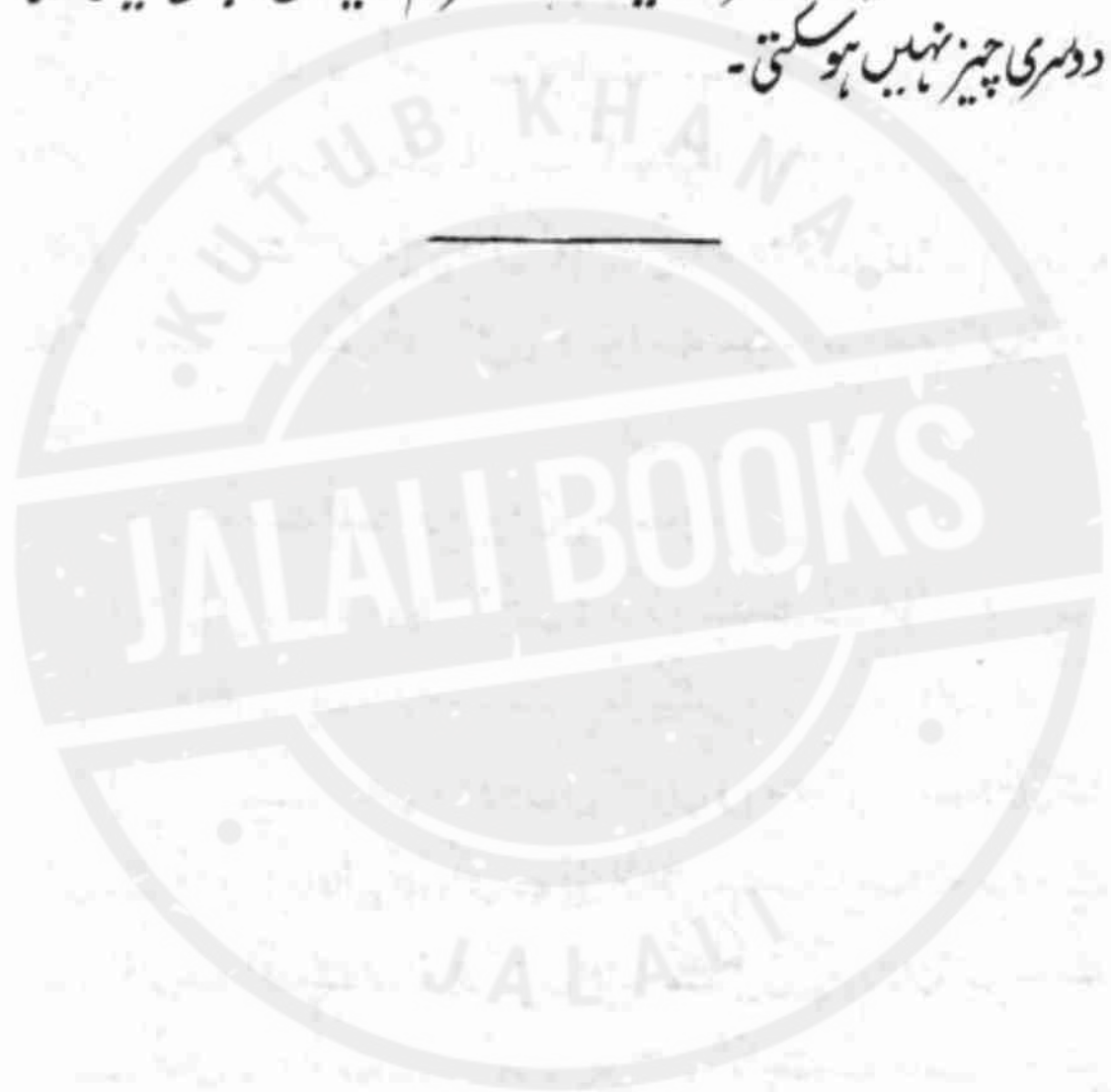
تھیوڈور فونٹین

۱۸۱۹ ۱۸۹۸

تھیوڈور فونٹین کو انیسویں صدی کے عظیم ترین ناول نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی تصانیف میں حقیقت نگاری کا نہایت روشن عکس ملتا ہے۔ اس نے اپنی عمر کی آخری دہائی میں جو ناولیں لکھی ہیں وہ شاہکار کہے جانے کی مستحق ہیں۔ ان میں برلن کی معاشرتی تصویر ملتی ہے۔ کہانیاں زیادہ تر پروشیا کے افسران، درمیانے طبقے کے لوگوں اور برلن کے قرب و جوار کے زمینداروں کے گرد گھومتی ہیں۔ وہ محنت کش طبقے کے چکّر میں نہیں پڑا۔ فونٹین کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے اپنے ناولوں میں خود اپنے خیالات و نظریات کی ترجمانی کی ہے کسی خاص نظریئے کے ترجمان کی حیثیت اختیار نہیں کی۔ تحریر میں مکالموں کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ مکالموں کے ذریعہ جذبات کا اظہار بھی کیا گیا ہے اور رسم و رواج پر طنز بھی ہے۔ پورا ناول پڑھ ڈالئے آپ کو کہیں ایسا مشورہ نہیں ملے گا کہ بورژوائی ریاست کے سیاسی و سماجی اور اخلاقی نظاموں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکو۔ اس کے باوجود ایک ذی فہم قاری ناول پڑھنے کے بعد یہ احساس ضرور لے کر اٹھے گا کہ ان نظاموں کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ ذیل میں فونٹین کی آخری ناول "اسٹیخلن" کا ایک حصّہ دیا جا رہا ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ اندھی قدامت پرستی سے پرانے نظاموں کی دیوارِ شکستہ کو بچایا نہیں جا سکتا۔ تاہم اس دیوار کو مکمل طور پر منہدم بھی کرنا مشکل ہے۔ یہ اندازِ فکر غالباً فونٹین کا خالص نجی انداز تھا۔

اسٹیخلن

ہم لوگ آپ کی جھیل اسٹیخلن سے چلے آ رہے ہیں۔ غالباً اس علاقے میں

سب سے عمدہ چیز یہی ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کی برف توڑنا چاہی تھی میں نے اسی وقت ان کو منع کر دیا کیونکہ جو چیز خود کو چھپائے اس کو دیکھنے کی کوشش کرنے سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں "موجود" کا احترام کرتی ہوں اور اس کا بھی جو بن رہی ہو۔ کیونکہ جو کچھ بن رہا ہے وہ کل موجود ہوگا۔ ہمیں ہر قدیم چیز سے محبت کرنی چاہیئے لیکن ایک حد تک۔ البتہ ہر نئی چیز کے لئے زندہ رہنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں ہمیں چیزوں کے باہمی تعلق کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ یہی اسٹیخلن ہمیں سکھاتی ہے۔ دوسری چیزوں سے آنکھیں بند کرنا خود کو چہار دیواری میں منقید کرنا ہے اور چہار دیواری میں مقید ہونا موت کے مترادف ہے۔ اس چیز کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیئے۔ مجھے اپنے دیور پر پورا اعتماد ہے۔ وہ اعلیٰ سیرت کا حامل ہے لیکن مجھے نہیں معلوم کہ وہ مضبوط کردار بھی رکھتا ہے یا نہیں، وہ جذباتی ہے اور جذباتی لوگ دوسروں سے جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ وہ ذہنی طور پر دوسروں کی رائے کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ اس کو سہارے کی ضرورت ہے۔ بچپن سے اُسے آپ نے سہارا دیا۔ میں اب بھی آپ سے سہارا چاہتی ہوں۔

میری خواہش ہے کہ میں آپ کے سامنے اس بے پایاں مسرت کا اظہار کروں جو آپ کی خدمت میں مجھے میسر آئی۔ ڈیر کاونٹس!! میں اب بھی حاضر ہوں کیونکہ میرے اور آپ کے اصول ایک جیسے ہیں میں بھی اسی کا قائل ہوں کہ جب "قدیم" ناکام ہو جائے تو خود کو کاملاً "نئے" کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ دنیا میں ایسے بہت سے اچھے لوگ موجود ہیں جن کا سنجیدگی کے ساتھ یہ خیال ہے کہ روایت اور کلیسائیت کی حفاظت ہیکل سلیمانی کی طرح کرنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں ہمارے اعلیٰ حلقوں میں ایک رجحان یہ بھی پایا جاتا ہے کہ جو چیز بھی پروشیا سے تعلق رکھتی ہو وہ کلچر کی اعلیٰ شکل ہے!"

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں کہ کیا یہ رجحان اپنی جگہ حقیقت سے قریب تر نہیں ہے۔؟"

"پہلے تو یہ تھا لیکن اب صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ آج جدید اور قدیم کے درمیان تضاد کا یہ عالم ہے کہ ہر آدمی اپنے پیدائشی منصب سے ہٹا ہوا ہے۔ ہر شخص کو اپنی صلاحیتیں استعمال کرنے کی آزادی ہے۔ پرانے زمانے میں ایک جُلاہا تین سو سال تک جُلاہا ہی رہتا تھا لیکن آج ایک جُلاہا کسی روز جاگیردار بن سکتا ہے۔

میلوسن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ ہاں اور اس کا اُلٹ بھی صحیح ہے لیکن ہمیں اِن نازک باتوں سے گریز کرنا چاہیئے۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ زندگی اور سماج کی اقدار کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے۔؟ جن کی قبولیت عامہ کے بارے میں تم کو خود یقین نہیں ہے۔

" کاملاً شبہ ہی نہیں ہے " البتہ یہ سب اوسط درجے کی اہمیت رکھتی ہیں انھیں ہمیشگی عطا کرنا میرے نزدیک گناہ ہے۔ اگر ماضی پر نظر ڈالی جائے تو تین ادوار نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلا اور عظیم ترین دَور سپاہی بادشاہ کا دَور تھا۔ اس نے نہ صرف اپنی سلطنت کو مضبوط کیا تھا بلکہ اس نے ایک نئے دور کی بُنیاد بھی ڈالی تھی۔ ملک سے بدنظمی، نوکرشاہی اور ظلم کو نظم و ضبط اور انصاف میں بدل کر رکھدیا تھا۔ اس سپاہی بادشاہ کی بھی بعد میں تعریف نہیں کی جاتی۔

" اور پھر ؟ "

" پھر اس کے بعد دوسرا دَور آیا اور بہت جلد آیا جبکہ ملک میں عقل و دانش کے چراغ جل اٹھے۔

" اس پر تو بڑا تعجب ہوا ہوگا ؟

" ہاں یقیناً۔ ! لیکن بیرونی دنیا میں زیادہ ہوا۔ اس کے بعد تیسرا دور آیا جو بجائے خود عظیم تو نہ تھا البتہ اپنے جلو میں عظمت لئے ہوئے تھا۔ یہ وہ دَور تھا جب بدقسمت، غریب اور مصیبت زدہ ملک ذہانت کھو چکا تھا لیکن اب اس کی عظمت کا راز اس کا جوش و جذبہ۔ روح کی اعلیٰ قوتوں پر ایمان اور علم د

آزادی پر یقین تھا۔

"بہت خوب۔ لورینزن! ہاں اس کے بعد۔

"جو کچھ میں نے ابھی عرض کیا ہے وہ ایک صدی میں محصور ہے۔ اس وقت ہم لوگ اگر دماغی طور پر نہیں تو اخلاقی طور پر یقیناً دنیا سے آگے تھے لیکن اب وہ جوش و جذبہ سرد پڑ چکا ہے۔ ایک رجعت پسند تحریک شروع ہو چکی ہے اب وہ چیزیں دوبارہ ترقی کریں گی جو عرصہ ہوا تتر بتر ہو چکی ہیں۔ قدیم چیزیں واپس تو آتی ہیں مگر ان کی واپسی میں ہزاروں سال کا وقفہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دور واپس آسکتے ہیں چیزیں واپس نہیں آتیں۔ کسی زمانے میں جس چیز کو ترقی مانا جاتا تھا آج وہی تنزل ہے۔ تاریخ جدید میں جنگوں اور فوجوں کا حال غائب ہوتا جا رہا ہے حالانکہ حقیقتاً ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اب دلچسپیاں محققین اور موجدین میں زیادہ ہو گئی ہیں۔ ڈوگنگلن اور بابارڈ سے زیادہ اہمیت جمیں واٹ اور سائمنز کو دی جاتی ہے۔ ہیرو پرستی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اور خیال ہے کہ ابھی کافی عرصہ چلتی رہے گی لیکن اب اس کا راستہ نقطۂ عروج سے گزر چکا ہے۔ ہماری حکومت اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بجائے گری ہوئی دیوار کو سہارا دینے کی کوشش کر رہی ہے۔

"آپ نے جو کچھ کہا وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ تو بتائیے کہ اس کا رخ کس کی طرف ہے؟ "حکومت" سے آپ کی کیا مراد ہے؟ انسان یا مادہ؟ آپ کی مراد مشین سے ہے یا مشین چلانے والے سے؟ یا غالباً ان لوگوں سے جو مشین چلانے والے ہاتھوں کو کام پر لگاتے ہیں۔ آپ کی ہر بات میں مخالفانہ نوٹ ضرور ہوتا ہے۔ کیا آپ امرا کے خلاف ہیں؟ کیا آپ پرانے گھرانوں کو ناپسند کرتے ہیں۔

"نہیں۔ میں تو پرانے گھرانوں سے محبت کرتی ہوں۔ میں ہی کیا ہر شخص ان سے محبت کرتا ہے لیکن وہ ان ہمدردیوں کو خود ہی ضائع کر دیتے ہیں۔ ہمارے تمام

پُرانے گھرانوں میں یہ خیال عام ہے کہ زندگی اُن کے بغیر چل ہی نہیں سکتی۔ یہ بات حقیقت سے قطعاً بعید ہے۔ زندگی ان کے بغیر بھی چل سکتی ہے۔ اب ان کی حیثیت ستونوں کی سی نہیں ہے بلکہ پتھروں کی چھت کی سی ہے جس پر کائی جمی ہو اور جو اپنے وزن سے ستونوں کو دبائے ہے لیکن ناموافق موسم کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے کبھی دوبارہ جاگیردارانہ نظام واپس آجائے لیکن آج ہم جمہوری فلسفے کا دَور دورہ دیکھ رہے ہیں۔ ایک نئے دَور کی آمد آمد ہے جو بہتر بھی ہوگا اور مسرت آگیں بھی۔ اور اگر بالفرض خوشیاں نہ بھی لایا تب بھی ایسا ضرور ہوگا جس میں ہم کھُل کر سانس لے سکیں۔ جتنی آزادی سے آپ سانس لیں گے اتنی ہی آپ میں زندگی پیدا ہوگی۔ بہرکیف جہاں تک دولڈیمار کا تعلق ہے آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہیں۔ درحقیقت اصل مسئلہ کونٹسا کا ہے، آپ کو اس کی ضمانت دینی پڑے گی۔ کیونکہ بہرحال عورت ہی ہر چیز کا فیصلہ کرتی ہے۔

"کہا تو یہی جاتا ہے اور ہم لوگ ان باتوں میں آبھی جاتے ہیں۔ لیکن اس بات سے گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ فی الحال اس سلسلے کو ملتوی کریں کیونکہ کافی انقلابی گفتگو ہو چکی ہے اب کسی پُرسکون جگہ چلا جائے میں نے بڑے میاں سے صرف آدھ گھنٹے کی رخصت لی ہے مجھے امید ہے کہ تم میرے عجائب گھر تک ضرور چلوگے جو ہمارے پروگرام میں شامل ہے اس کے بعد کم ازکم میری کوٹھی تک چلنا ہے۔

"طلوعِ آفتاب سے پہلے"

"طلوع آفتاب سے پہلے" گرہارٹ ہاپٹمین (GERHART HAUPTMANN) کا مطالعۂ فطرت پر مبنی پہلا ڈرامہ ہے۔ اس پر فونٹین نے نہایت شاندار الفاظ میں تبصرہ کیا ہے فونٹین خود بھی فطرت پرستی کا قائل تھا اور اس لئے ہاپٹمین کو اس نئی تحریک کا جائز نمائندہ اور ایک باکمال حقیقت پسند سمجھتا تھا لیکن

اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایسی حقیقت پسندی سے گریز کرتا تھا جو کہیں کہیں فلسفے اور رُومان کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگے۔ فونٹین نے ناول اور اسٹیج ڈرامے میں حقیقت پسندی کے امکانات کا فرق نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے اس کا احساس بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ فطرت پرستانہ ڈرامے میں بھی فنکاری کا بھرپُور مظاہرہ ہونا چاہیئے۔ فونٹین کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔

تنقید کرنا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا اور کبھی کبھی تو یہ کام بڑا مشکل ہو جاتا ہے ایسا ہی کچھ کل میرے ساتھ پیش آیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ صرف وہ شخص جس میں اتنی جرات ہے کہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بغیر کسی رو رعایت کے کر دے یا وہ شخص جو تعریف میں آسمان کے قلابے ملا دے ہاپٹمین کے اس سماجی ڈرامے میں اپنا دماغ پچی نہیں کرے گا لیکن اگر کسی میں اتنی جرات نہیں ہے اور وہ ہر نئے منظر پر نت نئے سوالوں کو سوچتا ہے اور سوچ کر رہ جاتا ہے اس کے لئے کچھ لکھنا انتہائی مشکل کام ہے۔

کوئی دو مہینے ہوئے مجھے یہ ڈرامہ ملا تھا۔ اس وقت تک گرہارٹ ہاپٹمین سے واقف نہ تھا۔ کتاب دیکھی۔ عنوان تھا "طلوعِ آفتاب سے پہلے"۔ ایک سماجی ڈرامہ یہ چھوٹی سی کتاب ایک ہفتے تک میز پر کاغذوں کے انبار کے نیچے دبی رہی جب کاغذوں کی الٹ پلٹ میں وہ اوپر آئی تو میں نے اُسے فوراً اٹھالیا اور وہیں بیٹھے بیٹھے شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ عجیب خوفناک کہانی لکھی گئی تھی۔ کہانی ایک ایسے گاؤں سے متعلق تھی جہاں زمیندار اور کسان راتوں رات امیر بن گئے تھے۔ گاؤں کا نام سلیسین تھا جو "جادر" کے نزدیک آباد تھا اس میں ایک مکان تھا جس کی دیواروں پر خوبصورت ڈیزائنوں اور تصویروں کے کاغذ چپکے ہوئے تھے۔ ٹیلی فون اور بجلی کی گھنٹی بھی تھی۔ ایک نوکر ایڈورڈ بھی تھا جو برلن سے آیا تھا۔ غرض گھر ہر طرح مزین تھا لیکن پھر بھی ڈراؤنا تھا۔ اس کے ہر کونے میں ایک بھُوت آباد تھا۔

بوڑھا کاشتکار کراز بڑا عادی شرابی تھا اور زیادہ تر شراب خانے میں پڑا رہتا تھا۔ اس کی دوسری بیوی جوان تھی اور اس کی حیثیت باعزت خاتون کی سی تھی۔ اس کی پہلی بیوی سے ایک لڑکی تھی جس کی شادی ایک انجنیئر ہافمین سے ہوئی تھی۔ اس لڑکی کو بھی شراب کی لت تھی۔ ہافمین بھی بڑا عیاش اور خواہشات نفسانی کا غلام تھا۔ اس کے زیر اثر اور ماتحتوں میں سبھی اس کی عیاشی کے شکار ہو سکتے تھے۔ اس خاندان کی مکمل تصویر سامنے آنے سے پہلے ایک اور کردار سامنے آتا ہے وہ الفرڈ لوتھ جو ہافمین کا بچپن کا دوست ہے اور اس کے ساتھ پڑھ بھی چکا ہے وہ ایک عینیت پسند سیاستداں اور جمہوری اور سماجی تصورات کا حامل ہے۔ اس کا ذریعۂ معاش تصنیف و تالیف ہے۔ بحیثیت انسان وہ بہت خوش اخلاق، ذی فہم، قابلِ اعتماد، دیانتدار اور اصول پرست ہے۔

وہ شراب نوشی کو اصولاً سب سے زیادہ بُرا جانتا ہے اور اپنی قوتِ بازو پر اعتماد کرتے ہوئے دنیا کو جنت بنانے کا خواہاں ہے تاکہ بنی نوع انسان اچھی اور کامیاب زندگی گزار سکے۔ وہ اس گاؤں میں کوئلہ کی کان کے مزدوروں کے مسائل کا جائزہ لینے آیا ہوا ہے۔ یہاں پہنچکر اس نے اسی گھر میں قیام کیا لیکن یہاں وہ چھوٹی لڑکی ہیلین کے تیر نظر کا شکار ہو گیا۔ ہیلن طبعاً اپنے گھر والوں سے بالکل مختلف تھی اور مرحوم ماں کی وصیت کے مطابق اس نے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اس نے الفرڈ کی صورت میں اپنے تصور کا انسان پالیا۔ وہ بہت خوش تھی کہ اب اُسے اپنے گھر کے گھناؤنے ماحول سے نجات مل جائے گی۔ حُسنِ اتفاق کہئے یا سوئے اتفاق کہ اسی دوران اس گھر میں گاؤں کا ڈاکٹر وارد ہوتا ہے اس کا نام ڈاکٹر شیملفنگ (DR. SCHIMMEL PFENNIG) ہے یہ بھی الفرڈ لوتھ کا بچپن کا دوست تھا۔ ان دونوں کی ملاقات بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔

ڈاکٹر نے الفرڈ کو ایک تصویر دکھائی جس میں کراز اور اس کے اہلِ خاندان مٹھے ہیں۔ الفرڈ تصویر دیکھ کر بھونچکا سا رہ گیا اور اُس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اپنی محبت کو اصولوں پر قربان کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ ہیلن کے نام ایک پرچہ چھوڑ کر چلا گیا۔ چند منٹ بعد جب ہیلن آئی تو اس نے الفرڈ کو تلاش کیا وہ بھلا کیا ملتا۔ البتہ اس کا پرچہ مل گیا۔ پرچہ پڑھتے ہی وہ دیوانہ وار دوسرے کمرے میں ایک چاقو لے کر گھس گئی۔ اس کے فوراً بعد ایک ملازمہ ہیلن کی تلاش میں اس کمرے میں داخل ہوئی لیکن چیخ مار کر باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر میں سارے مکان میں "خون خون" کی آوازیں گونجنے لگیں۔

یہ ہے پورے ڈرامے کا خاکہ جسے میں نے حتی المقدور اپنے الفاظ میں منتقل کیا ہے۔ کسی بھی تخلیق کو من وعن دوسرے الفاظ میں ادا نہیں کیا جا سکتا اور کبھی کبھی تو ایسا کرنے سے تخلیق کا خون ہو جاتا ہے۔ بہرکیف کسی بھی فن پارے میں اصل چیز لب و لہجہ ہے جو صداقت یا عدم صداقت کا عکس ہوتا ہے۔ اگر لب و لہجہ زور دار ہے تو مضمون اور بیان کی خامیاں پسِ پشت پڑ جاتی ہیں اور فن پارہ موثر ہو جاتا ہے لیکن لب و لہجہ میں زور و اثر حقیقت نگاری سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر شاعر اپنی منظوم داستان کو موثر بنانے میں ناکام رہ جائے تو اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے اظہار میں خلوص نہیں تھا وہ کہیں نہ کہیں جھوٹ سے کام لے رہا تھا۔ اگر ان متذکرہ وجود میں سے کوئی نہ ہو تو پھر شاعر نے تخیل کو الفاظ کا جامہ غلط وقت پہنایا ہے۔ بہرکیف گرہارٹ ہاپٹمین نے جس میدان میں قدم رکھا ہے اس میں وہ ہمیشہ زندہ رہے گا کیونکہ نہ صرف اس کا لب و لہجہ صحیح ہے بلکہ حرارت اور جرات کیساتھ فنکاری بھی برمحل ہے۔ فطرت پرستانہ داخلی حقائق کے بیان میں فنکاری تلاش کرنا حماقت ہے اس کے برخلاف اس کو تو اعلیٰ ترین فن پارہ سمجھنا چاہیئے۔ ہاپٹمین مجھے دوسرا البسن نظر آتا ہے یعنی بالکل اُس جیسا کمال انسانیت کا اعتراف مسائل

کی پیشکش کا نیاپن اور جوش، زبان کی فنکارانہ سادگی، قدرتی کردار نگاری، واقعات کا منطقی تسلسل اور غیر متعلق باتوں سے اجتناب، لیکن ابسن کی خامیاں ہاپٹمین کے ہاں نظر نہیں آتیں۔ یعنی اس کی طرح قیاس آرائی، کتابی علم پر تکیہ کسی نکتہ کو مزید نکتہ رس بنانے کی کوشش، تا وقتیکہ نکتہ خود ہی نہ اڑ جائے، عالم ابہام میں ٹامک ٹوئیاں مارنا، غیبی فیصلے اور پہیلیوں (ایسی پہیلیاں جن کا حل پہلے ہی دردِ سر بنا ہوا ہے) پر مکمل ایقان۔ وہ ایک ایسا حقیقت پسند تھا جس نے فلسفیانہ اور رومانی افکار کو قریب نہ پھٹکنے دیا۔ وہ اوّل سے آخر تک محض حقیقت پسند تھا۔

نوجوان شاعر کے بارے میں مذکورہ بالا خیالات لئے میں تھیٹر میں داخل ہوا میرے خیالات ڈرامہ دیکھنے کے بعد بھی قائم رہے لیکن ایک تاثر ضرور قائم ہوا۔ وہ یہ کہ ڈرامہ اس قدر کامیاب نہ تھا جتنا اس کا مطالعہ۔ بیشتر مناظر تو بس ایسے تھے جو کسی بھی اچھے ڈرامے میں ہو سکتے ہیں۔ لیکن ڈرامے کی بعض اہم کڑیاں ایسی تھیں جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ فن کے اعتبار سے بڑی طاقتور اور انقلابی ثابت ہوں گی وہی کوئی تاثر نہ چھوڑ سکیں۔ کہانی کے جس حصّے کا میں بڑا مداح ہوں اسی کو دیکھ کر مجھے بوریت ہوئی۔ مثال کے طور پر ایک مقام پر ایک شخص کو نشے میں دُھت دکھایا گیا ہے اور اس کے پاس کچھ اوباش لوگ بھی ہیں۔ اس منظر میں بدمعاشی اور بدظنی کے بُرے اثرات کو نمایاں کرنا چاہئے تھا جسے شاعر نے اپنے ڈرامے میں مکمل فنی شعور کے ساتھ پیش کیا ہے۔ لیکن ڈرامے کے ہدایت کار بُری طرح ناکام رہے۔ یہ منظر نہایت پھیکا تھا۔ یہ ڈرامہ دیکھنے کے بعد ایک بات پر مکمل یقین ہو گیا ہے کہ حقیقت پسندی (REALISM) خواہ کتنی ہی فنکارانہ ہو اگر اُسے کتاب سے اسٹیج پر منتقل کیا جائے تو اُسے اسٹیج کے قوانین کا پابند ہونا پڑے گا اور روزمرہ زندگی کے واقعات خواہ وہ بدنما ہوں حقیقت پسند ناول (REALISTIC NOVEL) کو سجا دیتے ہیں لیکن وہی

واقعات اسٹیج پر پھیکے نظر آتے ہیں اگر ان کی اصل قوت کا سبب نظروں سے اوجھل ہو، یا ناگوار معلوم ہوتے ہیں اگر ان کی صداقتوں کو جوں کا توں چھوڑ دیا جائے یعنی اسٹیج کا خیال نہ کیا جائے۔

ابسن کے ڈرامے پر مختلف رائیں ہو سکتی ہیں لیکن ایک بات سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا وہ ہے خود مصنف اور اس کی وضع قطع کا تاثر۔ کہاں تو داڑھی، سانولی رنگت، بھدا جسم، ڈھیلا ڈھالا کوٹ، ہیٹ اور کہاں لانبا قد، چھریرا بدن اور سیاہ بالوں والا نوجوان جس کا لباس اور عادات و اطوار سبھی خامیوں سے پاک تھے۔ اس کی حد درجے انکساری کے سامنے دشمن بھی سر نہیں اٹھا سکتے۔ فی الواقع کچھ لوگ اس کے اس کردار کو شیطانی دھوکہ قرار دے کر نئے نئے ساز و سامان کے ساتھ اس کے خلاف محاذ قائم کریں گے اور اس طبی مشیر ڈاکٹر کیسپر کی یاد تازہ کرنا پسند کریں گے جس نے طبی تجربات کے نچوڑ کو اپنی مشہور کتاب میں یکجا کیا تھا اور جس کا آغاز ان الفاظ سے کیا تھا: "میرے تمام قاتل کنواری لڑکیاں معلوم ہوتے ہیں۔"

فریڈرک نیٹشے

۱۸۴۴ - ۱۹۰۰

فریڈرک نیٹشے وہ مشہور عالم جرمن فلسفی گزرا ہے جس نے تمام عینیت پسند فلسفوں کو خیرباد کہہ کر خود اپنا فلسفۂ حیات پیش کیا جس کی بنیاد خلافِ عقل یعنی اُن "ٹھوس اور فطری" عناصر کو بنایا جو انسان کی خواہشات کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے فلسفہ میں اتنا آگے بڑھ گیا کہ بالآخر اس نے اخلاقی اقدار اور بندھنوں کی بھی نفی کرنا شروع کر دی۔ اس نے عیسائیت اور اس کے پردے میں تمام انسانیت آمیز اور معاشرتی کاوشوں کو مذموم قرار دے دیا۔

اپنے ابتدائی دور میں نیٹشے بڑا روشن خیال سماجی نقاد تھا مثلاً اس نے اپنی کتاب (THOUGHTS OUT OF SEASON) "بے موسم کے افکار" میں اپنے دور کے خلاف ہمدردانہ انداز میں تنقید کی ہے ذیل میں اسی کے پہلے مضمون (۱۸۷۳) کے ابتدائی اقتباسات دیئے جا رہے ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ فرانس فتح ہو چکا تھا اور جرمن ریخ (GERMAN REICH) کی بنیادیں استوار ہو چکی تھیں یہ جرمنی کا انتہائی شاندار دور تھا۔ ہمہ جہت ترقی ہو رہی تھی۔ صاحب ثروت لوگوں میں مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی لیکن اس فارغ البالی کے باوصف ذہنی اور ثقافتی دائرہ تنگ کو وسیع کرنے کا کسی کو ذرا بھی خیال نہ تھا۔ جھوٹی ثقافتی سرگرمیوں پر سے نیٹشے نے پردہ اٹھایا اور اپنے دور کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔

جرمنی

(۱۸۷۰ تا ۱۸۷۱)

جرمنی کی رائے عامہ جنگ کے بُرے اور خطرناک نتائج کی طرف سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہے۔ ایسی جنگ جو فتح پر منتج ہوئی۔ اس سلسلہ میں رائے عامہ

بیدار کرنے کی زیادہ تر ذمہ داری اہلِ قلم حضرات پر عائد ہوتی ہے لیکن وہ خود رائے عامہ سے متاثر ہیں اور جنگ کی تعریف اور اخلاقیات، ثقافت اور فنون پر مرتب ہونے والے اثرات کے بارے میں لکھ لکھ کر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہرکیف جتنی بڑی فتح ہوئی ہے اتنے ہی بڑے خطرات اپنے ساتھ لاتی ہے۔ فطرت انسانی شکست کو بڑی کامیابی سے برداشت کر لیتی ہے لیکن فتح کی متحمل نہیں ہو پاتی۔ فرانس کے ساتھ پچھلی جنگ کے جو بُرے نتائج سامنے آئے ہیں ان میں بدترین چیز عوام کی غلط فکر ہے۔ جرمن عوام دوسری قوموں کی طرح یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اس فتح میں ہماری ثقافت بھی ظفرمند ہوئی ہے یہ انتہائی افسوسناک خود فریبی ہے جو ہماری فتح کو شکست میں تبدیل کر سکتی ہے ایسی شکست جو "جرمن شہنشاہیت" کے فائدے کے لئے جرمنی کی روح کو ہلاک کر دے گی۔

تھوڑی دیر کے لئے بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ دو ثقافتیں باہم برسرِ پیکار تھیں اور انہیں سے ایک کو فتح ہوئی تاہم وہ فتح اضافی ہو گی اور اضافی فتح پر خوشیاں منانا مہمل سی بات ہے۔

پھر فتح و شکست دیکھتے وقت یہ بھی دیکھنا ہے کہ میدان جنگ کی فتح ثقافت کی فتح کسی صورت نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے فرانسیسی ثقافت محدود ہو لیکن محدود ہونے کے باوجود وہ زندہ رہے گی اور دونوں ثقافتیں ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتی رہیں گی۔ میدان جنگ میں نہ تو وہ ثقافت کام آئی اور نہ یہ۔ وہاں تو سخت ترین سپاہیانہ نظم و ضبط، فطری جرأت اور شجاعت، قائدین کی برتری، صفوں میں اتحاد اور فرمانبرداری ہی کام آتے ہیں۔ اگر آپ ثقافت کی فتح پر بغلیں بجاتے رہے تو یاد رکھئے آپ نہ صرف جرمنی کی روح کو ہلاک کر ڈالیں گے بلکہ کسے معلوم کہ باقی تمام نامیاتی نظم بے کار محض نہ ہو کے رہ جائے۔

اس صورت حال کے باوجود اگر جرمنوں کی بُردباری اور بلند ہمتی کو اسی طرح

استعمال کیا جائے جس طرح فرانس کی اچانک اشتعال انگیزیوں کے خلاف استعمال کیا گیا تھا تو اس غیر جرمن اور مشتبہ "اصلاح" کا استقبال کیا جا سکتا ہے جو ہماری ثقافت میں سرایت کر رہی ہے اور حقیقی جرمن تہذیب کا تحفظ ہو سکتا ہے جرمنی والوں کو بہادر اور روشن خیال قائدین اور جرنلوں کی کبھی کمی نہ رہی۔ البتہ انھیں اکثر "جرمن والوں" کی کمی کی شکایت ہوئی۔ بہر کیف جرمن بہادری کو نیا رُخ عطا کرنا میرے نزدیک روز بروز مشکوک ہوتا جا رہا ہے کیونکہ آج ہر شخص حالات سے پوری طرح مطمئن ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ثقافت کے اعلیٰ ترین بیج بو دیئے گئے یا کہیں کہیں کونپلیں بھی نکل آئی ہیں۔ یہ اطمینان جرمن اخبار نویسوں اور ادیبوں اور ناشروں میں بھی نظر آتا ہے جو کہ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ان کی سازش یہ ہے کہ جدید دور کے انسان کے خالی اوقات کو جو فی الواقع "ثقافتی لمحات" ہوتے ہیں بے دماغی میں صرف کیا جائے۔ ان کے خیال میں جنگ کے نتیجے میں جرمن ثقافت نہ صرف مستند بلکہ مقدس بھی ہو گئی ہے۔ اس لئے اہل جرمنی کے مضامین کو شاہکار بنا کر پیش کرتے ہیں اور "ادب عالیہ" سے موسوم کرتے ہیں۔

یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ کامیابی کو غلط رنگ میں استعمال کرنے سے جو خطرات ہو سکتے ہیں، انھیں تعلیم یافتہ جرمن ضرور محسوس کریں گے کیونکہ اس سے زیادہ تشویشناک بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی احمق آدمی آئینہ کے سامنے کھڑا ہو جائے اور مختلف الٹی سیدھی شکلیں بنائے اور اپنی تصویر سے مرغوں کی سی لڑائی لڑے، لیکن تعلیم یافتہ طبقہ جان بوجھ کر چشم پوشی کرتا ہے۔ اُسے اپنی ذات سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ وہ جرمن ثقافت کو اپنے دور کی سب سے کامیاب اور مکمل ثقافت سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اہل مبصر آجائے بالخصوص کوئی غیر ملکی مبصر تو وہ یہ کہے بغیر نہ رہے گا کہ جدید دور کی ثقافت کے اعلیٰ ترین معیار اور نئے جرمن کلاسکس کی ظفریاب ثقافت کے درمیان صرف مقدار کا فرق ہے جہاں کبھی علم کی اہمیت کم ہے صلاحیت کی زیادہ اور معلومات کی اہمیت کم ہے بمقابلہ فن یا مختصراً

جہاں کہیں زندگی کو ثقافت کی ضمانت سمجھا جاتا ہے وہاں ہمارے پاس صرف ایک جرمن ثقافت ہے وہی ثقافت جس نے فرانس کو فتح کیا ہے۔

یہ قطعاً مہمل دعویٰ ہے۔ تمام غیر جانبدار مبصرین اور خود فرانسیسی اس بات پر متفق ہیں کہ جرمنی کی فتح کا اصل سبب اس کے افسران کی بہتر تعلیم، سپاہیوں کی بہتر تربیت اور سائنسی خطوط پر فوجی حکمت عملی ہے۔ پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ جرمن ثقافت فتح یاب ہوئی ہے؟ نظم و ضبط اور اطاعت کا ثقافت سے کیا تعلق ہے؟ مثال کے طور پر مقدونیہ کی فوج یونانی سپاہیوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر صلاحیتیں رکھتی تھی جبکہ موخرالذکر ثقافتی اعتبار سے کہیں آگے تھے۔ جرمن ثقافت اور تعلیم کو ظفریاب سمجھنا سخت غلطی ہے کیونکہ ثقافت کے صحیح معیار جرمنی سے ناپید ہو چکے ہیں۔

ثقافت، دیگر چیزوں کے علاوہ، کسی قوم کے ہر شعبۂ زندگی کے متحدہ فنکارانہ اسلوب کو کہتے ہیں۔ اس کے لئے بہت زیادہ علم کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ علم اس کے وجود کی علامت ہوتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ دو متضاد ثقافتوں میں بھی قائم رہ سکتا ہے یعنی خواہ اسلوب نہ ہو یا بہت سے اسالیب آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہوں تب بھی علم کا وجود ہو سکتا ہے۔

آج جرمنی کی یہی حالت ہے کہ وہ مختلف اسالیب کے ہنگامے سے دوچار ہے۔ ناقابلِ فہم بات یہ ہے کہ جرمن تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود سب کچھ دیکھتے ہیں اور موجودہ ثقافت سے "لطف اندوز" ہوتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ان کے چاروں طرف جو کچھ ہے وہ آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔ اُن کے کپڑے، اُن کے کمرے، ان کے مکانات، شہر اور سڑکیں، فیشن ایبل دکانیں اور ان کی معاشرتی زندگی غرض کسی چیز کو دیکھئے سب ان کی عادات و خصائل کی اساس نظروں کے سامنے لے آتے ہیں۔ انھیں اپنی ثقافتی انجمنوں، موسیقی، تھیٹر اور فنکارانہ زندگی میں مختلف اسالیب کی لغو متوازیت اور دوہرے پن سے ہوشیار رہنا چاہیے۔

جرمن ہر دور اور پورے برّاعظم کی اشکال، رنگ، مصنوعات اور تجسس کو یکجا کرتے جاتے ہیں پھر انھیں اپنی چابکدستی سے ایسی چکا چوند کرنے والی روشنیوں سے بھرپور نمائش کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں پھر ان کے عالموں کی ذمّہ داری ہوتی ہے کہ وہ تحقیقات کریں اور جدیدیت کا نام دیں۔ اس قسم کی ثقافت اصلی ثقافت پر تہمت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ثقافت کے ذریعہ ہم دشمنوں اور خصوصاً فرانسیسیوں کو شکست نہیں دے سکتے کیونکہ ان کی ثقافت حقیقی اور مفید ہے اور جس کی نقالی ہم نے بھی کی ہے۔

اگر ہم نقالی چھوڑ دیں تب ہم کو فرانس پر فتح بلکہ فرانس سے آزادی نصیب ہو سکتی ہے۔ اب تک تو ہم ہر معاملے میں پیرس پر تکیہ کئے بیٹھے ہیں، ہمیں اپنی مرضی سے ان سب باتوں پر غور کرنا چاہیئے۔ ہم میں سے بہت سے وہ لوگ جنھیں بولنے کا حق حاصل ہے کھلم کھلا اپنے ہمعصر جرمنی والوں کو ملامت کر چکے ہیں۔ گوئٹے نے ایک مرتبہ ایکرمین سے کہا تھا "ہم جرمن لوگ کل کی قوم ہیں یہ درست ہے کہ پچھلی صدی سے ہم لوگوں نے نہایت مستعدی کے ساتھ خود کو با صلاحیت بنایا ہے لیکن ابھی اپنے ہموطنوں کے ذہن کو جلا پانے اور اعلیٰ ثقافت کے مراحل طے کرنے میں کئی صدیاں لگیں گی اور تب ہی ان کے بارے میں یہ کہا جا سکیگا کہ "ایک مدت ہوئی جب وہ وحشی قوم تھے"۔

اوٹو فان بسمارک

۱۸۱۵ — ۱۸۹۸

اوٹو فان بسمارک نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۸۴۷ء میں قدامت پرست پارٹی کے ڈپٹی کی حیثیت سے کیا تھا۔ ۱۸۶۲ء میں انھیں پروشیا کا وزیر اعظم نامزد کر دیا گیا چار سال بعد ان کی زیرِ قیادت آسٹریا کے خلاف کامیاب جنگ لڑی گئی اور اس طرح آسٹریا جرمن ریاست پروشیا سے دستبردار ہو گیا اور جرمنی کی تمام ریاستیں متحد ہو کر ایک سلطنت بن گئیں بسمارک اس کے چانسلر بنے اور ۱۸۹۰ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ بسمارک کی خارجہ پالیسی دو طرفہ معاہدۂ امن کی بنیاد پر تھی لیکن داخلی پالیسی قدامت پرستی پر مبنی تھی ۱۸۸۳ء سے ۱۸۸۹ء تک انھوں نے ایک نئے سماجی آئینی نظام کو ترقی دی اور سوشل ڈیموکریٹک نامی سیاسی تحریک کو کچلنے کے لئے ضروری اختیارات حکومت کے پاس رکھے۔ اس طرح محنت کش طبقہ امورِ مملکت سے الگ رہا اور مارکسی نظریات کے داخلے کے لئے میدان ہموار ہوتا رہا۔

بسمارک نے دسمبر ۱۸۴۶ء میں ہرفان پٹکیمر کے نام ایک خط میں اس کے مضمون کو "دل کی آواز اور بالخصوص مسیحیت کی طرف اپنے رویے" سے تعبیر کیا ہے۔ بسمارک نوجوانی میں روایتی مذہبی مزاج سے گریز کرنے لگا تھا اور آزاد خیالی پسند کرتے تھے لیکن بعض باعمل خدارسیدہ بزرگوں کی قربت سے اُن کے عقیدے میں پختگی پیدا ہو گئی تھی۔

ہرفان پٹکیمر کے نام ایک خط

اواخر دسمبر ۱۸۴۶ء

مائی ڈیر ہرفان پٹکیمر

میں اس خط کے شروع ہی میں نفسِ مضمون کی طرف اشارہ کر رہا ہوں اور وہ

یہ ہے کہ میں آپ سے ایک عظیم ترین تحفے کا خواستگار ہوں ـــــ وہ تحفہ ہے آپ کی صاحبزادی کا ہاتھ ۔!

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑی بدتمیزی ہے کہ چند ملاقاتوں کے بعد ہی اعتماد کا اتنا بڑا ثبوت طلب کر دوں تاہم خواہ آپ وقت اور فاصلے کی رکاوٹوں کے سبب میرے بارے میں رائے قائم کرنے سے گریز کریں میں اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی ضمانت نہیں دے سکتا۔ اگر آپ کا خدا پر ایمان ہے تو انسان پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس سلسلے میں جو کچھ میں مدد کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں نہایت خلوص کے ساتھ اپنا ذاتی حال خطِ تحریر میں لے آؤں۔ رہ گیا خارجی سیرت و کردار کا معاملہ تو یہ آپ پوچھ گچھ کے ذریعہ معلوم کر سکتے ہیں، اس لئے سطور ذیل میں میں داخلی زندگی پر روشنی ڈالوں گا جو خارجی زندگی کی بنیاد بھی ہے اور مسیحیت کے بارے میں میرے روّیے کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔

اس سلسلے میں اپنی پچھلی زندگی بیان کرتا ہوں۔ میں بچپن سے ہی اپنے والدین سے الگ رہا۔ پھر جب ذرا ہوشیار ہوا تب ان کی قربت میسر آنے کے باوجود کچھ سکون نہ ملا۔ انھوں نے مجھے تعلیم اس نقطۂ نظر کے تحت دلوائی کہ ذہنی ترقی اور جلد حاصل کردہ علم ہر چیز کو اپنے تابع کر لیتا ہے۔ دینیات کی تعلیم سے اغماض برتا غرض جب پڑھ کر فارغ ہوا تو وحی کا منکر اور وحدت الوجود کا قائل ہو کر نکلا۔ رات کی عبادت بھی سوچ سمجھ کر ترک کر دی کیونکہ میرے خیال میں عبادت مشیت الٰہی کی مخالفت کے برابر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خدا ہر فعل کا ذمہ دار ہے اس طرح عبادت بھی وہ خود ہی کرواتا ہے۔

ابھی سترہ سال کا نہ ہوا تھا کہ میں گاٹنجن یونیورسٹی میں داخل ہو گیا اور اس کے بعد آٹھ سال تک شاذ ہی اپنے گھر گیا۔ میرے والد نے کبھی مجھ سے باز پرس نہ کی البتہ والدہ صاحبہ نے اکثر تعلیم میں خرابی پر مجھے سخت سست کہا۔ غالباً وہ سمجھتی ہوں گی کہ تعلیم کے علاوہ میری رہنمائی غیب سے ہو گی۔ اس طویل عرصے

دریں اثنا میں کچھ ایسی باتوں سے بھی متاثر ہوا جن کا مجھ سے براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا اور جو یہاں تحریر بھی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ دوسروں کے راز ہیں۔ ان واقعات کا مجھ پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ میں اپنی زندگی کے رُخ کی بے وقعتی کو بھانپ گیا۔ دوستوں کے مشورے اور خود اپنی خواہش کے احترام میں مَیں نے انجیل کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا اور کچھ عرصے کے لئے اپنے فیصلوں کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اسی دوران میرے دل میں جو ہلچل مچی ہوئی تھی وہ ایک دم ساکن ہو گئی مجھے اچانک اطلاع ملی کہ میرا دوست کارڈیمن سخت بیمار ہے۔ میرے ہاتھ خود بخود دعا کے لئے اُٹھ گئے اس وقت میں نے دعا کی مقبولیت کے بارے میں ذرا بھی غور نہ کیا۔ دوست جانبر نہ ہو سکا۔ میری دعا یقیناً قبول نہ ہو سکی لیکن یہ جذبہ ضرور بیدار ہو گیا کہ مشکل کے وقت باری تعالیٰ سے رحم کی درخواست کرنی چاہیئے۔ اب میں نہ صرف مطمئن زندگی گزار رہا ہوں بلکہ عزم اور اعتماد بھی اپنے اندر پاتا ہوں۔

میرے دل میں یہ تبدیلی کوئی دو ماہ سے آئی ہے جس کا اظہار میں نے پورے خلوص کے ساتھ کر دیا ہے۔ اور اس یقین کے ساتھ کیا ہے کہ خدا مخلص کو کامیابی عطا کرے گا۔

میں آپ کی صاحبزادی کے بارے میں اپنے جذبات کے اظہار سے گریز کر رہا ہوں کیونکہ جو قدم میں نے اٹھایا ہے وہ الفاظ سے زیادہ واضح ہے۔ میں مستقبل کے بارے میں بھی کوئی وعدہ نہیں کر سکتا کیونکہ آپ انسان کی تلوّن مزاجی کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ البتہ میں اتنی ضمانت دے سکتا ہوں کہ میں پروردگار سے آپ کی صاحبزادی کی عافیت کے لئے ہمیشہ دعاگو رہوں گا۔ گذشتہ واقعات کے بارے میں اتنا عرض کرنا کافی سمجھتا ہوں کہ اس سال موسم گرما کے سمندری سفر کے بعد کارڈیمن میں کئی بار مس جوحنا (JOHANNA) سے ملاقات ہوئی ان کو دیکھنے کے بعد مجھے صرف یہی فکر تھی کہ کیا میری خواہش کی تکمیل آپ کی صاحبزادی کی مسرت و اطمینان کا

باعث ہوگی اور میرے اس مفروضے میں کہ وہ مجھ میں اپنے شوہر کی تمام خصوصیات پالینگی، کیا میری استعداد سے زیادہ خود اعتمادی کو دخل ہے؟ بفضلِ خدا آج میں آپ سے اپنے فیصلے کے بارے میں اظہار کی جرأت پا رہا ہوں۔ اس سے قبل زرمبا ئن میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی لیکن میں زبان سے اتنی بات نہیں کرسکتا تھا جتنی تحریر میں کرلی۔ معاملے کی نزاکت کے بارے اور یہ سوچ کر کہ آپ کی صاحبزادی کو آپ لوگوں سے جدا ہونا پڑے گا میں اس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ آپ کا جواب غیر مشروط نہ ہوگا۔ میری آپ سے صرف یہ استدعا ہے کہ نفی میں جواب دینے سے پہلے مجھ سے تبادلۂ خیال ضرور کرلیجیے گا اور مجھے اس حق سے محروم نہ کیجیے گا۔ اس وقت میں نے اپنے بارے میں بہت سی باتیں نہیں لکھی ہیں لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ ملاقات پر ہر سوال کا صحیح صحیح جواب دے دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے سب سے زیادہ اہم بات لکھدی ہے۔ اپنی اہلیہ کو میرا اسلام کہیے اور ہمیشہ ادب و احترام کی پیشکش قبول کیجیے۔

"بسمارک"
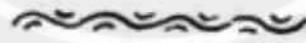
میکس ویبر

(۱۸۶۴ تا ۱۹۲۰)

ماہر عمرانیات میکس ویبر نے اپنے مطالعے کا آغاز کارل مارکس کے عمرانی اصولوں سے کیا تھا لیکن بذات خود ان سے تھوڑا اختلاف کیا۔ اس نے مارکس کی طرح تاریخ کی سپاٹ اور ایک جیسی توضیح نہیں کی بلکہ اس نے تاریخی اور عمرانی عمل میں روحانی اور مادی قوتوں کے باہمی تعلق کا اثر دیکھا اور اسی تجربہ کی بنیاد پر تحقیقی کام شروع کیا۔ اس کی کتاب "دی ووکیشن ٹو پالیٹکس" سنہ ۱۹۱۹ء میں لکھی گئی اس لئے اس میں پہلی جنگِ عظیم کے تجربات شامل ہیں۔ ذیل کی سطور میں میکس ویبر نے سیاسیات میں اخلاقی اصول وضوابط پر زور دیا ہے جس کا اس کے دور میں فقدان پایا جاتا تھا۔ اس نے زندگی کے حقائق سے چشم پوشی کئے بغیر سیاست کے مقاصد اور امکانات کو تفصیل سے سمجھایا ہے۔

سیاست، ایک پیشہ

داخلی مسرتوں کے حصول کے لئے سیاست بطور پیشہ کیا کچھ کر سکتی ہے اور اس کو اپنانے والوں سے کس قسم کی خصوصیات کی طلبگار ہے۔؟ اس سوال کے پہلے حصے کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیاست اقتدار کا احساس عطا کرتی ہے۔ پیشہ ور سیاستدان خواہ کسی عہدہ پر فائز نہ ہوں تب بھی عوام پر اپنے اثرات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وہی تاریخ ساز شخصیات ہیں۔ اب سوال کا دوسرا حصہ سامنے آتا ہے یعنی سیاستدانوں میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں تاکہ وہ اقتدار کے اہل ثابت ہو سکیں۔ یہاں پر اخلاقیات کی بات چل نکلتی ہے۔

ایک سیاستداں میں تین خصوصیات بہرحال ہونی چاہئیں۔ اوّل جذبہ دوم ذمہ داری کا احساس اور سوم قوتِ فیصلہ۔ جذبے سے مراد کسی مقصد کے لئے دل وجان

سے لگ جانا۔ جذبے سے بے فیض جوش و خروش کے معنے نہیں لینے چاہئیں۔ جیسا کہ روسی دانشور لفظ "انقلاب" سے لیتے ہیں۔ صرف جذبہ اپنی جگہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ایک سیاستداں میں یہ صلاحیت بھی ہونی چاہیئے کہ اس جذبے سے کام لیتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو۔ اس مقصد کے لئے اس میں قوت فیصلہ لازماً ہونا چاہیئے۔ یعنی حقائق کو اس کی اصل شکل میں دیکھ کر کوئی فیصلہ کرنا چاہیئے۔ جذبات اور ٹھنڈے دل و دماغ سے کوئی فیصلہ، یہ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ پالیسی دماغ سے بنائی جاتی ہے، جسم کے کسی دوسرے حصے سے نہیں بنائی جاتی۔ سیاست کو اگر پورے خلوص کے ساتھ برتا جائے تو اس کی نشو و نما صرف جذبات سے ہو سکتی ہے۔ ایک سیاستداں کو روح پر مکمل گرفت رکھنا چاہیئے۔ اور یہ جبھی ہو سکتا ہے جب کہ وہ "فاصلے" کا عادی ہو۔ یعنی کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے دنیا کی تمام اشیاء کو فاصلے پر رکھے۔ ایک سیاسی شخصیت میں مذکورہ بالا تمام خصوصیات بدرجۂ اتم ہونا چاہئیں۔

انہی خصوصیات کی وجہ سے ایک سیاستداں دوسرے کو شکست دیتا رہتا ہے۔ غرور بھی تمام "فاصلوں" اور ذوقِ سیاست کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس معاملہ میں فاصلے کا مطلب اپنی انا سے فاصلہ رکھنا ہے۔

غرور ایک ایسی بیماری ہے جو قریب قریب ہر کسی کو لگی ہوئی ہے۔ علم کے حصول میں یہ بیماری نقصان نہیں پہنچاتی لیکن سیاست میں سخت نقصان رساں ہے۔ ظاہر ہے انسان اقتدار کی خواہش میں سیاست کا راستہ اختیار کرتا ہے اور یہ خواہش کم و بیش سبھی انسانوں میں ہوتی ہے اس لئے یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ گناہ اس وقت شروع ہوتا ہے جبکہ ہوس اقتدار موضوعی شکل اختیار کر لیتی ہے یعنی سیاستداں مقصد کو چھوڑ کر محض نشۂ اقتدار میں آگے بڑھتا ہے سیاست کے میدان میں صرف دو باتیں گناہِ عظیم تصور کی جاتی ہیں ایک موضوعیت دوسرے

غیر ذمہ داری۔ ایک سیاستداں کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جلد از جلد شہرت کے آسمان پر پہنچ جائے اور اسی خواہش کے تحت وہ مذکورہ دو گناہوں میں سے کسی ایک یا دونوں کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ جذباتی تقریریں کرنے والا سیاستداں اور بھی جلد گمراہ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ تاثرات دیکھا کرتا ہے۔ اُسے یہ پروا نہیں رہتی کہ لوگ اس کو اداکار سمجھ رہے ہیں۔ اس کی موضوعیت اسے جھوٹے اقتدار کے چکر میں ڈال دیتی ہے دوسری طرف غیر ذمہ داری کا تقاضا برائے اقتدار عطا کرتی ہے جس سے کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوتا۔ جو سیاستداں محض اقتدار کی خاطر جدوجہد کرتا ہے اس کی قوت بظاہر زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا کام فی الواقع بالکل بے نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ داخلی طور پر بہت کمزور ہوتا ہے اور اپنے کھوکھلے پن کو چھپانے کے لئے نمود و نمائش سے کام لیتا ہے دراصل یہ رویہ انسانی افعال کی ماہیت سے چشم پوشی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کوئی بھی سیاسی عمل بالآخر جس نتیجہ پر پہنچتا ہے اس کا بنیادی منشا سے یا تو کم تعلق ہوتا ہے یا اکثر مہمل سا ربط معلوم ہوتا ہے۔

اس منشا کی تکمیل کے لئے اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد میں کمی اسی وقت آسکتی ہے جب آپ کا قلب آپ کے افعال کی گواہی نہ دے۔ ایک سیاستداں کے مقصد کی نوعیت اس کے اپنے ایمان پر منحصر ہوتی ہے۔ اس کا مقصد قومی بھی ہو سکتا ہے اور انسانی بھی، سماجی بھی ہو سکتا ہے اور اخلاقی بھی، ثقافتی بھی ہو سکتا ہے اور روحانی اور مذہبی بھی۔ وہ اپنے عقیدے میں ترقی پسند بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کسی نظریے کا علمبردار بھی ہو سکتا ہے یا اس کی اصولی مخالفت کرکے روزمرہ زندگی کے خارجی مقاصد حاصل کرنے کی سعی کر سکتا ہے۔ بہرکیف اس کا کسی نہ کسی بات پر ایمان و ایقان ہونا چاہیئے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو بڑی سے بڑی سیاسی کامیابی بھی انسان کی خطاپذیری اور بے اثری

کا شکار ہو جاتی ہے۔

یہاں پر ایک فیصلہ کن حقیقت سامنے آتی ہے ہمیں یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ ایسے تمام افعال جو اخلاقی پس منظر رکھتے ہیں ان کی اساس مختلف النوع اور کبھی کبھی یکجا نہ ہونے والی صداقتوں پر ہے۔ ایک کا پس منظر مطلق قدر و قیمت کی اخلاقیات اور دوسری کا ذمہ دارانہ اخلاقیات۔ مطلق قدر و قیمت کی اخلاقیات کا مطلب غیر ذمہ دارانہ اخلاقیات ہرگز نہیں ہے اور ذمہ دارانہ اخلاقیات کا مطلب کردار سے عاری ہونا نہیں ہے۔ البتہ دونوں کے عملی رویے میں بنیادی فرق ہے۔ یعنی مطلق قدر و قیمت کی اخلاقیات پر عمل کرنے والا، مثال کے طور پر ایک عیسائی، نیکی کر کے انجام خدا پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے برخلاف ذمہ دارانہ اخلاقیات پر عمل کرنے والا اپنے عمل کے انجام کی ذمہ داری خود ہی قبول کرتا ہے۔ آپ کسی ٹریڈ یونین والے کو جو مطلق قدر و قیمت کی اخلاقیات پر ایمان رکھتا ہے، کتنا ہی سمجھائیں کہ آپ کے رویئے سے آپ کے مقصد کو نقصان پہنچے گا اور مظلوم محنت کشوں کو مزید کچلا جائے گا، وہ آپ کی ایک نہ سنے گا۔ اگر اس کے عمل کا نتیجہ خراب نکلتا ہے تو وہ کسی فردِ واحد کو ذمہ دار قرار دینے کے بجائے ساری دنیا کو برا کہے گا یا خدا کی مرضی سمجھ کر چپ ہو رہے گا۔ اس کے برخلاف ذمہ دارانہ اخلاقیات پر عمل کرنے والا انسانی عیاریوں کو دوش دے گا۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کو دوسرے کے سر نہیں ڈالتا وہ یہی کہتا رہے گا کہ یہ میرے اپنے رویئے کا نتیجہ ہے۔ مطلق قدر و قیمت کی اخلاقیات کا ماننے والا بس اتنی ذمہ داری قبول کرتا ہے کہ اپنے عقیدے کی مشعل کو جلائے رکھے اور سماجی ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔

جو لوگ روحانی ترقی چاہتے ہیں وہ سیاست کا راستہ اختیار نہیں کرتے کیونکہ سیاسی معاملات اکثر طاقت کے ذریعے سے طے ہوتے ہیں۔ سیاست کی امن کے دیوتا اور مسیحی خدا سے ہمیشہ کشمکش رہی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے اتنے دور ہیں کہ انمیں کبھی ملاپ نہیں ہو سکتا۔ کلیسائی حکومتوں کے دور میں

بھی ہر شخص یہ بات جانتا تھا۔ لوگ کلیسائی حکومت سے لڑا کرتے تھے۔ انہی حالات کے بارے میں میکاولی نے فلورنٹائن اسٹوریز میں ایک جگہ ایک ہیرو سے ان شہریوں کی تعریف کروائی ہے جو اپنی روحانی ترقی سے زیادہ وطن کی بہبود کو اہمیت دیتے ہیں۔

آج وطنیت کی جگہ اشتراکیت یا بین الاقوامی تشفی نے لے لی ہے۔ یہ بھی ایک سیاسی عمل ہے جو تشدّد کے ذریعہ وقوع پذیر ہوتا ہے اور اس طرح ذمہ دارانہ اخلاقیات کی روح کو کچل دیتا ہے۔ اس کے برخلاف مطلق قدر و قیمت کی اخلاقیات پر عمل کرکے اس تصوّر کو حاصل کیا جائے تو چونکہ نتائج کی ذمہ داری کوئی نہیں لیتا اس لئے یہ مقصد نسلوں میں بھی حاصل نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر عمل کرنے والا شیطانی قوتوں سے آگاہ نہیں ہوتا۔ شیطانی قوتیں بے رحم ہوتی ہیں اور انسان کے قلب و روح کو شکار بنا لیتی ہیں۔ شیطان عمر رسیدہ ہے اس کو سمجھنے کے لئے آپ کو بھی سن تمیز کو پہنچنا ہوگا۔ بہرحال میں عمر رسیدگی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ فرض کیجئے میری عمر پچاس سال ہے اور کسی کی عمر ۲۰ سال ہے تو یہ ضروری نہیں کہ میں قابل احترام ہوگیا۔ عمر اصل چیز نہیں ہے اصل چیز وہ تعلیم ہے جو زندگی کے ٹھوس حقائق کو سمجھنے میں مدد دے اور انھیں برداشت کرنے کی صلاحیت دے تاکہ داخلی اور خارجی ارتقاء ایک ساتھ ممکن ہو سکے۔

یہ صحیح ہے کہ پالیسی دماغ سے بنتی ہے لیکن محض دماغ ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اس مسئلے میں مطلق قدر و قیمت کی اخلاقیات رکھنے والے حق پر ہیں۔ بہر کیف اس موقع پر ایک بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر آج کے دور میں جو بے فیض جوش و خروش کا زمانہ ہے، مطلق قدر کے سیاستداں اچانک ہر سمت میں چھا جائیں اور اپنا یہ مسلک ورد زبان رکھیں "دنیا احمق اور بدطنیت ہے میں خود اچھا ہوں نتائج کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ان پر ہے جن کی خدمت کر رہا ہوں اور جن کی حماقت اور بدمعاشیوں کو میں ختم کر رہا ہوں" تو میں سب سے پہلے دعویدار

کے داخلی وزن کا تخمینہ لگاؤں گا۔ میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ اس میں سے نو مثالیں ایسی ملتی ہیں جہاں لوگ حقیقت کے خلاف بات کرتے ہیں اور جنھیں رومانوی سنسنی خیزی زیادہ ہوتی ہے ان باتوں کا مجھ پر شاذ ہی اثر ہوتا ہے۔ہاں ان میں سمجھدار لوگوں پر یقیناً اثر ہوتا ہے جو نتائج کی ذمہ داری حقیقت پسندانہ طور پر لیتے ہیں اور ذمہ دارانہ اخلاقیات پر عمل کرتے ہیں،وہ ہر وقت یہ کہتے ہیں" میں اس مقام پر ہوں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا" یہ جملے مبنی بر خلوص ہیں اور دوسروں کو متحرک بنانے کی قوت رکھتے ہیں۔ ہر آدمی جس کا ضمیر زندہ ہے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس طرح دونوں قسم کی اخلاقیات ایک دوسرے کی مخالفت نہیں ٹھہرتیں بلکہ ایک دوسرے کا نتیجہ ثابت ہوتی ہیں۔ اگر کوئی آدمی سیاست کو پیشہ بنانا چاہتا ہے تو اس میں یہ دونوں اخلاقیات موجود ہونا چاہئیں۔

سیاست،جذبات اور قوت فیصلہ کی مدد سے تختوں میں سوراخ کرنے کا دوسرا نام ہے تاریخ شاہد ہے کہ ممکن کو اس تک حاصل نہیں کیا جاسکتا جب تک ناممکن کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد نہ کی جائے۔ جو یہ جدوجہد کرسکتا ہے وہی لیڈر ہے۔وہی ہیرو ہے۔ وہ لوگ جو دونوں میں سے کچھ بھی نہیں ہیں انھیں چاہیئے کہ وہ خود کو مضبوط دل و دماغ سے مسلح کریں اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو وہ " ممکن" کو بھی حاصل نہ کر سکیں گے۔صرف وہی لوگ سیاست کو بطور پیشہ اپنا سکتے ہیں جنھیں یقین ہے کہ ان کی صلاحیتیں دنیا کی حماقتوں اور برائیوں کے باوصف بروئے کار آجائیں گے۔

بیسویں صدی

◉

انیسویں صدی کے نصف آخر کا ادب انفرادی اختلافات کے باوجود اپنی کرداریت کے لحاظ سے یکسانیت کا حامل ہے اور ایک حقیقتِ عریاں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس عہد کے لئے جو بیانیہ طرزِ تحریر اختیار کیا گیا تھا وہی موزوں ترین اسلوبِ بیان تھا اور زندگی کے تمام شعبوں کی عکاسی کرنے کے قابل تھا۔ بیسویں صدی میں مصنّفین نے اس یک رنگی کو ترک کر کے مختلف مسائل کو حل کرنے کے لئے مختلف اسالیب اختیار کئے لیکن اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ انھوں نے حقیقت پسندی سے منہ موڑ لیا بلکہ انھوں نے بدلی ہوئی اقدار کو بیان کرنے کی لئے بہتر طریقہ اظہار کو اختیار کرنے کی کوشش کی۔ مگر ہوا یہ کہ اندازِ تحریر کی پیچیدگی سے پیچیدگیوں میں مزید اضافہ ہوگیا۔

حقیقت پسندی کا منطقی نتیجہ "فطرت پرستی" میں نمودار ہوا اور انیسویں صدی کے آخری دس سال میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا۔ انیسویں صدی میں "فطرت پرستی" کے سلسلے میں جو معلومات حاصل ہوئیں وہ "مادہ پرستی" کے اثر و نفوذ کا ذریعہ بنیں۔ انسان کو حالات، وراثت اور اس زمانے کے تقاضوں کی پیداوار قرار دیا گیا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی خوشحالی کے لئے اس کے حالات کو بدلنے پر زور دیا گیا۔ اِن موضوعات پر جو ڈرامے لکھے گئے ان کا تعلق زیادہ تر نچلے طبقے کے لوگوں سے تھا پورے معاشرے کو چونکانے کے لئے ان کی زندگیوں کو پیش کرنا ضروری تھا اور یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ پورا معاشرہ نہ صرف ناپائیدار ہے بلکہ مجرم بھی۔ خصوصاً سرمایہ دار، صنعتکار، اور ان سب خرابیوں کا علاج

مارکس کے نظریۂ سوشلزم کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ اس لئے سیاسی طور پر تمام مصنّفین نے معاشرہ کو تبدیل کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور انھوں نے معاشرہ کی ایسی تصویر کشی کرنے کی کوشش کی جو حقیقتِ حال سے بعید نہ ہو۔

"فطرت پرستی کے تمام فلسفیانہ اصول اور اسلوب مصنّفین نے رَد کر کے اس بات پر زور دیا کہ فن کی صحیح اقدار کو اور ادب میں داخلیت کو اہمیت دی جائے۔ ان لوگوں میں سے بعض نے شاعری میں رُومان کے علاوہ اخلاق اور مذہب کو بھی جگہ دی۔ انفرادی طور پر لکھنے والوں کی بڑی تعداد کے علاوہ "اظہار پسند" لوگوں نے ایک اجتماعی شکل اختیار کرلی اور سنہ ۱۹۱۰ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک یہ تحریک جاری وساری رہی، نوجوان طبقہ اُن مصنّفوں کے ہاتھوں سخت پریشان تھا جن کا طریقۂ کار منافقانہ تھا اور جن کی تحریر مبہم تھی۔ یہ لوگ ابھی تک شوکتِ الفاظ اور زورِ بیان میں اُلجھے ہوئے تھے جو سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار تھے حالانکہ عصرِ نو کے تقاضے ان پر اثر انداز ہو رہے تھے۔

سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے آغاز کے ساتھ ہی یہ تحریک ایک اندازِ بغاوت لئے ہوئے آگے بڑھی اور اس نے ایک مخصوص اخلاقی اور سیاسی نقطۂ نظر اختیار کرلیا۔ انھوں نے سرمایہ داروں، صنعتکاروں اور عسکری تنظیموں کو اس جنگ کا ذمّہ دار قرار دیا اور سوشلزم کو ضامنِ امن و امان۔ مگر یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان لوگوں نے "ایک نئے انسان" کا جو تصوّر قائم کیا تھا وہ خیالی تھا اور اس میں مبالغہ آمیزی تھی۔

جرمنی میں 'تحریکِ اظہاریت' مصنّفین کی آخری بڑی اجتماعی تحریک تھی اور اس تحریک کا اثر مغربی ادب پر بڑا گہرا تھا۔ اور جرمنی کی حدود تک محدود نہیں تھا۔ جس کے چند نمونے ہم اس باب میں پیش کر رہے

ہیں۔ تھیٹر کی دنیا میں جو نمایاں تبدیلی ہوئی وہ یہ تھی کہ تمثیل نگاری اُن حالات اور حقائق کے اظہار کا ذریعہ بن گئی تھی جو اس وقت موجود تھے۔ اور تماشبین حضرات میں بیرونی ذرائع سے ردّ عمل پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ ناول کا طرزِ نگارش بھی تبدیل ہوگیا تھا۔ انیسویں صدی کے برخلاف جب نفسیاتی پہلو پر زیادہ زور دیا جاتا تھا، اب واقعہ نگاری اور تنقید پر زیادہ توجہ دی جارہی تھی۔ عصر جدید میں "مقام آدم" کا ازسرِنو تعین ہورہا تھا۔ ان سب کا پس منظر شروع میں جرمنی اور آسٹریا کے حالات تھے اور پہلی جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۳ء کے وائمرری پبلک کے کوائف۔ جرمنی میں جمہوریت کی پہلی جھلک اور پھر ہٹلر کا عروج ــــ ۱۹۳۳ء میں "نیشنل سوشلسٹ پارٹی" کا قیام، جو اس ادب کے خاتمے کا سبب بنا۔ یہ ایک تبدیلی تھی کہ جس کی نظیر جرمنی کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ تقریباً تمام بڑے شاعر، ادیب اور مصنّف جرمنی سے باہر چلے گئے۔ اُن کی تصانیف پر پابندی لگادی گئی۔ صرف اس لئے کہ ان میں مسائل کا حل سوشلزم قرار دیا گیا تھا۔ بڑے سوشلسٹ ادیبوں کے چلے جانے کے بعد جرمنی میں صرف گنتی کے چھوٹے ادیب باقی رہ گئے اور وہ بھی پس منظر میں تھے۔ اسی لئے بیسویں صدی کے جرمن شاہکار زیادہ تر جرمنی سے باہر لکھے گئے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد پھر جرمن ادب میں ازسرِنو جان آگئی اور طرز نگارش میں جدید تقاضوں کے مطابق پھر ایک تبدیلی کی ضرورت محسوس کی گئی اور یہ سوال ایک بار پھر اٹھا کہ کیا ادب زندگی میں انقلاب کا باعث بن سکتا ہے یا نہیں؟

گرہارٹ ہاپٹمین

"جولاہے"

گرہارٹ ہاپٹ مین (۱۸۶۲ء تا ۱۹۴۶ء) سائلیشیا کا رہنے والا تھا اور اس کے ابتدائی ڈرامے فطری عکاسی کے نمونے تھے۔ اس نے نہایت ہمدردانہ انداز میں اس عہد کے غریب اور مفلس عوام کے حالات کو پیش کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ افراد کس قدر خود غرض ہو گئے تھے۔

اس نے اپنا ڈرامہ "جولاہے" (THE WEAVERS) ۱۸۹۲ء میں لکھا تھا اور اس میں جولاہوں کی اس بغاوت کی عکاسی کی ہے جو انھوں نے ۱۸۴۴ء میں سائلیشیا کے سرمایہ داروں کے خلاف کی تھی۔ مشینوں کی ایجاد سے یا تو بیکار ہو گئے تھے یا شدید دشواریوں میں مبتلا تھے۔ آخر بھوک نے ان کو سرمایہ داروں کے خلاف بغاوت پر مجبور کر دیا۔ اس ڈرامہ کا ایک کردار ڈرسینگر صنعتکاروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ ڈرامے کے آخر میں ان مسائل کا حل بھی پیش کیا گیا ہے۔

ہم جو اقتباس پیش کر رہے ہیں اس کا تعلق ڈرسینگر کے کمرے سے ہے اور اس سین میں جولاہوں کو اس کے گھر کے باہر احتجاج کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ ان غریبوں کے خلاف سرمایہ داروں سے کس طرح حکومت اور چرچ (کلیسا) نے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا اور مزدوروں کے رہنما ینگ وائن سولڈ کو تقریر کرنے کے جرم میں کس طرح گھر سے نکال دیا گیا تھا۔

ایکٹ نمبر ۴

مقام : پیٹرزوالڈ - ڈرائیسگر کا ذاتی کمرہ ، جو فسٹین کارخانہ دار ہے۔ اس صدی کے ابتدائی دَور کے مذاق کے مطابق کمرہ قیمتی سامان سے آراستہ ہے۔ چھت ، دروازے اور آتشدان سفید رنگ کے ہیں اور دیوار گیری کے کاغذ پھولدار مگر ہلکے رنگ والے ہیں ۔ فرنیچر مہوگنی کا بنا ہوا ہے اور اس پر خوشنما بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ دائیں جانب دو کھڑکیوں کے درمیان سرخ دمشقی پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ لکھنے کی میز لگی ہوئی ہے جس میں بہت سی درازیں ہیں۔ اس کے بالکل سامنے صوفہ سیٹ پڑا ہوا ہے اور ساتھ ہی تجوری لگی ہوئی ہے۔ کرسیاں اور آرام کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ دیوار کے ساتھ ایک الماری بھی ہے ۔ جس میں بند وقیں رکھی ہیں اور نہایت بھدّی قسم کی تصادیر پرانے چوکھٹوں میں آویزاں ہیں ۔ بائیں طرف بڑے ہال کا دروازہ ہے۔ پچھلی طرف ڈرائنگ روم ، صوفے کے اوپر ایک بڑا سا آئینہ لگا ہوا ہے۔ دو عورتیں مسز ڈرائسیگر اور مسز کیٹل ہاس ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی ہیں اور تصادیر کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں۔ پیٹر کیٹل ہاس بھی کمرہ میں موجود ہے لیکن وہ ایک دینیات کے مستند ٹیچر وائن ہولڈ سے مصروف گفتگو ہے۔

کیٹل ہاس : ایک نرم دل بوڑھا آدمی سامنے کے کمرے میں سگرٹ پیتے اور ٹیچر سے باتیں کرتے ہوئے داخل ہوتا ہے اور کمرے کو خالی پاکر حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔

بوڑھا : آپ تو جوان آدمی ہیں مسٹر وائن ہولڈ ! اور جوانی میں ہماری رائے بھی وہی تھی جو اب تمہاری ہے ۔ ہماری طبیعت کا رجحان بھی وہی تھا جو اب تمہارا ہے۔ جوانی بڑی شاندار شے ہے اور خیالات بڑے شاندار ہوتے ہیں۔ مگر مسٹر وائن ہولڈ یہ زمانہ بدقسمتی

سے اپریل کی دھوپ کی طرح بڑی تیزی سے گذر جاتا ہے۔ تم اس وقت کا انتظار کرو جب تم میری عمر کو پہنچو گے اور زندگی کے طویل سفر کے بعد خاموشی اختیار کر لو گے۔

وائن ہولڈ: (عمر انیس سال۔ زرد رنگت۔ جسم دبلا۔ لمبے اور باریک بال۔ حرکات میں اضطراب)۔ مسٹر کیٹل ہاس! میں بڑے ادب سے یہ عرض کروں گا کہ لوگ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ لوگوں کے خیالات میں اس قدر فرق ہوتا ہے۔

کیٹل ہاس: میرے پیارے وائن! کوئی شخص لاکھ مضطرب اور پریشان ہو کر موجودہ نظام کے خلاف تقریر کرے مگر بالآخر وہ خاموش ہو جاتا ہے۔ لوگ تقریریں بھی کرتے ہیں اور اپیلیں بھی کیں لیکن جولاہوں کی جو دشواریاں ہیں ان میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور یہ درس برابر جاری ہے کہ تم پیٹ کی پرواہ مت کرو۔ اپنی عقبیٰ کو سنوارو اور روحانی ترقی کا خیال رکھو۔ مبلغین کے خیال میں کلام اللہ کا درس دینا اور بندوں کو خدا کے حوالے کر کے ان کے مسائل کو نظر انداز کر دینا کافی ہے۔ اس لئے کہ یہ کام خدا کا ہے کہ وہ آدمی کو روٹی کپڑا دے۔ خیر آپ یہ تو بتائیے کہ مسٹر ڈرائسیگر آج کہاں غائب ہو گئے ہیں۔

(مسز ڈرائسیگر اور مسز کیٹل ہاس اندر داخل ہوتی ہیں)

مسز ڈرائسیگر: یہی تو میں بھی جاننا چاہتی ہوں مسٹر کیٹل ہاس! اور میں تو یہ دیکھتی ہوں کہ ولیم تو جو کچھ سوچتا ہے اور کہتا ہے وہ کر بھی ڈالتا ہے اور مجھے سوچنے کا موقعہ بھی نہیں دیتا۔ میں نے بہت سمجھایا مگر بے سود۔

کیٹل ہاس: محترمہ! تمام تاجروں کا یہی طریقۂ کار ہوتا ہے۔

وائن ہولڈ: میرے خیال میں نچلی منزل میں کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔

(ڈرائسیگر پریشانی کے عالم میں داخل ہوتا ہے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔)

ڈرائیگر: سنو روزا! کافی تیار ہے یا نہیں؟
مسز ڈرائیگر: میں خوب سمجھتی ہوں۔ جلدی جانے کے موڈ میں ہو۔
ڈرائیگر: (بے پرواہی سے) بھئی چھوڑو ان باتوں کو۔ تم نہیں سمجھ سکتیں۔
کیٹل ہاس: معاف کیجیے۔ کیا کوئی ایسی بات ہوئی ہے کہ جس سے مزاج برہم ہے؟
ڈرائیگر: ایسا تو کوئی دن نہیں گذرتا جب کوئی ناخوشگوار بات نہ ہو۔ تم کافی کے متعلق بتاؤ روزا۔

(مسز ڈرائیگر ہنستی ہوتی اٹھتی ہے اور گھنٹی بجا دیتی ہے)

ڈرائیگر: میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ نیچے چلو مسٹر وائن ہولڈ! تم کو ان تمام جھگڑوں کا کافی تجربہ ہے مگر اب تو عملی اقدامات کا وقت آگیا ہے۔
کیٹل ہاس: بہت بہتر جناب۔ آپ گھبرائیے نہیں، ہم جو موجود ہیں۔
ڈرائیگر: (وہ کھڑکی سے نیچے جھانک رہا ہے) بڑی۔ دیوانے۔ یہاں آؤ روزا (روزا آجاتی ہے) دیکھو تو یہ سرخ بالوں والے جنونی بچے جمع ہو گئے ہیں۔
کیٹل ہاس: اور یہ جوان کا لیڈر ہے اسے یہ ریڈ بیکر کہتے ہیں۔
ڈرائیگر: کیا یہی شخص ہے جس نے پرسوں تمہاری بے عزتی کی تھی۔ تم کو یاد ہے نا تم نے مجھے کیا بتایا تھا اور یہ بھی کہ جون نے تم کو گاڑی کے اندر بیٹھنے میں مدد دی تھی۔
مسز ڈرائیگر: میرا خیال ہے کہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔
ڈرائیگر: (کیٹل ہاس کو مخاطب کر کے) یوں بحث سے کیا فائدہ۔ آؤ چلو نیچے چلیں اور دیکھیں کہ اگر یہ وہی آدمی ہے تو اسے گرفتار کرا دیں (جولاہوں کے نعرے اور جوشیلے نغمے سنائی دیتے ہیں، اور وہ کہتا ہے) لو ذرا سنو تو سہی وہ کیا کہہ رہے ہیں؟

کیٹل ہاس: (گھبرایا ہوا ہے) کیا یہ بیہودگی کسی طرح ختم نہ ہوگی۔ اب تو میں بھی آپ کی اس رائے سے متفق ہوں کہ اب سوائے پولیس کو بلانے کے کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ (وہ کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے کہتا ہے) آپ مجھے اجازت دیدیجیے۔ دیکھو وائن ہولڈ۔ نیچے جو لوگ جمع ہوئے ہیں ان میں صرف نوجوان ہی نہیں ہیں بلکہ وہ بوڑھے جولاہے بھی شامل ہیں جو برسوں سے کام کرتے ہیں اور جن کو میں بڑا خداترس انسان سمجھتا تھا، اب وہ بھی اس شوروشر میں حصّہ لے رہے ہیں۔ کیا تم اب بھی طرفدار ہو مسٹر وائن ہولڈ؟

وائن ہولڈ: جی نہیں۔ ہرگز نہیں، مسٹر کیٹل ہاس۔ یہ سب کاروبار حماقت ہے۔ مگر وہ بہرحال بھوکے ہیں اور ناواقف بھی ـــــ وہ اپنی بے چینی کا اظہار کرنے کے لئے اسی طریقۂ کار کو مناسب سمجھتے ہیں۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ ــــــــ

مسز کیٹل ہاس: (چھوٹا قد۔ دبلی۔ زرد چہرہ۔ بات کاٹ کر) تم بھلا کیا سمجھ سکتے ہو؟

ڈرائسیگر: مسٹر وائن ہولڈ! مجھے افسوس ہے کہ اب مجھ کو کوئی عملی قدم اٹھانا ہی پڑے گا۔ میں نے تم کو اپنے ہاں اس لئے نہیں بلایا تھا کہ تم مجھ کو درس دو۔ تم صرف میرے بچّوں کی تعلیم سے تعلق رکھو، اور باقی باتوں میں ٹانگ مت اڑاؤ۔ سمجھے!

وائن ہولڈ: جی ہاں سمجھ گیا۔ میں وہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں جو ہو رہا ہے اور وہ میری مرضی کے عین مطابق ہے۔ (یہ کہہ کر وہ باہر نکل جاتا ہے)

ڈرائسیگر: جتنی جلدی ممکن ہو کمرہ خالی کر دو۔

مسز ڈرائسیگر: ولیم۔ ولیم (آوازیں دیتی ہے)

ڈرائسیگر: روزا کیا تم پگلی ہو گئی ہو جو باغی کی طرفداری کر رہی ہو، جو

ایسا گیت گا رہا ہے۔

مسز ڈرائسیگر: لیکن ولیم نے تو کچھ نہیں کیا ہے۔ اس نے قانون کی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔

ڈرائسیگر: کیوں کیٹل ہاس، اس کا قصور ہے یا نہیں؟

کیٹل ہاس: ہاں مگر اس کی جوانی پر ترس کھا کر معاف کر دیا جائے۔

مسز ڈرائسیگر: میری تو خاک سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ایسے اچھے گھرانے کا لڑکا ایسا کیوں ہو گیا۔ اس کا باپ چالیس سال تک سرکاری ملازمت میں ایک اعلےٰ عہدہ پر فائز رہا ہے اور جب خود ولیم کو یہ عہدہ ملا تو ماں بے حد خوش تھی مگر اس نے تو کمال کر دیا۔ ان سب باتوں کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

فائفر: (اچانک دروازہ کھول کر اندر آتا ہے اور چیختا ہے) مسٹر ڈرائسیگر، مسٹر ڈرائسیگر! میں نے اس کو پکڑ لیا ہے۔ کیا آپ مہربانی کر کے میرے ساتھ آئیں گے۔ ان میں سے ایک اور شخص کو بھی قابو میں کر لیا گیا ہے۔

ڈرائسیگر: (جلدی سے) کیا ان میں سے کوئی پولیس کو بلانے گیا ہے؟

فائفر: سپرنٹنڈنٹ اوپر آ رہے ہیں۔

ڈرائسیگر: (دروازہ پر استقبال کرتے ہوئے) خوش آمدید۔ آپ کے آنے سے بڑی خوشی ہوئی جناب! ہمیں یہاں آپ کی ضرورت تھی (کیٹل ہاس عورتوں کو اشارہ سے کہتا ہے کہ آپ لوگ یہاں سے چلی جائیں تو بہتر ہے اور فوراً ہی مسز ڈرائسیگر اور خود اس کی اپنی بیوی ڈرائنگ روم میں چلی جاتی ہیں)۔

ڈرائسیگر: (پولیس سے) میرے رنگریزوں نے ان جولاہوں کے ایک لیڈر کو پکڑ رکھا ہے۔ اب ان کی حرکات میرے لئے ناقابل برداشت

ہیں۔ میرے گھر مہمان آئے ہوئے ہیں اور ان غنڈوں نے ____،
یہ لوگ میری بیوی کی بے عزتی کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔
بس وہ ان کو کہیں نظر آجائے۔ یہی حال بچوں کی حفاظت کا ہے۔
ان کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ میرے مہمان بے عزتی کا خطرہ
مول لے کر ملنے آتے ہیں اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم جیسے نہتوں
کو ستانے کے جُرم میں ان لوگوں کو سزا ملنی چاہیئے اور اگر ایسا ہے تو
پھر میں قانونی مشورے دے سکتا ہوں۔

سپرنٹنڈنٹ: (عمر پچاس سال۔ قد درمیانہ۔ سرخ و سفید۔ وردی پہنے اور تلوار لگائے ہوئے ہے)۔ نہیں نہیں مسٹر ڈرائیگر۔ ایسا یقیناً نہیں ہے جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں آپ کی ہر طرح خدمت کرنے کو تیار ہوں مگر آپ معاملات پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ آپ نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا ہے اور ایک لیڈر کو پکڑ لیا ہے۔ میں خوش ہوں کہ آج فیصلہ کا دن آگیا ہے۔ ان لوگوں میں وہ شر پسند بھی شامل ہیں جن کو میں مدّت سے جانتا ہوں۔

ڈرائیگر: جی ہاں۔ ان میں نہایت آوارہ اور بدمعاش لڑکے شامل ہیں اور میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ میں ان غنڈوں کی یہ شرمناک حرکتیں ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں اور یہ بات عوام کے نفع میں ہے، صرف میرے ذاتی نفع کی بات نہیں ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: جی بجا فرمایا۔ بالکل درست ہے۔ مسٹر ڈرائیگر آپ پر کوئی بھی شخص آسانی سے کوئی الزام نہیں لگا سکتا۔

ڈرائیگر: در کارِ خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست (نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیئے)

سپرنٹنڈنٹ: جی ہاں۔ ہمیں اس کا عملی نمونہ پیش کرنا چاہیئے۔

ہیوگوفان ہافمنز تھال
"لارڈ چینڈوس کا خط"

آسٹریا کے شاعر ہیوگو فان ہافمنز تھال (۱۸۷۴ء تا ۱۹۲۹ء) نے اپنے عین عالم شباب میں ہی چند اعلیٰ درجہ کی تصانیف پیش کی تھیں جو اپنی زبان و بیان کے لحاظ سے ایک امتیازی شان کی حامل تھیں۔ اس کی تصانیف کی دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ عشق و محبت کے بیان میں روایتی طور پر جان دینے کا وہ انداز موجود ہے جو اس عہد رفتہ کی یادگار ہے۔ دوسرے یہ کہ اس دور کی تہذیب کے خلاف ایک اکتاہٹ ملتی ہے۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ وہ تہذیب دم توڑ رہی تھی۔ اس کے کارناموں میں "لارڈ چینڈوس کا خط" (۱۹۰۲ء) ایک خاص تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور اس کی تصانیف میں ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس خط میں جو سوانحی انداز رکھتا ہے، بارھویں صدی عیسوی کے مصنفین کے بہت سے تجربوں اور مشاہدوں کا عکس نظر آتا ہے۔ لارڈ چینڈوس ایک کامیاب مصنف ہے جو حقائق پر نظر رکھتا ہے اور دنیا کی بوقلمونی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کے الفاظ کے پس پشت حقیقت عریاں انگڑائیاں لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کا خط مایوسیوں پر اختتام پذیر نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ بعض اوقات بہت معمولی معمولی چیزیں اس کے لئے بڑے انکشافات کا باعث بن جاتی ہیں اور ایسے انکشافات لفظوں میں بیان کرنا دشوار ہوتا ہے۔ آخری دور میں ہیوگو نے اپنے آپ کو ایک ایسا ڈرامہ لکھنے کے لئے وقف کر دیا تھا کہ جس میں موسیقی اور دلکشی کے تمام سامان موجود تھے۔

مندرجہ ذیل خط فلپ۔ لارڈ چینڈوس نے جو ارل آف باتھ کا چھوٹا

بیٹا تھا، بیرن ویرولم فرانسس بیکن (سینٹ ایلبنز) کو لبطور معذرت لکھا تھا۔ اور اس بات کی وضاحت کی تھی کہ اس نے اپنے علمی مشاغل کو کس وجہ سے ترک کر دیا ہے:

"یہ تمہاری بڑی عنایت ہے کہ تم نے میری دو سال کی خاموشی کو محسوس کیا اور مجھے تسلی دی لیکن یہ بات یاد رکھو کہ دنیا کے عظیم لوگ وہ سمجھے گئے جنہوں نے زندگی کی تمام تلخیوں اور تباہ کاریوں کو سمجھنے کے باوجود حوصلہ نہیں ہارا۔ بلکہ ان پر قابو پا لیا۔

تم نے بقراط کا ایک قول کہ " وہ لوگ جن کو یہ احساس نہیں ہے کہ ایک عارضہ لاحق ہے، ذہنی طور پر بیمار ہیں۔" نقل کیا ہے اور مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں اپنی اعصابی کمزوریوں کے لئے کوئی دوا استعمال کروں اور اپنی روحانی قوت کو بحال کروں۔ میں اس سلسلے میں آپ کو جو جواب دینا چاہتا ہوں وہ آپ کے منصب کے عین مطابق ہی ہو گا مگر میری یہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں اسے شروع کیسے کروں۔

میں سوچتا ہوں کہ کیا میں واقعی وہی شخص ہوں جس کو تم نے مخاطب کیا ہے۔ وہی شخص کہ جس کی عمر ابھی صرف چھبیس سال ہے اور جس نے صرف انیس سال کی عمر میں "دی نیو پیرس" (THE NEW PARIS) "ڈلفنی کا خواب" (THE DREAM OF DAPHNE)، اور "ایپی تھیل میئم" (EPI THELAMIUM) جیسی کتابیں لکھی تھیں اور وہ جواب تک امراء اور شرفائے شہر کو یاد ہیں۔ کیا میں وہی شخص ہوں کہ جس کی عمر صرف تئیس سال تھی کہ جب اس نے وینیٹین پیازا کی محرابوں کے سائے میں یہ محسوس کیا تھا کہ اس کو لاطینی، اس کی ساخت اور اس کی نثر، پلاڈیو اور سانسوینو کے قدیم شاہکاروں سے بھی زیادہ عزیز ہے اور کیا میں وہی ہوں جس میں یہ سب خوبیاں مفقود ہو گئی ہیں اور جس کے سامنے تمہارا خط کھلا

ہوا ہے اور اس کے اپنے ہی "عنوانات" بالکل سرد اور بے معنی معلوم ہو رہے ہیں۔ میں پوری طرح یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ مجھ میں اور اُس شخص میں مماثلت کیا ہے۔ میں اصطلاحات کو اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہوں کہ گویا میں نے ان کو آج ہی پہلی بار دیکھا ہے۔ مگر بہر حال میں وہی ہوں جو پہلے تھا اور میرے استفہام میں بھی ایک ادبیت ہے۔ اگرچہ یہ ادبیت عورتوں اور دارالعوام کے اراکین کے لئے بڑی دلکش شے ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ صرف زبان کی خوبیوں سے حقیقتِ اشیا کا کوئی تعلق پیدا نہیں ہوتا لیکن میرے ضمیر کا تقاضہ یہ ہے کہ میں چند باتوں کی وضاحت کر دوں۔ یہ میرے دل کی ایک آواز ہے یا میرے ذہن کی ایک خرابی۔ تم اسے جو جی چاہے کہہ لو۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میرے ماضی اور میرے مستقبل کی تصانیف کے درمیان ایک خلیج حائل ہے تو یقین مانو کہ مجھے تو اپنے ماضی کے شاہکاروں کو اپنانے میں بھی تامل ہے۔

میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ میں تمہاری غیر معمولی یادداشت کی داد دوں یا تمہاری عنایات کو سراہوں۔ تم نے مجھے میرے وہ پروگرام یاد دلائے ہیں جو میرے غیر معمولی جوش و خروش سے تعلق رکھتے تھے اور جن میں ہم برابر کے شریک تھے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میرے پروگرام میں یہ بات شامل تھی کہ میں کنگ ہنری ہشتم کے دورِ حکومت کے ابتدائی شاندار دَور کی تاریخ قلمبند کروں۔ اس سلسلہ میں میرے دادا ڈیوک آف ایکزیٹر نے ضروری کاغذات میرے حوالے کر دئیے تھے اور یہ کاغذات اس خط و کتابت پر مشتمل تھے جو انھوں نے فرانس اور پرتگال کے ساتھ کی تھی۔ ان کاغذات میں مشہور اقوال، اٹلی کے بہترین ادب، نایاب کتابوں، مسوّدوں، قومی میلوں، عمارتوں اور بڑی شخصیتوں کے متعلق بہت کچھ مواد موجود ہے۔ ان معلومات کا فرانس، اٹلی، نیدر لینڈ اور پرتگال سے گہرا تعلق

ہے۔ ان سے مجھے ایک بنیادی خیال مل جاتا ہے۔ یہی میری بنیادی اسکیم کا خاکہ تھا مگر سوال تو یہ ہے کہ بنیادی خاکہ بنانے والا انسان کون ہوتا ہے۔

اس اسکیم کے علاوہ بھی میں نے اور تجاویز پر غور کیا جیسا کہ خود تمھارے خط سے ظاہر ہے۔ ہر اسکیم میں میرا خونِ جگر شامل تھا۔ مگر سب بیکار ثابت ہوئیں۔ ان کی حیثیت رقصِ شرر سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے اساطیر الاولین کی تاویل کرنے کی کوشش کی اور ان نقشوں کو سمجھنے کی بھی جو قدما ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں اور جن کو پڑھنے سے بہترین مصوّر اور مصنف یک گونہ مسرّت محسوس کرتے ہیں۔ ایسی خوشی جوان کو ہیرو غلفی خط پڑھ لینے سے حاصل ہوتی ہے۔ مجھے یہ سب تجاویز اب تک یاد ہیں۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس طرح کے کام کرنے میں میری کیا روحانی تسکین ہو سکتی ہے اور ان سب کی علّتِ غائی کیا ہے۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ ماضی کی ان عریاں حقیقتوں میں گم ہو جاؤں اور میں ان کی خاموش زبان کو سمجھ لوں۔ میری خواہشات، قیاسات سے ماوراء ہیں۔ کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں جولیس سیزر کی طرح تمام دانشمندوں کے اقوال اور غیر معمولی لوگوں کے احوال جمع کر دوں۔ سیزر نے اس کا تذکرہ اپنے ایک خط میں کیا ہے۔ میں اپنی سیّاحی کے دوران انھیں آسانی سے جمع کر سکتا تھا۔ ان اقوال کے علاوہ ہر وہ چیز جو مجھے کسی کتاب میں پسند آئی ہو یا کسی گفتگو کا حصّہ ہو، جمع کر لوں۔ چاہے اس بات کا تعلق جرائم سے ہو یا جنون سے۔ اس سلسلے میں نیدرلینڈ، فرانس اور اٹلی کے آثار کو خصوصاً زیرِ غور رکھا جائے اور پھر اس مجموعے کا نام "نوسی تی اِپسم" (NOSCE TE IPSUM) رکھا جائے۔

مختصر یہ کہ اس زمانہ میں مجھ پر ایک عجیب سا عالم کیف وسرور طاری رہتا تھا اور پوری کائنات مجھے صرف ایک "وحدت" معلوم ہوتی تھی۔ مادّی اور روحانی دنیا میں کوئی فرق نہ تھا۔ مجھے ہر بات میں

خواہ وہ اچھی ہو یا بُری، اندلسی رسموں کی حماقتیں ہوں یا نوجوان کسانوں کی شوخیاں یا امثال کی نزاکتیں۔ صرف ایک ہی جلوہ نظر آتا تھا اور وہ "جلوۂ قدرت" تھا۔ اس کی کارفرمائی ہر جگہ تھی۔ جہاں تک لذت کا تعلق ہے، ایک اچھی گائے کے دودھ اور دریچہ میں بیٹھ کر کتاب پڑھنے میں مجھے یکساں لطف محسوس ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "مرکزِ کائنات میں ہوں" اسی لئے میں اپنی کتاب کو ایسا نام دینا چاہتا تھا جو انسائیکلوپیڈیائی مفہوم رکھتا ہو۔

یہ تھے میرے بلند افکار جو عملی جامہ نہ پہن سکے اور خیالات کے تانے بانے بنتے اور بگڑتے رہے۔ کبھی اوروں کے خیال کی گہرائی میں اُتر گیا اور کبھی خود اپنے ہی افکار میں گم ہو گیا۔ میرے دوست! صرف روحانی ہی نہیں بلکہ مادّی خیالات نے بھی مجھ پر اسی طرح یورش و یلغار کی ہے۔ میں اپنے روحانی کرب کو کس طرح بیان کروں، یہ بڑی مشکل بات ہے۔ میری تو ایسی حالت ہے کہ جیسے پیاسے کو پانی دکھا کر ترسایا گیا ہو اور اب میری حالت یہ ہے کہ میں باتوں میں ربط پیدا کرنے کے قابل نہیں ہوں۔

سب سے پہلے تو میری یہ حالت ہوئی کہ میں ان بلند افکار پر بحث کرنے کے قابل نہیں رہا کہ جن پر لوگ روزانہ بڑی آسانی سے گفتگو کر لیتے ہیں اور میری یہ کیفیت اس درجہ بڑھی کہ مجھے روح، نفس اور جسم جیسے الفاظ کو استعمال کرنا دشوار ہو گیا۔ دل ہی نہیں چاہتا تھا کہ میں ان الفاظ کو استعمال کروں۔ یہ بڑا عجیب تجربہ تھا۔ میرے لئے اِن الفاظ

---

[1] شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے بھی اپنی ذہنی اور روحانی الجھنوں کا اظہار تقریباً اسی انداز میں کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود   گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

(ش۔ن)

کے متعلق کچھ کہنا نہ صرف تنہائی میں ناممکن تھا بلکہ میں عدالت اور اسمبلی میں بھی ان پر رائے زنی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تجریدی اصطلاحات میرے لئے صرف ریت کا گھروندہ بن گئی تھیں۔

ایک دن میں اپنی چار سالہ بچی کیتھرینا یا پمیلیا کو اس کے بچکانہ جھوٹ اور اس جھوٹ کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش پر سرزنش کرنے والا تھا کہ خود مجھے ایک ہجوم اوکار نے اچانک گھیر لیا۔ میں زرد پڑ گیا۔ اُسے سزا دینے کے بجائے وہاں سے اپنے کمرے میں آگیا۔ دروازہ بند کر لیا۔ بڑی دیر کے بعد میری طبیعت قابو میں آئی۔ میرے یہ دورے بڑھتے ہی رہے جیسے زنگ بڑھتا رہتا ہے اور آہستہ آہستہ میری حالت یہ ہو گئی کہ میں نے اس طرح کی گفتگو میں حصہ لینا قطعاً ترک کر دیا لیکن اس بات سے میری جھنجھلاہٹ میں اضافہ ہوتا گیا اور میں چڑچڑا ہو گیا۔ اگرچہ میں نے اسے چھپانے کی بیحد کوشش کی اور میری یہ عادت کسی کو اچھی اور کسی کو بُری لگتی رہی۔ زید اچھا ہے، بکر بُرا ہے، فلاں کسان قابلِ رحم ہے،" وہ گھرانا بڑی ترقی کر رہا ہے،" یا فلاں شخص قابلِ رشک ہے کیونکہ اس کی بیٹیاں بہت اچھی ہیں۔ ایسی سب باتیں میرے لئے بے معنی بن گئیں اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں ان چیزوں کی گہرائی میں چلا گیا تھا۔ جس طرح خوردبین سے ہماری جلد کا ایک حصہ سوراخوں کا کھیت معلوم ہوتا ہے اسی طرح ان چیزوں کی حقیقت بھی واضح ہو گئی تھی اور انسانوں کے اعمال کی حقیقت آشکارا تھی۔ مدت تک میں اس حقیقت کا احاطہ نہ کر سکا۔ مجھے ہر کُل کے اجزا الگ الگ نظر آتے اور کوئی خیال "کُل" کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ الفاظ کی حقیقت پر غور کرتے کرتے میں خلاؤں میں کھو جاتا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو اس مصیبت سے چھڑانے کے لئے قدیم روحانی فلسفہ میں پناہ لی۔ میں نے افلاطون پر زیادہ توجہ نہیں دی تاکہ میں اس

کے تباہ کن تصورات و اعیان میں نہ کھو جاؤں۔ قدیم حکماء میں سے تین نے سنیکا اور سسرو کو سب سے زیادہ وقت دیا۔ ان کے بکھرے ہوئے خیالات سے مجھے ایک بار پھر امید بندھی کہ میں روحانی طور پر صحت یاب ہو جاؤں گا۔ مگر میں اب بھی راہ نہ پا سکا۔ ان کی صحبت میں بھی میں خود کو تنہا محسوس کرتا رہا اور بالآخر ان کے حلقے سے بھی آزاد ہو گیا۔

اس کے بعد سے میں ایک ایسی زندگی گذار رہا ہوں کہ تم اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ میری زندگی میرے دوستوں سے، پڑوسیوں سے اور عزیز اقارب سے بالکل مختلف ہے۔ ایک بار پھر الفاظ میرا ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ میں بے نام جذبات سے مغلوب ہوں۔ میں جب تک مثالیں دے کر نہ سمجھاؤں اس وقت تک میرے خیال میں تم بھی مجھے نہیں سمجھ سکتے میری حالت ایسی ہے جیسے کوئی کتا گرمی کی شدت سے پریشان ہو یا ایسا قبرستان جسے نظر انداز کر دیا گیا ہو یا کسی غریب کسان کی جھونپڑی جو شکستہ ہو۔

میرا حال یہ ہے کہ ہر چیز میرے خیال کو اس طرح اُلجھاتی ہے کہ اُسے الفاظ میں بیان کرنا محال ہو جاتا ہے۔ الفاظ بالکل بے معنی اور بے جان ہو جاتے ہیں۔ تمام اشیاء پر غور کرنے سے خیالات کا ایک پُر اسرار طوفان اُمنڈ آتا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ میرے ڈیری فارم میں چوہوں کی کثرت کی بنا پر اُن کو مارنے کے لئے زہر منگایا گیا۔ اس دن شام کو جب میں سیر کے لئے نکلا تو چوہوں کے بے تحاشا ہلاک ہونے کے تصور سے بیحد اداس اور غمگین تھا۔ میرے تصور میں چوہے جانکنی کی حالت میں مبتلا تھے۔ میں سرد ہو کر رہ گیا۔ اپنے تصور میں مرنے والے چوہوں کی کربناک آوازیں سنتا رہا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب کچھ میرے اندر ہی ہو رہا ہے۔ مجھے زہر آلود ہوا کے جھونکے محسوس ہو رہے تھے۔ ان کے

متاثر جسم دیواروں کے ساتھ ٹکرا رہے ہیں اور خوف و دہشت کی حالت میں فرار کی راہیں تلاش کر رہے ہیں اور جب وہ ایک دوسرے سے ٹکراتے تو برہم ہو جاتے ہیں۔ میں اپنی کیفیت کو بیان کرنے کے لئے مناسب الفاظ نہیں پا رہا ہوں۔ میرے دوست! تم کو وہ وقت یاد ہوگا جب "البالونگا" کی تباہی کے موقع پر تمام لوگ ان گلیوں میں سراسیمہ تھے جن کو وہ پھر کبھی نہیں دیکھ سکے۔ جب انھوں نے ان پتھروں کو الوداع کہا جن پر وہ کھڑے ہوئے تھے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں میرے دوست کہ مجھے یہ نظارہ خود اپنے ہی اندر نظر آرہا تھا۔ مجھے کارتھیج کی تباہی بھی یاد ہے مگر یہ آگ ایک آسمانی نشان کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ ایک عذاب تھا۔ اس ہنگامہ میں ایک عورت جس کا بیٹا دم توڑ رہا تھا، تمام گرد و پیش سے بے خبر حتیٰ کہ اپنے بیٹے سے بھی بے خبر آسمان کو تک رہی تھی اور دانت پیس رہی تھی۔ قریب کھڑا ہوا غلام اسی ذہنی اذیت میں مبتلا تھا جس میں میں مبتلا ہوں اور غریب چوہوں کے دانت پیسنے اور تقدیر سے ٹکر لینے کو محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے جو طول طویل منظر کشی کی ہے۔ امید ہے کہ تم اسے معاف کروگے۔ اگر اس سے تم یہ نتیجہ اخذ کروگے کہ یہ سب کچھ رحم دلی کی وجہ سے کہہ رہا ہوں تو تم مجھے معیار سے گرا دوگے۔ یہ جذبہ رحم دلی سے کچھ کم تھا اور کچھ زیادہ۔ یہ دراصل ایک طرح کی ہمدردی تھی۔ صرف یہ احساس کہ ان چوہوں میں بھی گھڑی بھر کو زندگی کی لہر آئی تھی اور موت سے ہمکنار ہوئی تھی۔ مثال کے طور پر مالی کے لڑکے کا وہ گھڑا جس میں پانی بھرا ہوا ہے، درخت کے سائے میں رکھا ہے اور اس پر ایک پتّہ تیر رہا ہے۔ اس کا تیرنا اختتام سے ناآشنا ہے۔ اس سے مجھے محدودیت کا احساس ہوتا ہے اور یہ احساس اتنا شدید ہوتا ہے کہ

میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور میری ہڈیوں کا گودا اچھل جاتا ہے اور آخر مجھے بیان کرنے کیلئے وہ الفاظ مل جاتے ہیں جن کی شوکت ان فرشتوں کو مرعوب کرتی ہے جن کا وجود میں تسلیم نہیں کرتا۔ ان تصورات کے عالم میں میری حالت حقیر ترین جانوروں سے مثلاً کتے، چوہے اور پتھر یا پتے سے بھی گئی گذری ہوتی ہے یا پھر میری حالت اُس محبوبہ کی طرح ہوتی ہے جسے کوئی چاہے اور چھوڑ دے۔

میرے ذہن میں جانوروں اور دیگر اشیاء کے نقوش کچھ اس طرح اُبھرتے ہیں کہ مجھے دنیا میں کوئی بھی شے زندگی سے خالی نظر نہیں آتی۔ میرے اندر محبت موجزن رہتی ہے۔ ہر وہ شے جسے میں نے دیکھا ہے، چھوا ہے اور جو مجھے یاد ہے میرے لئے کچھ معنی رکھتی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے چاروں طرف ایک تماشہ ہو رہا ہے اور اس میں متضاد باتیں بھی موجود ہیں اور ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ جس کے بہاؤ کے ساتھ میں بہتا ہوا نہ چلا جاؤں۔ دماغ کی بجائے جب دل سے کام لوں تو مجھ کو جزو کل کا رشتہ معلوم ہو جاتا ہے لیکن جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو میں بڑے وہم میں پڑ جاتا ہوں اور اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتا کہ میں ان ماورائی کیفیات کو لفظوں میں بیان کر سکوں۔ جیسے میں اپنی انتڑیوں کی حرکت اور دورانِ خون کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

اِن تمام عجیب و غریب واقعات سے قطع نظر میرے لئے سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ میں اپنے ان جذبات و ہیجانات کو اپنی بیوی یا اُن ملازمین سے نہیں چھپا سکتا جو میری جاگیر کے معاملات سے تعلق رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ عادت کہ دن کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا جائے' میرے والد محترم کی تربیت کا نتیجہ ہے اور اسی کی وجہ سے مجھے بیرونی دنیا اور ان تمام انتظامات میں آسانی ہوتی ہے جو میری شخصیت اور سماجی

حیثیت کے مطابق ہوتی ہے۔

میں اپنے مکان کا ایک حصہ از سر نو تعمیر کر رہا ہوں اور اب اپنے آپ کو اس قابل پاتا ہوں کہ میں معمار سے کام کی نوعیت اور ترقی کی رفتار کے متعلق گفتگو کر سکوں۔ میں اپنی جاگیر کی دیکھ بھال بھی کرتا ہوں۔ اور میرے کرایہ دار اور ملازم اب مجھ سے مل بھی لیتے ہیں مگر غالباً وہ مجھے کچھ زیادہ کارآمد نہیں پاتے۔ میں جب اپنے گھوڑے پر سوار اُن کے سامنے سے گذرتا ہوں تو ان کو یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ میں اپنی دوربین لگا ہوں سے ان کے دروازوں میں لگی ہوئی دیمک، ان کے بوسیدہ کمرے اور پھٹے پُرانے بستر بھی دیکھ لیتا ہوں۔ وہ بستر جو کسی نہ کسی کی موت کے منتظر ہیں یا پیدائش کے۔ ان کے گملوں کے بیچ میں دبکی ہوئی چوتی بلّی بھی میری نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے اور یہ سب مناظر مجھے پھر ایک وجدانی کیفیت عطا کر دیتے ہیں۔ مجھے اس کیفیت کے لئے آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کے لئے نہیں گھورنا پڑتا بلکہ کسی گڈریے کی سُلگائی ہوئی آگ بھی میرے جذبات کی آگ بھڑکانے کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔

میں کبھی کبھی اپنا مقابلہ کریسس (CRASSUS) سے کرتا ہوں جو اعلیٰ درجہ کا مقرر تھا اور خدا کی تجلیات میں گم رہتا تھا۔ اس کی مخلوق سے محبت کرتا تھا یہاں تک کہ وہ اپنے گھر کے تالاب میں تیرنے والی ایک خوبصورت مچھلی سے، جس کی آنکھیں سرخ تھیں، بے حد محبت کرتا تھا اور اس کی محبت سب کو معلوم تھی۔ جب یہ مچھلی مر گئی تو وہ خوب رویا۔ اسمبلی کے اجلاس میں ڈومیٹیس (DOMITIUS) نے اسے اس بات پر طعنہ دیا تو اس نے کہا کہ ہاں میں تو اس کے غم میں اس قدر سوگوار ہوں جتنا کوئی اپنی پہلی یا دوسری بیوی کی وفات پر بھی نہیں

ہوتا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ کتنی مرتبہ کریسس خود مجھ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اور صدیوں کے فاصلے سمٹ کر رہ جاتے ہیں۔ وہاں تو معاملہ صرف مذاق پر ختم ہو گیا تھا مگر میرے لئے تو یہ معاملہ کافی سنجیدہ ہے۔ میرے نزدیک کریسس اور ڈِمیٹیس کی باتیں بے سود ہیں اس لئے کہ اس اسمبلی کے بجائے اس مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے لئے "کائنات کی اسمبلی" زیادہ مناسب ہے۔ جہاں ہر بات پر سنجیدگی سے غور ہوتا ہے۔ بہر حال کریسس کے تصوّر سے میرے تصورات کو بڑی تقویت ملتی ہے اور میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ گویا کائنات کا سارا کاروبار مجھ سے چلتا ہے اور پھر دوسرے ہی لمحے مجھ کو یہ سب خیالات واہمہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ہر شے نمایاں اور واضح تشریح لئے ہوئے ہوتی ہے۔ میرے اچھے دوست، میں نے اپنے یہ سب مجرّد تصوّرات پیش کر کے، جو بیان نہ کرنے کی صورت میں محبوس رہتے، تم کو بڑی زحمت دی ہے۔

یہ تمہاری عنایت تھی کہ تم نے مجھے یہ جتایا کہ میری کوئی تازہ تصنیف تم تک نہیں پہنچی ہے لیکن مجھے یہ بتانے میں کوئی باک نہیں ہے کہ میں اب اس سال، اور اگلے سال تو کیا باقی تمام زندگی میں بھی کوئی کتاب نہیں لکھوں گا، نہ انگریزی میں نہ لاطینی میں۔ میں یہ بات تمہاری بصیرت پر چھوڑ دیتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟ بہر حال حقیقت یہ ہے کہ میں جس زبان میں سوچ سکوں یا لکھ سکوں وہ زبان نہ انگریزی ہو سکتی ہے نہ لاطینی، نہ اطالوی اور نہ اندلسی۔ یہ تو کوئی ایسی زبان ہو گی جس کے الفاظ مجھے معلوم نہیں ہیں۔ ایسی زبان کہ جس میں بے زبان اشیاء مجھ سے گفتگو کر سکیں اور جس زبان میں ایک نامعلوم منصف و عادل کے سامنے اپنی صفائی بیان کر سکوں۔

فرانسس بیکن (FRANCIS BACON) جیسے شخص کو جس کی میں بے حد عزّت کرتا ہوں اور جو میرے دور کا سب سے بڑا مصنف ہے

اپنے اس آخری خط میں جذبات کے اظہار کی طاقت نہیں پاتا ہوں بہر حال
اس شخص نے میرے ذہن پر جو اثرات چھوڑے ہیں وہ میں مرتے دم
تک فراموش نہیں کر سکتا۔

چنڈوس
۲۲ر اگست سنہ ۱۶۰۳ء
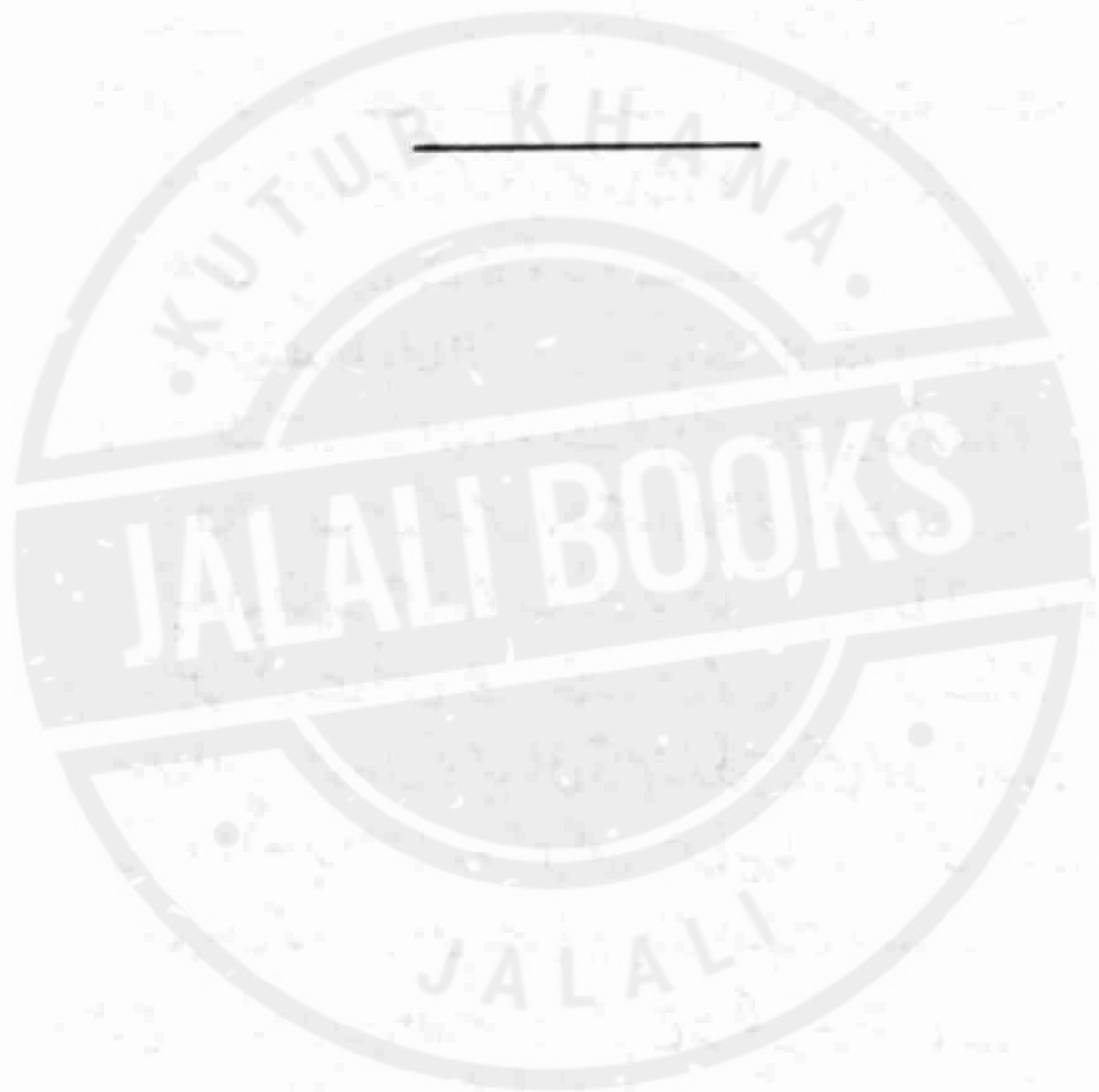
فرینز کافکا

فرینز کافکا (۱۸۸۳ء تا ۱۹۲۴ء) پریگ کا رہنے والا ایک یہودی مصنف تھا، جس کی مادری زبان "جرمن" تھی۔ اس نے قانون کا امتحان پاس کیا تھا اور ۱۹۰۸ء سے اپنی موت تک "پریگ انشورنس انسٹی ٹیوٹ" میں ایک قانونی کلرک کی حیثیت سے ملازم رہا۔ ۱۹۱۷ء میں اسے تپ دق ہوگئی اور ۱۹۲۴ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ جہاں تک اس کی زندگی کے حالات کا تعلق ہے وہ اس کی اپنی تصانیف میں نمایاں ہیں۔ اس کی تصانیف میں تین نامکمل ناول اور بہت سی کہانیاں شامل ہیں۔ ان میں جو خاص تأثر ملتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ پریگ میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا تھا۔ اس لئے کہ زیکوسلوویکیہ کی زبان اور جرمن زبان میں فرق ہے۔ اسی طرح مذہب اور نسل کا فرق بھی موجود ہے۔ ایک طرف تو یہ اذیت اور دوسری طرف باپ کا خوف، جو اُسے وقتاً فوقتاً تنبیہہ کرتا رہتا تھا اور وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ فرینز کس قدر حساس ہے۔ کافکا کے بیان کے مطابق اس کی تصانیف خود اس کی ذاتی الجھنوں کی آئینہ دار ہیں مگر دوسروں کی نظر میں وہ اس صدی کی بہترین تصانیف میں جگہ پاتی ہیں کیونکہ ان تصانیف میں عصرِ حاضر کے مسائل پر بحث کی گئی ہے اور اندازِ بیان نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ اگرچہ اس کی تصانیف کا ترجمہ مشکل ہے مگر بے معنی نہیں ہے۔ خوف، پُراسرار کیفیت، تشویش، مسلسل ناکامیاں اور فلسفیانہ بحثیں کافکا کی تصانیف کی جان ہیں۔ اس کی ایک تصنیف "فیصلہ" (THE JUDGEMENT) ایک باپ اور بیٹے کے درمیان کشمکش کی عکاسی کرتی ہے۔ اس میں بیٹا

باپ کے احکامات کا شکار ہو جاتا ہے اور آخر کار موت سے ہم آغوش بھی، جو اس کے نزدیک راہِ نجات تھی۔

"الیف کے لئے ایک کہانی"

اتوار کی صبح تھی۔ موسم بہار شباب پر تھا۔ ایک نوجوان تاجر جارج بینڈیمن اپنے فلیٹ کے کمرہ میں بیٹھا تھا۔ اس کا فلیٹ دریا کے کنارے ان مکانوں میں سے تھا جن میں رنگ اور اونچائی کے علاوہ کوئی تمیز مشکل تھی۔ وہ اپنے اس دوست کو خط لکھ رہا تھا جو گھریلو پریشانیوں سے تنگ آکر روس چلا گیا تھا۔ اس نے خط کو آہستہ سے لفافے میں بند کیا، میز پر کہنیاں ٹیکیں اور دریا کے دوسرے کنارے کے شاداب منظر کو دیکھتا رہا۔

اس کا دوست سینٹ پیٹرزبرگ میں کاروبار کر رہا تھا اور کامیاب تھا۔ مگر پردیس پھر پردیس ہے۔ اسے اپنی اجنبیت کا احساس برابر ستاتا تھا۔ بڑی سی داڑھی، زرد رنگ، پہچاننا مشکل۔ ہر دفعہ وہ اپنے دُکھڑے روتا تھا۔ روسی گھرانوں سے اس کے مراسم واجبی سے تھے اس لئے شادی بھی نہ کر سکا۔ کنوارپنے کی زندگی گذارتا رہا۔ اس سے ہمدردی تو کی جا سکتی تھی مگر اس کی مدد ممکن نہیں تھی۔ وہ سوچتا رہا کہ کیا اس کو یہ نصیحت کی جا سکتی ہے کہ وہ غیر ملک سے واپس آجائے اور یہاں اپنے ان تمام دوستوں کے تعاون سے، جو تمام اونچ نیچ سے واقف ہیں اور جو اس کی طبیعت اور مزاج سے بھی واقف ہیں، اپنا کاروبار چلائے لیکن یہ بھی قابل غور ہے کہ اگر وہ اپنا جما جمایا کام چھوڑ کر واپس آجائے اور یہاں اس کے دوست اس سے تعاون نہ کریں اور کاروبار نہ جم سکے تو کیا یہ بات تکلیف دہ نہ ہوگی اور وہ یہ محسوس نہیں کرے گا کہ اس سے تو وہ پردیس

میں اچھا تھا۔

ان سب باتوں ہی کی وجہ سے جارج اس سے خط وکتابت کر رہا تھا اس دوست کو وطن آئے تین برس گذر چکے تھے اور اس نے عذر پیش کیا تھا کہ روس کے سیاسی حالات اس قدر غیر یقینی ہیں کہ وہ اپنے کاروبار سے ایک دن کے لئے بھی دُور نہیں رہ سکتا۔ حالانکہ اس سے بہت بڑے بڑے تاجر ملک سے باہر سفر کر رہے تھے۔ بات تو یہ ہے کہ ان تین برسوں میں جارج کافی بدل گیا تھا۔ خصوصاً اپنی ماں کے انتقال کے بعد اب وہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنی تجارت کو فروغ دینے میں صَرف کرتا تھا۔ دُوری کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ اس کے باپ نے ہمیشہ تجارتی معاملات میں من مانی کی اور اسے آزادی سے کام کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اگرچہ جارج کی والدہ کے انتقال کے بعد اس کے باپ کا رویّہ کافی نرم ہو گیا تھا اور اس کی تجارت پہلے سے پانچ گنا زیادہ نفع بخش ہو گئی تھی، ملازمین کی تعداد بڑھ گئی تھی اور مستقبل شاندار تھا مگر جارج نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور نہ اس کے جگری دوست نے اپنے خطوں میں اسے کوئی ترغیب دی۔ ایک بار صرف یہ لکھا کہ وہ روس آجائے تاکہ کاروبار میں ترقی ہو۔ جارج بھی اسے اسی طرح کے خطوط لکھتا جن کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ ایک خط میں اس نے سینٹ پیٹرز برگ کے ایک نامعلوم اور غیر اہم شخص کی ایک غیر اہم لڑکی سے شادی کا ذکر کیا تھا۔

جارج اسی طرح کی دُور از کار باتوں سے خط کو بھر دیتا تھا اور یہ نہیں لکھتا تھا کہ ابھی ایک ماہ پہلے اس کی منگنی فرولائن فرانڈہ برنڈن فیلڈ سے ہو گئی ہے اور فرولائن کا تعلق ایک امیر گھرانے سے ہے۔ وہ اس دوست کے متعلق اپنی ہونے والی بیوی سے ذکر کرتا رہتا تھا۔ آخر اس نے ایک دن اس سے پوچھ

ہی لیا کہ کیا تمہارا دوست ہماری شادی میں شریک نہیں ہو گا؟ مجھے تمہارے دوستوں کو جاننے کا حق حاصل ہے۔ جارج نے جواب دیا۔ لیکن میں اسے تکلیف دینا نہیں چاہتا، عین ممکن ہے وہ شریک ہو جائے۔ تم مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کرو۔ اگر وہ آیا بھی تو جہاں وہ میری قسمت پر رشک کرے گا وہاں دُوری کی اذیت سے کونت بھی برداشت کرے گا۔ اس معاملہ میں وہ کچھ کر تو سکتا نہیں اس لئے تنہا لوٹ جائے گا۔ کیا تم میری بات کا مطلب سمجھتی ہو؟' —— "ہاں سمجھتی ہوں۔ مگر جارج! جب تمہارے دوست اِس طرح کے ہیں تو پھر تم کو یہ منگنی نہیں کرنی چاہئے تھی۔" جارج نے کہا "یہ تو ہم دونوں کا قصور ہے نہ کہ ایک کا۔ مگر میں اب اس فیصلہ کو نہیں بدل سکتا۔" فرولائن نے جارج کے طویل بوسے کے باوجود اپنا سانس جوڑ کر کہا۔ "ایسا ہی میں بھی سمجھتی ہوں اور پریشان ہوتی ہوں۔" جارج کے خیال میں یہ کوئی پریشان کن بات نہیں تھی کہ وہ اپنے دوستوں کو یہاں بیٹھے بیٹھے صِرف شادی کی خبر بھیج دے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا: "جیسا میں اندر سے ہوں ویسا ہی باہر سے ہوں اور ایسا ہی میرے دوست کو مجھے سمجھنا ہو گا۔ میں اپنے آپ کو تبدیل نہیں کر سکتا۔"

آخر کار اس نے یہی کیا کہ اپنے دوست کو ایک خط لکھا جس میں اس نے اپنی منگنی کا ذکر کیا اور بتایا کہ فرولائن ایک امیر گھرانے کی لڑکی ہے۔ اس کے متعلق مزید کچھ عرصہ بعد لکھا جائے گا۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ ہم دونوں اب معمولی دوست نہیں رہیں گے بلکہ گہرے دوست بن جائیں گے۔ اس کے علاوہ تم میری منگیتر کو بھی بہت اچھا پاؤ گے۔ وہ تم کو عنقریب خود خط لکھے گی۔ ایک اچھے دوست کی حیثیت سے اور جنس مخالف کے ایک فرد کا خط کسی کنوارے کے لئے معمولی اہمیت نہیں رکھتا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم ہم سے ملنے کیوں نہیں آ سکتے۔

لیکن تمہارے خیال میں میری شادی بہترین موقع نہیں کہ تم دشواریوں سے منہ موڑ کر یہاں آ جاؤ؟ بہر حال جو مناسب سمجھو وہ کرو۔"

اس خط کو ہاتھ میں لیئے ہوئے جارج کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا اور اپنی اسی بے یقینی کی حالت میں اس نے سڑک پر گذرنے والے ملاقاتی کو سلام کا جواب بھی دیا تھا۔ بہر حال اس نے خط کو جیب میں رکھا اور اپنے والد کے کمرے میں سے ہوتا ہوا بالکونی تک آیا۔ وہ اپنے باپ کے کمرے میں شاذونادر ہی جاتا تھا۔ اس لئے کہ باپ سے ملاقات تو کاروباری سلسلے میں روز ہی ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے دوستوں اور منگیتر کی بہ نسبت اپنے باپ سے بہت کم ملاقات کرتا تھا۔ جارج کو اس بات سے حیرانی ہوئی کہ اس کے باپ کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس کا باپ کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا۔ اس کھڑکی کے قریب کونے میں اس کی مرحوم والدہ کی بہت سی نشانیاں رکھی تھیں۔ وہ اخبار پڑھنے میں مصروف تھا اور کھانے کی میز پر بچا کھچا ناشتہ رکھا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے بہت کم کھایا ہے۔ اسے دیکھ کر اس کے باپ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے اُسے یوں مخاطب کیا۔" اوہو۔ تم ہو جارج!" اس کا بھاری گاؤن اس کے قوی ہیکل جسم پر لٹک رہا تھا۔ جارج نے خود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "یہاں بڑا اندھیرا ہے۔"

والد: "ہاں یہاں بہت اندھیرا ہے"۔ جارج: "اور آپ نے کھڑکی بھی بند کر دی ہے"____ والد: "مجھے اسی طرح اچھا لگتا ہے"____ جارج: "باہر تو اچھی خاصی گرمی ہے۔" یہ کہتے ہوئے جارج بیٹھ گیا۔ اس کے باپ نے میز کو صاف کر دیا اور رکابیاں الماری میں رکھ دیں۔ جارج نے کہا کہ میں تو آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں اب اپنی منگنی کی خبر سینٹ پیٹرزبرگ بھیج رہا ہوں۔ اس نے یہ کہہ کر جیب سے خط نکالا اور پھر

جیب میں رکھ لیا۔

والد: "سینٹ پیٹرز برگ ؟" ــــ جارج: "ہاں میں اپنے دوست کو لکھ رہا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں اس کو اپنی منگنی کی اطلاع نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ بڑا سخت آدمی ہے مگر مجبوراً ایسا کر رہا ہوں" ــــ والد: "تو تم نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے ؟" اس نے اپنے ہاتھ سے اخبار رکھتے ہوئے دریافت کیا۔

جارج: میں نے سوچا کہ جب وہ میرا اچھا دوست ہے تو میں اپنی خوشی میں اسے کیوں شریک نہ کروں۔ اسی لئے میں نے خط ڈالنے سے پہلے آپ کو بتانا ضروری سمجھا۔

والد: سُنو جارج! جب تم مجھ سے اس سلسلہ میں بات کرنے آئے ہو تو یہ بھی سُن لو کہ تم جو کچھ کر رہے ہو وہ بالکل احمقانہ ہے۔ میرا کیا ہے میں تو اب تمہاری ماں کے مرنے کے بعد سے بے کار ہوتا جارہا ہوں۔ یادداشت خراب ہو گئی ہے۔ بہت سی چیزوں میں دلچسپی باقی نہیں رہی ہے۔ بڑھاپا خود ایک لعنت ہے۔ شادی ایک اہم معاملہ ہے۔ تم مجھے دھوکہ نہ دو۔ جو بات ہے سچ بتاؤ۔ کیا سینٹ پیٹرز برگ میں واقعی تمہارا کوئی دوست موجود ہے ؟

جارج جھنا کر اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اس نے کہا: "آپ میرے دوستوں کی فکر نہ کریں۔ ایک ہزار دوست بھی باپ کے برابر نہیں ہو سکتے۔ آپ اپنی فکر کریں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ اپنی صحت سے غافل ہیں۔ آپ کم کھاتے ہیں، اندھیرے میں رہتے ہیں اور اپنی پروا نہیں کرتے۔ ہمیں آپ کی زندگی کے لئے آپ کے طریقۂ کار کو فوراً بدلنا پڑے گا۔ میں کسی ڈاکٹر کا انتظام کرتا ہوں اور پھر ہم وہ کریں گے جو اس کا مشورہ ہوگا۔ میرے خیال میں آپ کو سامنے والے کمرے میں منتقل کر دیا جائے۔ وہاں

روشنی اور ہوا کا بہتر انتظام ہے۔ آپ کو ان تبدیلیوں کا کوئی احساس نہیں ہوگا۔ کیونکہ آپ کی سب چیزیں اسی طرح وہاں رکھ دی جائیں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ اب آپ تھوڑی دیر کے لئے لیٹ جائیے۔ آئیے میں آپ کی مدد کروں، آپ دیکھیں گے کہ میں یہ سب کام کرسکتا ہوں، اور اگر آپ اپنے سامان کو نہیں ہلانے دیتے تو آپ فوری طور پر میرے پلنگ پر لیٹ جائیے۔ یہ سب سے اچھا ہوگا۔" جارج اپنے باپ کے بالکل قریب کھڑا ہوا تھا اور بوڑھے باپ نے اپنا سر سینہ پر جھکایا ہوا تھا۔ اس نے مدّھم سے لہجہ میں کہا۔" جارج!" اور جارج فوراً ہی باپ کی طرف جھک گیا۔ اس نے کہا۔" جارج تمہارا کوئی دوست سینٹ پیٹرز برگ میں نہیں ہے۔ تم یونہی دوسروں کو احمق بناتے ہو، یہاں تک کہ مجھے بھی۔ تمہارا کوئی دوست غیر ملک میں کیسے ہوسکتا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا۔" جارج:" ابا ذرا آپ غور کیجئے کہ آج سے تین سال قبل ایک لڑکا میرا دوست تھا اور آپ اُسے زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ آپ کی ناپسندیدگی کی وجہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک روز جب وہ میرے کمرے میں موجود تھا اور آپ آگئے تھے تو میں نے اُسے آپ سے چھپا لیا تھا اور پھر ایک دفعہ جب آمنا سامنا ہوا تو آپ نے اس کی بات سُنی۔ اس سے سوالات کئے۔ مجھے خوشی ہوئی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ وہ ہم کو انقلاب روس کی ناقابل یقین کہانیاں سُنایا کرتا تھا۔ اس نے یہ کہانی بھی سنائی تھی کہ عین ہنگاموں کے زمانے میں ایک پادری نے اپنی ہتھیلی پر چاقو سے صلیب بنائی اور اسی ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو اشتراکیت کے خلاف اُبھارا تھا۔"

جارج نے اسی وقفہ میں اپنے باپ کو کپڑے بدلنے پر آمادہ کرلیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس کے باپ کی زندگی بہتر ہو جائے۔ اگرچہ اس نے

اپنی ہونے والی بیوی سے ان سب باتوں کے متعلق مشورہ نہیں کیا تھا۔ مگر مستقبل کے متعلق فیصلے ضرور کیئے تھے۔ اس نے اپنے باپ کو سہارا دیا، اپنے پلنگ تک لے گیا اور کمبل اُڑھا دیا۔ بوڑھے نے اپنے بیٹے کی طرف پہلی بار بڑی محبت سے دیکھا۔ جارج نے ایک بار پھر پوچھا "کیا آپ کو میرا دوست یاد آگیا؟" بوڑھے نے اس کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ "کیا تم نے مجھے پوری طرح ڈھک دیا ہے؟" جارج نے کہا "ہاں" اور پھر بوڑھے نے پوری طاقت سے ایک لات مار کر کمبل دور پھینک دیئے اور کہا کہ ابھی تو مجھ میں اتنی طاقت باقی ہے۔ رہا تمہارے دوست کو جاننے کا سوال، تو میں اسے جانتا ہوں۔ تم سمجھتے ہو کہ اس کے چلے جانے سے صرف تم کو ہی رنج ہوا تھا اور تم نے ہی اپنے آپ کو اپنے کمرے میں بند کر لیا تھا۔ پھر تم نے دور بیٹھ کر اسے ایسا پڑھایا ہے کہ اب تم جی چاہے تو کر لو۔ تم نے تین برس تک اسے فریب دیا ہے۔" جارج کو اپنے باپ کی ان باتوں سے اور اس چھوٹی کہانی سے بڑی شدید تکلیف ہوئی اور وہ اس کے تصوّر میں کھو گیا۔ اس کے باپ نے ایک بار پھر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میری بات سنو! تم نے اپنی محبوبہ کی قمیص کو اتنا اونچا کیوں اٹھایا کہ وہ عریانی بن جائے۔ تم نے اپنی ماں کی توہین کی ہے۔ تم نے مجھے فریب دے کر ٹالا ہے۔ مگر ابھی مجھ میں دم ہے اور میں خود اٹھ سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر بوڑھا کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ جارج باپ سے دور ہٹ کر کونے میں کھڑا ہو گیا۔ بوڑھا کہنے لگا۔ "تم اپنے دوست کو دھوکہ نہیں دے سکتے اس لئے کہ میں اس کی حمایت میں یہاں موجود ہوں۔" جارج نے کہا "آپ تو بالکل مسخرے معلوم ہوتے ہیں —"

"تم ایک نالائق بیٹے ہو جو مجھ سے ایسی بات کہتے ہو۔ ہاں اب ایک رنڈوے کے لئے اس سے زیادہ اور کیا باقی ہے۔ تم نے میری ہڈیوں کا

گو دا جلا دیا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تم سے محبت کر سکتا ہوں جب کہ تم نے مجھے نظر انداز کیا ہے۔ تم جہاں ہو وہیں رہو۔ میرے قریب آنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تمہاری مدد درکار نہیں ہے۔ تم یقین کرو کہ میں ابھی تک کافی طاقتور ہوں۔ میں تمہارے دوست کو خوب جانتا ہوں اور تمہارے گاہک میری جیب میں ہیں۔"

جارج سوچ رہا تھا کہ واقعی، جیبیں تو ابا کی قمیض میں موجود ہیں۔ بہر حال یہ میرے لئے مشکلات کھڑی کر رہے ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ وہ کھڑا ہوا سوچ رہا تھا اور سب کچھ بھلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے باپ نے پھر بولنا شروع کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میاں صاحبزادے تم سمجھتے ہو کہ تمہارے دوست کو کچھ خبر نہیں ہے۔ واہ، اسے سب خبر ہے۔ میں اسے برابر خط لکھتا رہا ہوں اور اسی وجہ سے وہ یہاں برسوں سے نہیں آیا۔ وہ تمہاری باتیں تم سے کئی گنا زیادہ جانتا ہے۔ وہ تمہارے خطوط کو بغیر پڑھے حقارت سے مسل دیتا ہے اور میرے خطوط کو بڑے غور سے پڑھتا ہے۔ وہ تم سے ہزار گنا زیادہ واقف ہے" ——— جارج نے طنزیہ کہا۔ "دس ہزار گنا" ——— بوڑھے نے کہا۔ "میں اخبارات پڑھتا ہوں پوری معلومات رکھتا ہوں اور تمہارے فریب سے واقف ہوں۔ تمہاری ماں کی موت، تمہارے دوست کی تباہی اور میری حالت سب تمہاری وجہ سے ہے۔" ——— جارج نے چیخ کر کہا۔ "آپ میرے خلاف سراسر غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔" باپ نے کہا۔ "غالباً یہ بات تم پہلے ہی کہنا چاہتے تھے۔ تم نے مجھے بہت دکھ دیا ہے۔ تم شیطان ہو اور میں تم کو ڈوب کر مرنے کی سزا دیتا ہوں۔"

جارج نے اب کمرے میں ٹھہرنا ناممکن سمجھ کر باہر کا رخ کیا۔ باپ اپنے پلنگ پر دھڑام سے گر پڑا۔ جارج صدر دروازے سے نکل کر سڑک پر دوڑ

پڑا۔ جو بس آتی دکھائی دی اس میں لٹک گیا۔ وہ ابھی تک بڑبڑا رہا تھا کہ اے باپ میں تیرا اور ماں کا فرمانبردار رہا ہوں اور حکم بجالانے پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ وہ اسی حالت میں ٹنگا ہوا تھا کہ وہ دو بسوں کے بیچ میں آگیا، ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑی، وہ گر پڑا اور پیّہ سے ٹریفک کا ریلا حسب معمول گذر گیا۔ اس نے مرتے دم تک والدین کی فرمانبرداری کا دم بھرا اور خود کو موت کے حوالے کر دیا۔

"مقدّمہ"

کافکا کا ناول "مقدمہ" (THE TRIAL) اس کی وفات کے بعد ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا جس کی تدوین اس کے دوست میکس برُوڈ نے کی تھی۔ بہر حال یہ ناول نامکمل ہے۔ اس ناول کا خلاصہ یہ ہے کہ بینک کا ایک کلرک جوزف گرفتار ہو جاتا ہے اور اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا قصور کیا ہے۔ اسے ایک ایسی عدالت میں پیش کیا جاتا ہے جس کے فیصلے کی اپیل نہیں ہو سکتی۔ وہاں جوزف تمام الزامات سے انکاری ہونے کے بعد عدالت کو بُرا بھلا کہتا ہے۔ مگر اسے کوئی فیصلہ نہیں سنایا جاتا بلکہ اسے دو آدمی وہیں قتل کر دیتے ہیں۔ ناول کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں غیر فطری انداز میں یہ بات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک خود مختار ریاست میں کسی فرد کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی اور اسے اس کے جائز حقوق سے محروم رہنا پڑتا ہے۔ وہ بے یار و مددگار ہوتا ہے مگر پیش کش کا انداز بھونڈا اور غیر فطری ہے۔ اس ناول میں جوزف اور ایک پادری کے درمیان ایک مکالمہ بھی دیا گیا ہے جو درج ذیل ہے :

پادری : کیا تمھارا نام جوزف ہے ؟

جوزف : جی ہاں ۔
پادری : تم ایک ملزم ہو اور تم نے بڑا گھناؤنا جرم کیا ہے ۔
جوزف : جی ہاں ۔ مجھے ایسا ہی بتایا گیا ہے ۔
پادری : میں تم جیسے آدمی کی تلاش میں تھا ۔ میں قید خانہ کا نگراں ہوں ۔
جوزف : ضرور ہوں گے ۔
پادری : میں نے ہی تم کو یہاں بلایا ہے تاکہ تم سے باتیں کروں ۔
جوزف : مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی ۔ میں تو یہاں ایک اطالوی کو گرجا دکھانے آیا تھا ۔
پادری : یہ سب تفصیل بیکار ہے ۔ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے ۔ کیا یہ دعا کی کتاب ہے ؟
جوزف : جی نہیں ۔ یہ شہر کی قابل دید عمارتوں کا البم ہے ۔
پادری : اسے رکھ دو ۔

جوزف نے غصّہ سے البم زمین پر پٹخ دیا اور اس میں سے چند تصویریں نکل کر فرش پر بکھر گئیں ۔

پادری : کیا تم جانتے ہو کہ اس طرح تمہارا مقدمہ خراب ہو جائے گا ؟
جوزف : میں سب جانتا ہوں ۔ میں نے بہت صبر کرنے کی کوشش کی مگر بے سود ۔ میری پہلی درخواست بھی ابھی تک پیش نہیں کی گئی ۔
پادری : مگر تم جانتے ہو کہ اس کا انجام کیا ہو گا ؟
جوزف : مجھے نہیں معلوم ۔
پادری : میرے خیال میں اس کا انجام بُرا ہو گا ۔ تم کو مجرم قرار دیا گیا ہے ۔ تمہارا مقدمہ غالباً عدالت عالیہ تک نہیں جائے گا ۔ تم کو ابتدائی طور پر مجرم قرار دیا جا چکا ہے ۔
جوزف : مگر میں مجرم نہیں ہوں ۔ میرے متعلق کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے

اور ایسی صورت میں مجھے مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ آخر سب آدمی ہی تو ہیں۔

پادری: سب مجرم اسی طرح گفتگو کرتے ہیں۔

جوزف: کیا آپ بھی میرے خلاف پہلے سے کوئی رائے قائم کر چکے ہیں؟

پادری: تم مقدمہ کے حقائق کو غلط طریقے پر پیش کر رہے ہو۔ تمہارے متعلق فیصلہ کسی جلد بازی کا نتیجہ نہیں ہے۔

جوزف: اس کے باوجود یہ عجیب فیصلہ ہے (اس نے اپنا سر جھکاتے ہوئے کہا)

پادری: اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟

جوزف: میں مزید مدد حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

پادری: تم بیرونی امداد پر بہت بھروسہ کرتے ہو۔ خصوصاً عورتوں کے تعاون پر۔ یہ کوئی صحیح طریقۂ کار نہیں ہے۔

جوزف: میں آپ سے اتفاق تو کرتا ہوں مگر ہر بات پر نہیں۔ رہا عورتوں کا سوال تو ان کا اثر ورسوخ مردوں سے زیادہ ہوتا ہے اور اگر ان کی مدد مل گئی تو میں یقیناً جیت جاؤں گا۔ خصوصاً عدالت میں جہاں ججوں پر عورتوں کی سفارشوں کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ جب کوئی جرح کرنے والا وکیل کسی عورت کو کٹہرے میں دیکھتا ہے تو اپنی جرح بھول جاتا ہے۔

(پادری نے پہلی مرتبہ غور سے اسے دیکھا اور سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا)

جوزف نے پادری سے پوچھا۔ "کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟" میں نے آپ کی توہین کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ یہ تو صرف ذاتی

مشاہدات ہیں۔" (اس کے بعد دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے)۔
جوزف پادری سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اس کے قریب آئے اور اسے رُوحانی درس دے۔ پادری اس کے پاس آجاتا ہے اور اسے روحانی درس دیتا ہے۔

گوٹفرائڈ بن

"کیا شاعر دنیا کا نقشہ بدل سکتے ہیں؟"

گوٹفرائیڈ بن (۱۸۸۶ء تا ۱۹۵۶ء) برلن کا ایک طبیب تھا جس نے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے دونوں عظیم جنگوں میں خدمت کی۔ پہلے پہل اس نے نیشنل سوشلزم کو ایک روحانی قوت سمجھ کر قبول کیا مگر اسے جلد ہی پتہ چل گیا کہ وہ غلطی پر تھا۔ شروع میں وہ حقیقت پسند تھا اور بعد میں فنائیت کا دلدادہ بن گیا۔ جیسا کہ اس کی نظموں سے ظاہر ہے۔ اس کے نزدیک اس دنیا میں ظالمانہ بات کوئی نہیں اور پوری دنیا انسانی کی تخلیقی قوتوں کا نمونہ ہے۔ اس نے اپنے ان خیالات کا اظہار اپنے ایک ریڈیو انٹرویو میں کیا تھا جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

سوال: آپ نے اپنے متعدد مضامین میں شاعر کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے حالات پر اثرانداز نہیں ہوتا اور تاریخ کے دائرہ عمل سے باہر رہتا ہے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے بھی وہ اس دائرے کے اندر نہیں آسکتا۔ کیا یہ نقطۂ نظر کسی حد تک جامد نہیں ہے؟

جواب: تو کیا آپ چاہتے تھے کہ میں یہ لکھتا کہ شاعر اسمبلی، صوبائی حکومت، زمین کی خریداری اور صنعتی معاملات میں ٹانگ اڑانا پسند کرتا ہے۔

سوال: مگر ہمارے ہاں ایسے مصنّف بڑی تعداد میں موجود نہیں جو آپ کے نظریات سے اتفاق کرتے ہوں۔ ان کے خیال میں انسانیت

ایک نئے موڑ پر آ گئی ہے اور اس کا مستقبل تابناک ہے اور اس تابناک اور بالکل مختلف مستقبل کو بیان کی گرفت میں بھی لایا جا سکتا ہے۔

جواب: جی ہاں بے شک ایسے مصنف موجود ہیں اور ہمیشہ ایسے مصنف موجود رہے ہیں جو مستقبل کے متعلق خیالی پلاؤ پکاتے رہتے ہیں۔ جیسے جولیس ورن اور سوکفٹ۔ جہاں تک زمانہ کے تغیر کا تعلق ہے، زمانہ تو ہمیشہ ہی بدلتا رہتا ہے۔ آدمی برابر تبدیل ہوتا رہتا ہے مگر اس کے علاوہ باقی سب باتیں کہانیاں ہوتی ہیں۔

سوال: تو آپ شاعر کی شرکت کے سوال کو بے محل قرار دیتے ہیں؟

جواب: میں اسے فلسفیانہ قرار دیتا ہے۔ اس لئے کہ مصنفین کا ایک گروہ سزائے موت اور اسقاط حمل کے قوانین کے خلاف ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو والٹیر اور ایمل زولا کی طرح عوامی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اسی سے ان کو ایک مقام حاصل ہوتا ہے۔

سوال: کیا آپ کے خیال میں یہ سب تحریکیں شاعری کی حدود میں نہیں آتیں؟

جواب: مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں شاعری کی حدود میں آتی ہیں مگر شاعر اور غیر شاعر کی رسائی میں فرق ہوتا ہے۔

سوال: کیا آپ کے خیال میں کاریگر اور کاریگری ہی سے کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہے؟

جواب: دنیا میں تبدیلی تو ہوتی ہی رہتی ہے مگر جہاں تک تبدیلی لانے کا تعلق ہے وہ دراصل صرف "آدمی لاتا ہے جو لفظ کاریگر اور کاریگری" سے اونچا ہے اور وہ صرف مادی ترقی ہی نہیں بلکہ روحانی ترقی کو بھی برابر کی اہمیت دیتا ہے۔ آج کی سائنس میں ترقی اور شہروں کی جگمگاہٹ کا تقابل برلن سے صرف پچاس ساٹھ میل

کے فاصلہ پر دیہاتوں سے کیجئے تو معلوم ہو جائے گا کہ انسان نے کتنی ترقی کی ہے۔ دیہاتوں میں افلاس بھی ہے اور اندھیرا بھی۔ اگر آپ ہنرچ وان کلیسٹ (HEINRICH VON KLEIST) کی کتاب "پنتھی سیلیا" (PENTHESILEA) کا مطالعہ کریں تو حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

سوال: کیا آپ کے خیال میں "پنتھی سیلیا" وہ اہم کتاب ہے۔ جس کو ہمارے نظامِ تعلیم میں نظرانداز کیا گیا ہے؟

جواب: جی ہاں میرا یہی مطلب ہے۔ اس کتاب کے علاوہ ہنرچ مین کی کتاب "معمولی گاؤں" نے بھی ذہنوں پر کوئی اثر نہیں کیا ہے۔ صرف اس لئے کہ انھوں نے عام رجحان سے الگ ہو کر لکھا ہے۔ یہی ان کا بڑا پن ہے۔

سوال: مگر کیا آپ کا نقطۂ نظر منفی نقطۂ نظر نہیں ہے؟

جواب: اگر سماجی ترقی مثبت ہے تو یقیناً ذرا پھر ماضی کے ان شاہکاروں پر غور کیجئے جن میں نفرتیتی اور ڈورین ٹیمپل کے بت، اینا کارے نینا، 'توسیکا کا نغمہ'، 'اوڈیسی' اور کیا کیا شامل ہیں۔ ان شہ کاروں میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو ان کے اندرون سے علیحدہ ہو۔ یہاں کسی تشریح کی ضرورت نہیں، کسی خارجی تاثر کی حاجت نہیں۔ یہ اپنی ذات میں گم شبیہوں کا ایک جلوس ہے۔ اگر آپ انھیں منفی نقطۂ نظر قرار دیتے ہیں تو یہ فن کا خصوصی منفی نقطۂ نظر ہے۔

سوال: آپ اتنی دور کیوں جاتے ہیں۔ میں آپ کو خود سامنے کی چیزیں گناتا ہوں۔ آج صرف برلن شہر میں چھتیس ہزار آدمی تپ دق کا شکار ہیں اور ان کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ جرمنی میں ہر سال چالیس ہزار عورتیں غیر قانونی طور پر اسقاط حمل کرانے کی وجہ سے موت کا

شکار ہوتی ہیں۔ ملک میں تعلیم کی کمی اور بے روزگاری عام ہے۔ تیس سال کی عمر تک کے جوان بے کار مارے مارے پھرتے ہیں۔ ایک کنبہ میری نظر میں ہے۔ باپ شرابی ہے۔ ماں کے ہاں دسواں بچہ ہونے والا ہے اور اس گھر کی چودہ سالہ لڑکی گائے کا خون اپنے اوپر چھڑک لیتی ہے تاکہ لوگوں کو اس پر ترس آجائے اور وہ گھر کی مصیبت سے نجات پا کر ٹی بی سینی ٹوریم چلی جائے۔ قوم آہ و بکا میں مصروف ہے۔ کیا شاعر صرف منہ تکنے کے لئے رہ گیا ہے؟

جواب: مجھے "ہاں" کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے۔ شاعر جانتا ہے کہ یہ مصائب کن لوگوں کے لائے ہوئے ہیں اور جب تک اس نظام کو بنیادی طور پر نہ بدلا جائے اس وقت تک سماجی بہبود کا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

سوال: کیا یہ عجیب سا جواب نہیں ہے؟

کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ ہر مصنّف کا اشتراکی ہونا ضروری ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مصر اور بابل کے سرمایہ دار رقم پر بیس فی صد سود لیتے تھے۔ مشرق و مغرب اور تمام ایشیا اس کی پیٹ میں تھے۔ آج بھی طریقہ مختلف ہے مگر اجارہ داری دبی ہے۔ کوئی دولت مند اپنی بلندیوں سے نیچے اترنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس لئے میں جو کچھ کہتا ہوں وہ نہ اچھا ہے نہ برا بلکہ "واقعہ" ہے۔ اور نتیجہ یہ اخذ ہوتا ہے کہ بغیر کسی تبدیلی کے سنہرے خواب دیکھنے اور دکھانے والے دنیا کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ عوام کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ جیسا کہ لیزل (LASSALLE) نے کہا تھا کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ غربت اور افلاس کے متعلق نہیں ہے بلکہ وہ اس پروپیگنڈے کے متعلق ہے جو ابھی حال میں برطانیہ

کے ایک ماہر معاشیات نے کیا ہے کہ برطانیہ کے مزدور اب آرام و
آسائش کی زندگی گذارتے ہیں اور ان کو رئیسوں اور زمینداروں سے
زیادہ سہولتیں میسّر ہیں۔ ان کو روشن مکان اور اچھی خوراک مہیا کی جاتی
ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ آج کا غریب اس طرح بھی نہیں رہ سکتا جس طرح
صدیوں پہلے کا امیر آدمی رہتا تھا۔ یہ اس سے بھی زیادہ پسماندہ
ہے۔ اصولاً جس کے پاس دولت ہے وہ زیادہ صحت مند ہوگا۔
اور غریب کمزور اور بیمار۔ طاقتور کے حق میں فیصلہ ہوتا ہے اور کمزور
کے خلاف۔ تاریخ انسانی یہی ہے۔ ہم کو ایک ایسے ذہنی انقلاب
کی ضرورت ہے جو صرف روس کی طرح دولت اور طاقت کی تقسیم
کردے اور جس کی روح پرانی اور فرسودہ نہ ہو۔ بنیادی اقدار کا
بدلنا ضروری ہے۔ صرف خواب دیکھنے سے کام نہیں چلے گا۔ خواب
کو حقیقت بنانا ہوگا۔ اس کے لئے لٹریچر اور پبلسٹی کی ضرورت ہوگی۔

سوال: کیا آپ موجودہ نظام معاشیات سے اتفاق رکھتے ہیں؟

جواب: میرے خیال میں تو "کام" مجبوری کا نام ہے۔

بڑا کائناتی جواب ہے۔

بہر حال میں تو آپ کے "کاریگر اور کاریگری" والے جھگڑے سے
باز آیا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ شاعر کو اس بات کی اجازت ہو کہ وہ
ساری دنیا کے جھگڑوں سے الگ تھلگ رہے اور اپنے ہمعصروں
سے کوئی واسطہ نہ رکھے، جن میں سے آدھے ہر وقت سکّہ کی قیمت کم
ہونے اور آمدنی کی قلت کا رونا روتے رہتے ہیں۔ شاعر تو بس
اپنے حال میں مست رہتا ہے۔

بڑے فنکارانہ اصول بیان فرمائے ہیں۔

جی نہیں بلکہ "اخلاقی اصول"۔ شاعر صرف سماجی دکھوں کا عکّاس

نہیں ہوتا بلکہ وہ تو ایک مصوّر کی طرح جو کچھ دیکھتا ہے اس کی تصویر اتار لیتا ہے۔ اسی لئے کبھی اس کا موضوع المیہ ہوتا ہے اور کبھی طربیہ۔ میں بھی سات سال سے کوشاں ہوں اور یعقوبؑ بھی ریشں کے لئے سات برس تک کوشاں رہے تھے۔ ہنرچ مین نے نلائبر کے متعلق لکھتے ہوئے ہمیں بتایا کہ نلائبر ابھی کچھ اور بھی لکھنے والا تھا جو اس کی پہلی تحریروں سے مختلف ہوتا اور وہ سب کچھ انسانیت کی بہبود سے متعلق ہوتا۔

سائل: یہ بات بڑی افسوسناک ہے لیکن کیا روز اوّل ہی سے شاعروں نے انسانیت کے دکھ کو محسوس نہیں کیا اور کیا اس کے درماں کے لئے کام نہیں کیا؟

مجیب: یہی وہ بات ہے جس کا میں نے ابتدا میں ذکر کیا تھا اور اس کے لئے میں نے شاعری کے مواد کے متعلق اشارہ کیا تھا۔ شاعر پیدائشی طور پر ایک ناقابل فہم وجود ہوتا ہے اور خاص انفرادیت کا مالک ہوتا ہے۔ وہ عام انہام وتفہیم اور تعلیل سے بلند ہوتا ہے اور وسطی تصوّرات سے ماوراء۔ میرے خیال میں یہی شاعر کا مقام ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ اسے اپنے آپ کو بدلنا چاہیئے۔ مگر وہ خود کو کیسے بدل ڈالے؟ مثلاً گوئٹے کہتا ہے "ماں کی حقیقت اس ماں سے مختلف اور بلند ہے جو بچّوں میں گھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ شاعر صرف اپنی طبیعت کے مطابق نغمہ سرا ہوتا ہے اور وہ عوامی رجحانات کی پرواہ نہیں کرتا۔

ہاں وہ اپنی ہی دُھن کا مالک ہوتا ہے اور وہ اپنے مخصوص انداز ہی میں عظمت انسانی کا پتہ چلاتا ہے۔ حقائق ہمارے حواس سے گہرا

تعلق رکھتے ہیں اور وہ ان کے بدلنے کے ساتھ بدلتے ہیں۔
سائل: تو شاعر صرف اپنے دل کی باتیں لکھتا ہے؟
مجیب: ہاں شلر کے الفاظ میں "خود ساختہ" باتیں ہی بیان کرنا اس کی ضرورت ہے اور اس کی ضرورت تنزیہی ہوتی ہے یا مشاہداتی۔ مگر مادّی نہیں ہوتی۔ وہ 'موقع پرست' نہیں ہوتا اور نہ ترقی پسند۔ وہ تو "نغمۂ تقدیرِ الٰہی" ہوتا ہے اور "بِترِ افکار"۔ ان سب باتوں کی وضاحت اور گہرائی کے لئے نٹشے کی تصنیف "یونانیوں کا دور المیہ اور فلسفہ" پڑھنا ضروری ہے۔ دنیا کا کوئی طریقہ بھی ان کے کام اور ذمہ داریوں کو کم نہیں کرتا جس طرح بونوں کا شور کسی دیو پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

رابرٹ میوسل

"بے وصف آدمی"

رابرٹ میوسل (۱۸۸۰ء تا ۱۹۴۲ء) نے، جو آسٹریا کا باشندہ تھا، متعدد مضامین اور دیگر تصانیف کے علاوہ ایک بہت اچھا ناول بھی لکھا تھا جس کا عنوان "بے وصف آدمی" تھا۔ اس ناول کے لکھنے میں رابرٹ نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ صرف کیا تھا اور واقعی یہ ناول اس کا شاہکار ہے مگر وہ اسے مکمل نہیں کر سکا تھا۔ بالآخر اسے ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۳ء، ۱۹۴۳ء اور ۱۹۵۲ء میں قسطوں میں شائع کیا گیا۔ اس کا زیادہ حصہ احساسات اور جذبات پر مشتمل ہے، عمل کا بیان بہت کم ہے۔ ثقافت پر اس قدر طویل بحثیں کی گئی ہیں کہ ناول کی صفات اس میں گم ہو گئی ہیں۔ ناول کا مقام ۱۹۱۳-۱۴ء کا ویانا ہے لیکن بنیادی ماحول آسٹرو ہنگرین ہے، جب ہنگری کی بادشاہت جنگ عظیم کی تیاریوں میں مصروف تھی اور صرف مقامی حکومت ہی نہیں بلکہ پورا یورپ اور اس عہد کے عام خیالات، تمام قوانین، سیاسی اور مذہبی جماعتیں سب انحطاط پذیر تھیں اور سلامتی کی کوئی ضمانت نہیں رہی تھی۔ یہ ناول خود رابرٹ اور ناول کے ہیرو الرچ کی منہ بولتی تصویر ہے۔ الرچ ایسے مزاج کا آدمی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ بدل سکتا ہے۔ اس کردار کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ اس ماحول کی عکاسی کرے جب کوئی شخص مستقل مزاج نہیں ہو سکتا تھا۔ رابرٹ اس مادہ پرست جدید دنیا سے کنارہ کش ہونے کے بجائے انتہائی تضحیک اور طنز کے ساتھ اس کی تصویر کشی کرتا ہے۔

بے وصف آدمی میں وہ تمام اوصاف ہوتے ہیں جو انسانوں میں نہیں پائے جاتے

لیکن الرچ اس شام کو واپس نہیں آیا۔ڈائرکٹر فنسل کے چلے جانے کے بعد وہ تنہا بیٹھا رہا اور اپنے خیالات میں گم ہوگیا، ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔ وہ سوچتا رہا کہ لوگ جھوٹ بولنے میں ایک دوسرے پر سبقت کیوں لے جاتے ہیں۔ الرچ بڑا جذباتی آدمی تھا، مگر جذباتی سے وہ معنی مراد نہ لئے جائیں جو عموماً لئے جاتے ہیں' بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے عمل کے لئے دوسروں کی حرکات سے متأثر ہوتا تھا۔ وہ ایسا محسوس کرتا تھا کہ اس کے جسم میں جو جان ہے وہ صرف ذاتی مقصد کے لئے نہیں ہے بلکہ اس کا کوئی اجتماعی مقصد بھی ہے اور وہ قابلیت جو اس میں موجود ہے وہ صرف اس کی اپنی ذات ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ اوروں کے لئے بھی ہے۔ چاہے وہ اوروں کا ہم مذاق نہ ہو۔ اگر الرچ سے کوئی یہ پوچھ لے کہ تمہاری حقیقت کیا ہے تو غالباً وہ ہکا بکا رہ جاتا ——
اس لئے کہ اس نے اپنی ذات تک محدود ہو کر کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ ایک اہم شخصیت تھا مگر اُسے خود اپنی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں تھا. اگرچہ وہ اپنی شخصیت اور اثر ورسوخ پر پورا اعتماد رکھتا تھا۔ ہر آدمی کی ایک وہ شخصیت بھی ہے جو صرف دوسروں کو نظر آتی ہے خود وہ شخص اس سے ناواقف ہوتا ہے۔ مثلاً غصہ میں آدمی کی جو حالت ہوتی ہے اس سے وہ خود آگاہ نہیں ہوتا۔

کبھی کبھی انسان کے تجربات ہیجانی انداز کے ہوتے ہیں لیکن ان کا اس کی روحانی قوت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، مثلاً مُکّہ بازی کا

فن دوسرے کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا ہے مگر دوسرے آدمی کے لئے یہ بات صرف ظلم ہوتی ہے۔ خصوصاً ان ذہین اور دانش مند لوگوں کے لئے جو مکّہ بازی سے ناواقف ہوتے ہیں۔ ایک پروفیسر اپنی بیوی کی آغوش میں مسائل کو حل کرنے میں مصروف ہو تو لوگ اسے بے حس کہتے ہیں۔ اگر کوئی سپاہی لاشوں کو روندتا ہوا چلے تو لوگ اسے کامرانی کہتے ہیں۔ ہر بات کو اخلاقیات کے کسی خاص اصول پر نہیں پرکھا جاسکتا۔ ان سب الجھنوں نے الرّیح کے ذہن میں بھی جنم لیا تھا اور اس کی پوری زندگی بدل دی تھی۔ اس کے خیال میں اس دنیا میں ابھی تک ایسے بے شمار تجربات ہیں جو کسی انسان کے بغیر حاصل ہوئے ہیں اور بہت سے انسان ایسے بھی ہیں جو تجربوں سے دُور ہیں اور ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد الرّیح اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ خود بھی ان لوگوں میں سے ایک ہے جو کوئی وصف نہیں رکھتے۔

بارٹولٹ بریخٹ

بارٹولٹ (۱۸۹۸ء تا ۱۹۵۶ء) بیسویں صدی کے بہترین شاعروں اور ڈرامہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی تحریروں کا ہمارے زمانے کے ادب پر بڑا گہرا اثر ہوا ہے۔ بریخٹ کے ہاں فنکاری، تاریخ نویسی اور سیاسی مقاصد کا ایک لطیف امتزاج پایا جاتا ہے۔

بریخٹ ۱۸۹۸ء میں جنوبی جرمنی کے شہر آسبرگ میں پیدا ہوا تھا اور وہ ایک مصنف و تھیٹر کے ادبی مشیر کی حیثیت سے میونخ اور برلن میں مقیم رہا۔ جب ۱۹۳۳ء میں ہٹلر برسر اقتدار آیا تو وہ آسٹریا چلا گیا اور پھر وہاں سے ڈنمارک، سوئیڈن اور روس میں قیام کرتا ہوا امریکہ پہنچ گیا۔ جنگ کے خاتمہ پر وہ جرمنی واپس آیا اور مشرقی جرمنی میں بس گیا اور مرتے دم تک ڈرامے لکھتا رہا۔ اس نے یوں تو شروع ہی سے سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند رکھی مگر اس کی زندگی میں بڑی تبدیلی اس وقت ہوئی جب وہ مارکس کے فلسفہ کا رَسیا بن گیا اور اس نے ایسے ڈرامے لکھے جو نہ صرف اس زمانے کے ناظرین پر اثر انداز ہوئے بلکہ آج تک ان کا تاثر پایا جاتا ہے۔ اس نے سماجی گروہ بندی، معاشی ترقی اور تاریخی صورت حال کو مدّنظر رکھتے ہوئے ڈرامے لکھے۔ اور ان کو اسٹیج پر پیش کیا۔ اس کے تھیٹر میں نہ صرف بینرز اور پلے کارڈ لگائے جاتے تھے بلکہ ڈرامہ کے ساتھ اس کے مفہوم اور مقصد کو بھی واضح کیا جاتا تھا اور سماجی حالت پر تبصرہ بھی ہوتا تھا۔ وہ تمام دنیا کو ایک طرح کی تغیر پذیری سے تعبیر کرتا اور سرمایہ دارانہ نظام کی تبدیلی کو سب

اہم تغیر قرار دیتا ہے۔ وہ اپنی پوری زندگی میں اس بات کے لئے کوشاں نظر آتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ سوشلسٹ نظام دنیا میں رائج ہو جائے۔ اس کے ڈرامہ کو دیکھنے والا اس بات کا قائل ہو جاتا ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ اور سوشلزم کا قیام عمل میں آنا ضروری ہے۔ وہ اپنی قابلیت سے اپنے ڈرامے میں اس طرح کے تاثرات پیدا کرتا ہے کہ تماشائی کا ذہن مختلف سوالوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ بریخٹ کے بہترین ڈرامے وہی ہیں جو اس نے اپنی جلا وطنی کے زمانے میں لکھے۔ جن میں سے "گلیلیو کی زندگی"، "ماں کی جرأت اور اس کی اولاد" اور "کاکیشیا کا حلقۂ خاک" بڑے معرکے کے ڈرامے ہیں۔

"زکوان کا بھلا آدمی"

بریخٹ نے اپنے ڈرامے "زکوان کا بھلا آدمی" (۱۹۴۲ء) کے آخر میں سوشلزم کی پُر زور تبلیغ کی ہے۔ اس ڈرامہ کا مرکزی خیال یہ ہے کہ تین دیوتا ایک نیک آدمی کی تلاش نکلتے ہیں اور ان کی ملاقات ایک طوائف سے ہوتی ہے جو حاملہ ہے۔ اس طوائف کا نام "شن تی" ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ پیدا ہونے والے بچے کی نگہداشت کرے مگر معاشرے کی پابندیوں سے پریشان ہے۔ اس کی خوبیاں خود اس کے لئے دردِ سر بنی ہوئی ہیں۔ ایک طرف لوگ اُسے پریشان کئے ہوئے ہیں اور وہ مظلوم نظر آتی ہے تو دوسری طرف خود وہ اپنی ایک اور بہن "شوئی تا" کے نام سے ایک فیکٹری چلا رہی ہے اور غریبوں کا خون چوس رہی ہے۔ یہ دیوتا اس کی اس دوہری زندگی اور عیاری کو دیکھ کر آسمان پر واپس لوٹ جاتے ہیں۔ اور "شن تی" کو تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی ڈرامے کے آخر میں ایک

اداکار اسٹیج پر آتا ہے اور درج ذیل تقریر کرتا ہے۔

"خواتین وحضرات! ہم آپ کے سامنے اپنے مقاصد پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ڈرامے کو ختم کر رہے ہیں مگر اس کی اثر انگیزی کو آپ پر چھوڑ رہے ہیں۔ آپ کی عنایت کے بغیر ہمارا ڈرامہ کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سوال کا جواب کہ انسان کے موجودہ مصائب کا علاج کیا ہے اور کس طرح کا انقلاب دنیا میں ضروری ہے، خود آپ کو سوچنا ہے۔ آپ خود سوچئے کہ وہ انقلاب کیا ہے؟

"لاسیوتات کا سپاہی"

برنجٹ نے ۱۹۳۵ء میں ایک ڈرامہ لکھا جس کا عنوان تھا "لاسیوتات کا سپاہی" اور یہ اس وقت کی بات ہے جب اطالوی فوجیں حبش میں داخل ہو رہی تھیں۔ برنجٹ نے اس میں سپاہی کی ذہنیت، جنگ کا فلسفہ اور انسان کے جنگی جنون پر روشنی ڈالنے کے بعد پھر دعوتِ فکر دی ہے کہ ایک ذہنی انقلاب کی شدید ضرورت ہے۔

(ایک سین)

پہلی جنگ عظیم کے بعد جنوبی فرانس کی چھوٹی سی بندرگاہ "لاسیوتات" میں ایک جہاز کو پانی میں اتارنے کی رسم ادا کی جارہی ہے۔ چوراہے پر پیتل کا ایک بُت نصب ہے اور بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہیں۔ قریب جاکر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساکت وصامت آدمی ہے بُت نہیں ہے اور اس شدید گرمی میں وہ وہاں کھڑا ہے۔ سر پر ٹوپی ہے، ہاتھ میں نیزہ، اور وہ آنکھ بھی نہیں جھپکاتا ہے۔ اس کے قدموں میں ایک بورڈ رکھا ہوا ہے جس پر درج ذیل عبارت لکھی ہوئی ہے۔

"انسانی بُت"

"میرا نام چارلیس لوئیس فرینچرڈ ہے۔ میں فوج میں ملازم ہوں اور جنگ کے زمانے میں ایک مرتبہ زندہ دفن ہو چکا ہوں۔ اس حادثے سے مجھ میں یہ قوت پیدا ہو گئی ہے کہ میں جب تک چاہوں بغیر پلک جھپکائے یا کوئی حرکت کئے، بُت کی طرح کھڑا رہوں۔ تمام ڈاکٹروں نے اس کو ایک لاعلاج مرض قرار دیا ہے۔ آپ میرے بے روزگار باپ اور کنبہ کی مدد فرمائیں۔"

ہم نے بھی اس کے کاسہ میں ایک سکہ پھینکا اور آگے بڑھ گئے اور یہ سوچتے رہے کہ کبھی یہ سپاہی اسکندر، قیصر، نپولین اور کورش بنتا تھا اور آج بھکاری ہے۔ یہ سپاہی کبھی چنگیز خاں کا تیرانداز سوار اور نپولین کا جانباز محافظ ہوتا تھا۔ یہ فاتح بھی ہوتا تھا اور مفتوح بھی۔ مارتا بھی تھا اور مرتا بھی، مگر ہنی بال کے ہاتھیوں کے پیر تلے اور اٹیلا کے گھوڑوں کے ٹاپوں تلے۔ آج وہ ایک ایسے علاج مرض کا شکار ہے کہ جو اس تک محدود نہیں رہے گا بلکہ چھوت کی بیماری کی طرح دوسروں کو بھی لگ جائے گا۔ ہم کو اس مرض کا علاج ضرور تلاش کرنا چاہیئے۔

"المیہ پر سہ رُخی بحث"

بریخٹ نے ۱۹۴۰ء میں چند مکالمات صرف اس مقصد سے لکھے تھے اور ان کی غرض و غایت یہ تھی کہ مخالف نظریات رکھنے والے لوگوں کے اعتراضات کا جواب پیش کیا جائے۔ انہی مکالمات میں سے ایک یہ ہے۔ اس کی بنیادی بحث یہ ہے کہ "المیہ" کیا ہے اور اس صورت میں جب کہ دنیا تغیر پذیر ہے، کیا روایتی مفہوم کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

مکالمہ

کارل: میں جب یہ سنتا ہوں کہ آپ ایک تھیٹر کھولنے والے ہیں تو میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ تو عموماً طربیہ عناصر کو ملا کر ایک المیہ تیار کر لیتے ہیں۔ یہ بڑی گھٹیا بات ہے۔ آپ کے اس ڈرامے کو جس میں ایک لڑکی اپنے باپ کی خدمت کرتی دکھائی گئی ہے، المیہ بنانے کی کوشش پر پبلک ہنس رہی تھی۔

تھامس: جی ہاں۔

کارل: تو کیا اس طرح کے مصنوعی اثرات پیدا کرنے سے المیہ کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔

لوکس: میرا بھی یہی خیال ہے کہ اس طرح المیہ کا خاتمہ ہو جائے گا کیونکہ المیہ میں مزاحیہ سین اس کے تأثر کو تباہ کر دیتے ہیں۔

تھامس: جی ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر میں یہ عرض کروں گا کہ میں نے جس طرح اسے پیش کیا ہے وہ عین انسانی زندگی کے مطابق ہے اور شیکسپیئر نے بھی المیہ اور طربیہ کو ملا کر پیش کیا ہے۔

لوکس: لیکن آپ کے ڈراموں میں تو المیہ کی بنیادی ضرورت ہی کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔

تھامس: میرا خیال ہے کہ ہم کو اپنی گفتگو کو عمومی نہیں بنانا چاہئے اور "خواب و خیال"، "روشن خیالی" اور "بابرکت" جیسے الفاظ سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ لفظ المیہ آدمی کے ذہن کو اذیت پسندی کی طرف موڑ دیتا ہے لیکن ہم اس خیال کی مدافعت کر سکتے ہیں۔ ہمارے دوست کارل کا کمال یہ ہے کہ اس نے نئے دور کے لوگوں کے لئے بڑی خوبصورتی سے المیہ کے اندر طربیہ کے عنصر کو شامل کر دیا ہے اس طرح معاشرے کی پوری تصویر آسانی سے

پیش کی جا سکتی ہے۔ یہ بات تو غلط ہے کہ اس طرح المیہ کا تاثر ختم ہو جاتا ہے۔ ہاں البتہ یہ ٹھیک ہے کہ یہ طریقہ کچھ زیادہ دلچسپ نہیں ہے۔

کارل: کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارا طریقہ "یہ ہو سکتا ہے اور یہ نہیں ہو سکتا" المیہ کے تاثر کو قائم رکھنے کا بہتر ذریعہ ہے۔

تھامس: یوں تو اگر کوئی انسانی افعال میں صرف چند حرکات کا اور اضافہ کر دے تو وہ المیہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

ٹوکس: میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ پرانے ڈرامہ نویسوں کا بھی یہی طریقہ تھا۔ جو لوگ تھیٹر میں آتے ہیں وہ اس بات کے مجاز نہیں ہوتے کہ وہ سب کچھ اپنے جذبات کے مطابق پائیں۔ ان کو تو صرف المیہ کی ہیجان انگیزی سے واسطہ ہونا چاہیئے۔ ڈرامہ نویس انسانی زندگی کو پیش کرتا ہے نہ کہ تماشائیوں کی زندگی اور ان کے جذبات کو۔

تھامس: بسا اوقات ہم بعض باتوں کو نظر انداز کرنا اور روکنا بھی چاہتے ہیں لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا۔

ٹوکس: میں تو یہی سمجھتا تھا کہ آپ عموماً ایسا ہی چاہتے ہیں۔

تھامس: اس کے برخلاف جذبات کے بغیر افکار کیسے موجود ہو سکتے ہیں۔ جس طرح خیالات غلط ہوتے ہیں اسی طرح بعض جذبات بھی غلط ہوتے ہیں۔ بہر حال عہدِ حاضر کے لوگ صرف یہ چاہتے ہیں کہ المیہ کی اثر انگیزی برقرار رہے۔ دیکھنے والوں کے جذبات سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔

کارل: بہر حال میں کردار نگاری کے وقت اس بات کا خیال رکھتا ہوں کہ فلاں بات کسی کو گمراہ کر سکتی ہے اور فلاں بات گمراہ نہیں کر سکتی۔

ٹوکس: پرانے لوگوں کے ہاں کردار کی اپنی فطرت کی تقلید ضروری تھی مگر عہدِ نو میں یہ بات نہیں ہے۔
تھامس: اوہو، یہ بات نہیں ہے۔ ایسا تو وہ اب بھی کرتا ہے۔
ٹوکس: میں تو اسے فطرت کا تقاضہ نہیں سمجھتا۔
تھامس: ہم تو اسے فطرت ہی کہتے ہیں۔
کارل: یہ بات بڑی فلسفیانہ ہے۔

"عوامی لٹریچر"

بریخٹ نے یہ خیالات ۴۱-۱۹۴۰ء میں اپنے ایک مقالہ "ادب میں حقیقت پسندی" کے سلسلے میں قلمبند کئے تھے۔ اس میں اس نے سرمایہ داروں کی استحصال پسندی پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ حقیقت پسندی اس بات کا نام نہیں ہے کہ روزمرہ کی زندگی کی عکاسی کی جائے بلکہ عوام کی زندگی کا وہ رُخ پیش کیا جائے جو داخلی ہے تاکہ عملی اقدامات کئے جا سکیں۔ جن مارکسی نقادوں نے بریخٹ کے خیالات پر تنقید کی ہے وہ درحقیقت بریخٹ کی تحریروں کو سمجھنے میں ناکام رہنے والے لوگ تھے۔

(۱) قلم کے ذریعہ جنگ کرو اور یہ ثابت کردو کہ تم جنگ کر رہے ہو۔ یہی حقیقت پسندی ہے اور حق تمہارا ساتھ دے گا۔ اگر تم نے واقعی حق کا ساتھ دیا، زندگی کی صحیح عکاسی کی اور اصولوں کو نہ توڑا تو یہ حقیقت پسندی ہوگی۔ تم یہ دیکھو کہ کہاں کہاں اصلیت کو چھپایا گیا ہے اور اس پر ملمع کیا گیا ہے۔ تم اس قلعی کو کھرچ دو، ملمع کو اتار دو۔ تم تردیدی رجحان پیدا کرو تمہارے

دلائل حقیقی اور قابل عمل ہوں۔ تم کسی سے خوف نہ کھاؤ۔ عوام کی رائے، ضروریات اور دشواریوں کا جائزہ لے کر ان کا حل تلاش کرو۔ اور تم دیکھو گے کہ اس جنگ میں تم تنہا نہیں ہو بلکہ تمہارے قارئین بھی شامل ہیں۔

(۲) تم خود اپنی غربت کے خلاف جنگ کرو۔ ایک مصنّف کی حیثیت سے تم خود اپنے وجود کو لعنت سمجھنے سے چھٹکارا حاصل کرو اور اپنے تجربات کا مردانہ وار مقابلہ کرو۔

"حقیقت پسندی پر ایک اور مقالہ"

(۱) ایک ادیب کا فرض ہے کہ وہ تمام مزدوروں اور مظلوم و مجبور لوگوں کے لئے قلم کے ذریعے سے جنگ کرے اور تمام ظلم و استحصال کا پردہ چاک کرے۔

(۲) مگر یہ یاد رہے کہ ان سب باتوں پر عمل کرنے اور بے باکی سے لکھنے کے لئے علم کی ضرورت ہے اور خصوصاً تاریخ و معاشیات کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس معاملہ میں لوگوں کو مصنّفوں سے تعاون کرنا چاہیئے اور ان کو پوری معلومات فراہم کرنا چاہیئے۔

(۳) مصنفوں کو چاہیئے کہ وہ تحریر کے علاوہ تقریر کے ذریعے سے بھی لوگوں کو سمجھائیں۔ اگر وہ علم کو دوسروں کے لئے حاصل کریں تو یہ بہترین علم ہو گا۔

(۴) بعض مصنّف اپنے تحت الشعور اور شعوری حالتوں کے الجھاؤ میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان کو سلجھانے کا انتظام ہونا چاہیئے اور ان کے تحت الشعور اور شعور کی الجھنیں تعلیمی اشغال کے ذریعہ سے حل ہونا

چاہیئے۔ وہ خود بھی تعلیمی مضامین کی طرف زیادہ توجہ دیں۔
(۵) سرمایہ دار تعلیمی ماحول اور نظام پر اثر انداز رہتے ہیں۔ اس لئے ایک ایسی انسائیکلو پیڈیا کی ضرورت ہے جو خالص سائنس پر مبنی نہ ہو بلکہ اس کا انداز ہلکا پھلکا ہو تاکہ وہ عوام پر اثر انداز ہو سکے۔

"ماسٹر پن ٹیلا اور اس کا ملازم متّی"

بریخٹ نے ۱۹۴۰ء میں ایک ڈرامہ "ماسٹر پن ٹیلا اور اس کا ملازم متّی" کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس کا مرکزی خیال بڑا مؤثر ہے۔ فنلینڈ کا رہنے والا پن ٹیلا ایک بے رحم زمیندار ہے جو استحصال اور ملازموں پر ظلم کرنے میں بے باک ہے لیکن جب وہ شراب پی لیتا ہے تو بڑا انصاف پسند اور آدمیت کا دلدادہ بن جاتا ہے اور اس میں تمام انسانی خوبیاں عَود کر آتی ہیں، اور اس حالت میں وہ اپنے کرتوتوں پر پچھتاتا بھی ہے۔ متّی اس کا ڈرائیور ہے اور اس کے ساتھ رہنے کی کوشش کرنے کے باوجود وہ آقا اور خادم کے تعلق کو برداشت نہیں کرسکتا اور اسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ ہم یہاں اس موقع کا ایک سین پیش کر رہے ہیں۔ جب پن ٹیلا کی بیٹی ایوا کی منگنی ایک سفارتی افسر کے ساتھ ہو رہی ہے۔ اس وقت پن ٹیلا شراب کے نشے میں دُھت ہے اور حقیقت پسند بن گیا ہے وہ اس افسر کو اس کی منافقت اور بے وقوفی کی بنا پر رَد کر دیتا ہے اور اپنی بیٹی کی منگنی متّی سے کر دیتا ہے جس میں اسے آدمیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔

کھانے کے کمرے میں میزیں لگی ہوئی ہیں۔ پادری، وکیل اور ایک منصف کھڑے ہوئے کافی پی رہے ہیں اور سگریٹ کے کش لگا رہے ہیں۔ پن ٹیلا ایک گوشے میں بیٹھا ہوا خاموشی سے شراب نوشی میں مصروف ہے

اور برابر کے حال میں گراموفون کے ریکارڈ پر رقص جاری ہے۔

پادری : سچا عقیدہ بڑی مشکل سے میسّر آتا ہے۔ زیادہ تر لوگ شک میں مبتلا رہتے ہیں۔ میں لوگوں کو جتاتا ہوں کہ خدا کی مرضی کے بغیر ایک دانہ بھی نہیں اُگ سکتا۔ مگر لوگ ہر چیز کی پیداوار کو ایک فطری تقاضہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے ایمان کی خرابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ گرجا نہیں جاتے اور نہ میری تبلیغ پر دھیان دیتے ہیں۔ یہ اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ ان کے پاس دودھ والیوں کی سائکلیں نہیں ہیں بلکہ یہ صرف ان کی خباثت ہے۔ حیرت ہے کہ ایک روز جب مریض کے سرہانے بیٹھا ہوا عقبیٰ کی زندگی پر درس دے رہا تھا تو اس کے گھر والوں نے میری بات کاٹ کر پوچھا کہ کیا تمہارے خیال میں بارش سے آلو کی فصل کو نقصان نہیں پہنچے گا؟ بتاؤ یہ بیہودگی نہیں ہے تو اور کیا ہے۔؟

منصف : مجھے تم سے اتفاق ہے۔

وکیل : ہم لوگ تو خود بڑی مشکل میں مبتلا ہیں۔ زندگی بڑی دشوار ہوگئی ہے۔

منصف : ہاں، آپ کے لئے یہ زمانہ صرف تجارتی زمانہ ہے۔ ہر چیز مصنوعی ہے اور روایات زوال پذیر ہیں۔

وکیل : پن ٹیلا کے کھیتوں میں خودرو پیداوار ہوتی ہے مگر یہ دراصل ایک غیر معمولی بات ہے۔

پادری کی بیوی : مسٹر پن ٹیلا آپ کو خود مہمانوں کی خاطر تواضع کرنا چاہیئے۔ دیکھئے وزیر صاحب مس الِوا کے ساتھ رقص کر رہے ہیں اور وہ آپ کو کئی بار پوچھ چکے ہیں۔ (پن ٹیلا کوئی جواب نہیں دیتا)

افسر رابطہ : دیکھئے مسٹر پن ٹیلا۔ یہ خاتون ابھی ابھی وزیر صاحب کو ایک سوال کا کہ "جاز" (JAZZ) کے متعلق کیا خیال ہے، بڑا اچھا

جواب دے چکی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کوئی بھی گرجا کی موسیقی پر رقص نہیں کرتا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

پن ٹیلا: میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں مہمانوں پر تنقید نہیں کرتا (وہ منصف صاحب کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کرتا ہے مگر وہ کوئی توجہ نہیں دیتا، پن ٹیلا مختلف عنوانات پر بحث کرتے ہوئے وزیر کے متعلق ایک فقرہ کستا ہے۔ اس پر تُو تُو میں میں ہوتی ہے اور پن ٹیلا جامے سے باہر ہو کر چیختا ہے)

"تم لوگ نکل جاؤ یہاں سے۔ میں اپنی لڑکی کی منگنی سفیر سے نہیں کرسکتا۔"

افسر رابطہ: تم بے حد جارحانہ حملہ کر رہے ہو۔

پن ٹیلا: میرے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ میں زیادہ برداشت نہیں کرسکتا۔

افسر رابطہ: میں تمہارے اس برتاؤ پر احتجاج کرتا ہوں۔ (یہ کہہ کر وہ باہر نکل جاتا ہے)

پن ٹیلا: جاؤ دفع ہو جاؤ۔

ایوا: یہ باہر کیسا شور ہو رہا ہے۔ وہاں کیا ہو رہا ہے۔

پادری کی بیوی: ارے لڑکی یہاں تو غضب ہو گیا۔

ایوا: آخر کیا ہوا؟

منصف: تمہارے باپ نے اسے بھگا دیا۔ کیا تم کو افسوس نہیں ہے؟

ایوا: ہاں ضرور ہے مگر ہوا کیا؟

پادری: جھگڑا۔

(اتنے میں پن ٹیلا مَتّی کو اپنے ساتھ لیے اندر داخل ہوا۔)

پن ٹیلا: میں نے دنیا کی مکّاری کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور میں بڑی غلطی کرتا اگر میں اپنی بیٹی ایک عیّار سے منسوب کر دیتا۔ وہ عیّار وزیر جسے میں شریف آدمی سمجھتا تھا اور میں مُتّی کو ترجیح دیتا ہوں ۔
(ایلا سے) مجھے امید ہے کہ تم مجھ سے اتفاق کر وگی ۔

کرٹ پنتھس

"نوجوان شاعروں سے خطاب"

کرٹ ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک ادیب اور نقّاد تھا۔ ناشر اس سے مسوّدے پڑھنے کا کام لیتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اس نے پلے تکان لکھا اور ۱۹۲۰ء میں اس کا دیوان "ضیائے انسانیت" (جدید شاعری) شائع ہوا۔ پنتھس نے اس کو اپنے عہد کے جذبات اور الجھنوں کا آئینہ قرار دیا ہے۔ اس نے اپنے عہد کے ان لوگوں پر تنقید کی ہے جو مذہب اور اخلاق کے منکر تھے۔ اس کی نظم " نوجوان شاعروں سے خطاب" اس کی عکاسی کرتی ہے۔ کرٹ شاعری کے بلند مقام اور مقام آدمیت پر بہت زور دیتا ہے۔

●

"میں جنگل اور ویرانوں سے گذر کر اس ہال تک آیا ہوں، جہاں آپ لوگ جمع ہیں۔ آپ کے چہروں کی دمک میرے لئے باعثِ مسرّت ہے۔ مجھے بہت سے چہرے جانے پہچانے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ چہرے جن پر اُمید، اُمنگ اور نوجوانی کی جھلک موجود ہے۔ ان چہروں پر مادّی جدوجہد اور روحانی ترقیوں کا زر فروزاں ہے۔ میں آپ ہی لوگوں کی کتابوں کے ذریعے سے ان ہم عصر لوگوں کو جانتا ہوں جن کے نام مجھے یاد نہیں ہیں۔ آپ لوگوں میں شاعر، پروپیگنڈے کے ماہر، عالم و فاضل حضرات، نقّاد اور سیاستداں شامل ہیں۔ مگر آپ سب کو ایک روحانی قوت

نے ابھی تک متحد نہیں کیا ہے اور سچی یکجائی جس کی بڑی شدید ضرورت ہے، مفقود ہے۔ ہم سے پہلے کسی قوم کو اتحاد کی اس قدر ضرورت نہیں تھی جتنی کہ ہم کو ہے کیونکہ ہم چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ میں یہ بات ضرور کہوں گا فرانز بلی صاحب، آپ خفا ہو کر اٹھ کھڑے ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم سطحی طور پر ایک دوسرے سے متفق ہیں مگر ہمیں ابھی گہرائی میں جانے کی ضرورت ہے۔ ہم سب بڑے شہروں کے رہنے والے ہیں اور وہی لکھتے ہیں جو ہم دیکھتے ہیں۔ ہم نے جنگ سے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ کہ ہم میں جو اتحاد پیدا ہوتا ہے اس کی بنیاد مقصد کی یکسانیت ہوتی ہے۔ ورنہ وہ صرف اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ ہم سب ایک ہی شہر میں رہتے ہیں۔ دراصل ہم ایک دوسرے کے احساسات وجذبات سے واقف اور متفق ہوتے ہیں اور جب ہم مقصدیت کی طرف آتے ہیں تو دُور دراز کے رہنے والے روسی، اطالوی، فرانسیسی اور دیگر ممالک کے رفقاء ایک ہی برادری کے رکن معلوم ہوتے ہیں۔

یہ بات اطمینان بخش ہے کہ آپ لوگوں نے سیاست میں دلچسپی لینا شروع کر دی ہے اور اس بات کو ذہن نشین کر لیا ہے کہ موجودہ سیاست "حقیقی سیاست" نہیں ہے۔ یہ قطعی درست ہے۔ ہم کو اس سے بہتر اور شریفانہ سیاست کی ضرورت ہے۔ اس سیاست میں آدمی وقت کے تقاضوں کے مطابق نہیں بدلتا بلکہ وقت کے تقاضے آدمی کی مرضی کے مطابق بدلتے ہیں۔ وہ حالات کو بہتر بنانے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ یہ بڑا ظلم ہے کہ بدلتے ہوئے حالات کو خدا کی مرضی قرار دیا جائے۔ جو بات عظیم تر ہے وہ ریاست کا بڑا پن نہیں بلکہ فرد کا بڑا پن ہے، ملک کی خوش حالی نہیں بلکہ فرد کی خوشحالی ہے۔ اس لئے کہ "فرد" ہی تو سب سے اہم شے ہے، خصوصاً آپ کے فن کے لئے۔ اس لئے کہ وہ فن آخر اسی کے متعلق تو ہوتا ہے

اور آپ کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ آپ دل لگتی بات کہیں مگر عملی طور پر آپ لوگ " فن برائے فن " سے آگے نہیں بڑھتے اور فرد کو اس کے فرائض سے آشنا نہیں کرتے اور نہ خود یہ محسوس کرتے ہیں کہ خود آپ کا انسانی برادری میں کیا مقام ہے۔ جہاں تک ماضی اور حال کی روحانی اور مادّی اَقدار کے فرق کا سوال ہے، ہم نے روحانی اَقدار سمجھنے میں شدید غلطی کی ہے اور اپنے حال کو سنوارنے کے بجائے اسے بالکل برباد کر دیا ہے بلکہ اسے اس طرح بگاڑا ہے کہ سنوارنا بھی دشوار نظر آتا ہے۔ روحانیت کے نام پر جنگیں لڑی گئیں اور انسانیت تباہ ہوگئی۔ ہم نے تاریخ کو مسخ کر دیا، اپنی پُرانی تہذیب سے منہ موڑ لیا اور اپنی معاشی حالت خراب کر لی۔ بہر حال کام کچھ اس طرح بگاڑا کہ سنورنا مشکل ہو گیا ہے اور فرد نے روحانی طور پر رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے اپنے آپ کو سرمایہ داری اور استحصال پسندوں کے حوالے کر دیا اور بھوک کا شکار ہو گیا۔

آدمی کو سب سے بڑی جنگ تو خود اپنی ذاتی خرابیوں سے کرنا پڑتی ہے اور اسی پر ہنز جج مین نے بھی زور دیا ہے اور اپنی کتاب (DER MENSCH IN DER MITTE) میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ اس اندرونی شر کو انسانیت کے لئے لاوا قرار دیتا ہے۔ اس کے برخلاف کارل سٹرن ہیم صاف اور واضح طور پر سوشلزم کی طرفداری اور سرمایہ داری کے خلاف لکھتا ہے۔ فرینز درنیل ذرا مختلف ہے وہ خود آگہی، نرم مزاجی اور سخاوت کا درس اس طرح دیتا ہے کہ گویا یہ بات اس کے لبوں سے نہیں بلکہ دل سے ادا ہوئی ہے۔

فرینز پیمفرٹ اپنے رسالے "ایکشن" (عمل) میں اس بات پر زور دیتا ہے کہ جب تک کوئی شخص حالات حاضرہ سے باخبر نہ ہو سیاست کی بات کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔ جو ہنز آر بیکر کا پیغام یورپ کے لئے پیامِ اتحاد ہے ـــــــ

یون ہارڈ فرینک اپنی کہانیوں میں ان لوگوں پر شدید تنقید کرتا ہے جو جنگ کے ذمہ دار تھے۔ ریینے شیکل ان لوگوں کی تصویر کشی کرتا ہے جو اقوام کی باہمی جنگوں کا شکار ہو گئے۔ وُدلفن اسٹائین بھی انسانی برادری کے لئے نوحہ خواں نظر آتا ہے۔ میکس براڈ انسانیت کا علمبردار ہے۔ ہیسن کلیور سیاسی نغموں اور ڈراموں کو جنم دیتا ہے اور یہی انسانی برادری کا سب سے بڑا انقلاب ہے۔
نوجوان شعراء! آپ بھی تو یہی کام کر رہے ہیں اور آپ کی تصانیف بھی انہی جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ہماری جوانی کے زمانہ کا مشاہدہ ہی تھا جس نے ہم کو انسانی برادری کی بہبود و فلاح کے لئے انقلاب لانے کی دعوت دی تھی۔ اور ہم نے دکھی انسانیت کے لئے اخوت، آزادی اور ہمدردی کے جذبات اُبھارنے کی کوشش کی تھی۔ محبت، ذمہ داری، خوشی اور عدل کا درس دیا تھا۔
جوان شعراء اور ادیبوں کو اس بات کا غم نہیں کرنا چاہئیے کہ لوگ ان کی تحریروں کو لایعنی اور دقیق قرار دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے خیالات میں کوئی خیالی جنت بسائی ہے۔ یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ دنیا کے تمام قیمتی خیالات اور ادبی شاہکار اپنے ابتدائی دور میں گمنامی کا شکار رہے ہیں اور ان کو جاننے والے اور سمجھنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ دنیا کے عظیم نظریاتی انقلابات یونیورسٹیوں سے نہیں بلکہ افراد کے ذہن سے پیدا ہوئے اور اسی حقیقی سیاست کا لوگوں نے شروع میں ہمیشہ مذاق اڑایا۔
اس قضیہ کا فیصلہ کہ عوام شروع میں اپنے منکرین کا مذاق اڑاتے ہیں، فریڈرک شلیگل نے یہ کہہ کر کیا تھا کہ عوام کی خاطر مصنفین کو سطحی تحریریں نہیں پیش کرنا چاہئیے۔ جرمن عوام کو یہ شکایت رہی ہے کہ اس کے مصنفین صرف خواص کے لئے لکھتے ہیں۔ مگر یہ اعتراض کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ جن لوگوں نے اس اعتراض کے خوف سے اخبارات اور رسائل میں آسان لکھنا شروع کیا انہوں نے لوگوں کی قوتِ فکر اور آزادیٔ افکار کو نقصان پہنچایا۔ شاید آپ کو یہ بات

یاد ہوگی کہ ایتھنز کے رہنے والے عظیم فلسفی سقراط نے اگرچہ کوئی تحریر اپنے پیچھے نہیں چھوڑی مگر پورے یورپ میں اس کا فلسفہ تین سو برس تک رائج رہا اور آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ وہی روسو جس کی کتابیں پڑھنا منع تھا اور پیرس میں اس کی کتابیں سڑکوں پر جلائی گئی تھیں، اس سے اہلِ پولینڈ نے اپنا دستور بنانے کے لیے تاثر لیا تھا۔ اور آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ وہی کارل مارکس جس کو جلاوطن کر دیا گیا تھا تمام دنیا میں ذہنی انقلاب کا باعث بن گیا اور اس نے ایک نئے انسانی معاشرے کو جنم دیا۔ اس لئے آپ کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ عام لوگوں کے ذہنوں کو طاقت اور ہتھیار بیدار نہیں کرتے بلکہ خیالات بیدار کرتے ہیں۔

سب سے پہلے جو کام آپ نے کیا اور آپ کو کرنا چاہیئے تھا وہ یہ تھا کہ عوام میں نثر اور نظم کے ذریعہ سے آزادیٔ فکر اور حقیقت پسندی کا جذبہ پیدا کیا جائے ــــــ یہی کام تھا جس کے خلاف چند لوگوں نے ہمیشہ آواز اٹھائی ہے۔ ہاں مگر آپ تو اس سے واقف ہیں کہ آرٹ صرف عکاسی اور تصویر کشی کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے اندر روح اور جذبے کا کارفرما ہونا بھی ضروری ہے۔ نظم اور نثر سے یہ کام لینے کے بعد ڈرامے کی طرف بھی جو ضروری توجہ دی گئی ہے وہ مقصد کی تکمیل کے لئے مفید ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے اپنے بچپن میں تھیٹر سے جو تاثر لیا تھا، وہ خود آپ کے اپنے تجربوں اور مشاہدات سے بھی زیادہ قبیح ہے۔ بہرحال آپ کا کام یہ ہے کہ آپ اپنے مقاصد کو مؤثر زبان کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچائیں اور آپ اپنی کتابوں کے ناموں کا اعلان ان کی افادیت کی بنیاد پر کر سکیں۔ آپ کا مقصد بنیادی طور پر ہمیشہ یہی ہونا چاہیئے کہ انسانی معاشرے کے لئے بہتری اور بھلائی کے راستے کھولیں، اور ان سے وہی کہیں جو ان کے لئے مفید ہو۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ اب آپ میں ایسے لوگ بڑی تعداد میں موجود ہیں جو اس کام کو بخوبی انجام دے رہے

ہیں۔ ہم خوبیوں کی بنیاد پر آج بھی روس کے افسانہ نگاروں والٹ دھٹ مین کے محبت بھرے نغموں اور گوئٹے کے اقوال کو یاد کرتے ہیں۔ یہ ایک اچھی علامت ہے کہ بڑی عمر کے لوگ بھی ہمارے ہمنوا بنتے جارہے ہیں۔ ان قابلِ ذکر لوگوں میں ہنیرچ مین، تھیوڈور، ڈوبلر، پال، ایڈلر، فرٹیز اور دان انزو قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیا کو درسِ امن دیا ہے اور خون خرابوں کی مذمّت کی ہے۔

افلاطون کی ریاست سے لے کر کلوپ اسٹاک کی "سیاستِ دانشمنداں" تک اور گوئٹے کی تصنیف سے لے کر جارج سینٹ کی تصانیف اور رینان کی تحریروں تک، ان میں ہمیں ایک ہی طرح کی تحریک کارفرما نظر آتی ہے۔ انیسویں صدی کے سیاسی سناٹے ہوں یا نپولین کے ہنگامے، لیکن جو بات جرمنی کی تحریک میں موجود ہے وہ اور کہیں نہیں ہے۔ دنیا والے یہ بات نہیں بھول سکتے کہ جرمنی میں ۱۸۰۷ء سے لے کر ۱۸۴۸ء تک جس طرح کی دستور ساز اسمبلیوں نے کام کیا وہ اپنا جواب آپ تھیں۔ جو لوگ مضحکہ اڑانا چاہتے ہوں وہ اڑائیں لیکن حقیقت بہر عنوان حقیقت ہے۔

اے نوجوان شاعرو! سائنسدانو! اور سیاست دانو! آپ آج پھر ایک جگہ جمع ہیں اور میں آپ کو ایک رہبرِ انسانیت، اخوّت، راحت، روحانیت اور محبت کا سبق یاد دلانا چاہتا ہوں۔ وہ قدیم خیالات جو آپ کی نظم و نثر اور ڈراموں کے ذریعے سے لوگوں کے دلوں میں آگ لگاتے ہیں ایک دن یقیناً کامیابی کا سبب بنیں گے۔

الفرڈ ڈبلن

"برلن الیگزنڈر پلیٹ"

الفرڈ ڈبلن (۱۸۷۸ء تا ۱۹۵۷ء) ایک ڈاکٹر تھا۔ اس کی سیاسی دلچسپیاں سوشل ڈیموکریٹ پارٹی سے وابستہ تھیں۔ ۱۹۳۳ء میں وہ ترک وطن کر کے فرانس چلا گیا جہاں اس نے طویل عرصہ گذارا اور وہیں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اسے جدید ادب میں مضامین کی ندرت اور بوقلمونی کی وجہ سے ایک نمائندہ ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان کی روزمرہ زندگی میں کچھ غیر مرئی قوتیں کام کرتی ہیں جو اس کے خیالات کو ایک خاص رخ پر موڑ دیتی ہیں۔ اسی طرح کی ایک قوت کا مظاہرہ بیسویں صدی کے اس اتحاد میں تھا جو معاشی قوت کے لئے وجود میں آیا تھا۔ ڈبلنگ کا سب سے اچھا ناول "برلن الیگزینڈر پلیٹ" ہے، جو اس نے ۱۹۲۹ء میں لکھا تھا۔ اس ناول میں اس نے مزدوروں کی جدوجہد اور ایک مزدور کارکن فرینز بائبر کلواک کی جیل سے رہائی پر روشنی ڈالی ہے اور پس منظر میں برلن کا عظیم شہر ہے۔ اس ناول کا ہیرو ایک ایسا شخص ہے جو ایماندار نیک اور اچھا شہری بن کر رہنا چاہتا ہے۔ مگر حالات اور ماحول سے مجبور ہو کر وہ ایک غلط زندگی گذارتا ہے۔ جس میں اس کا سب سے بڑا معاون ایک مجرم ہے اور یہی مجرم آخرکار بائبرکاک کی محبوبہ کو قتل کر دیتا ہے۔ یہ حادثہ بائبرکاک کی زندگی کا ایک اہم موڑ بن گیا۔ ڈبلن نے اس ناول میں برلن شہر کی بڑی اچھی مصوری کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ دنیا کے تمام بڑے شہروں کی طرح اس شہر کی اجتماعی زندگی بھی انفرادی زندگی کو کھا جاتی ہے۔ ہم اس کی تحریر سے جو نمونہ پیش کر رہے ہیں، وہ سیاست دانوں کی

ایک ایسی میٹنگ کا منظر پیش کرتا ہے جو ایک سرمایہ دارانہ نظام رکھنے والی مملکت کو اشتراکیت کے نقطۂ نظر سے پرکھتے ہیں۔ اور جو بیک وقت ویمر کی ری پبلک اور دستوری جمہوریت پر بھی تنقید کرتے ہیں لیکن اس ناول کا ہیرو بائبر کاک ان تمام جلسوں میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا اور وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ انسان اپنی زندگی کی جدوجہد میں تنہا کامیاب ہو سکتا ہے۔

●

جرمن ریش ایک جمہوریہ ہے اور اس کے ایک علاقے کورپنیکراسٹار کے ایک گوشے میں ایک جلسہ ہو رہا ہے۔ جس میں کچھ کارکن اور کچھ نوجوان سبز اور سرخ ٹائیاں لگائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ان کے پیچھے کچھ لڑکیاں اور عورتیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ کتاب فروش اپنے کتابچے فروخت کر رہے ہیں۔ ایک مقرر کھڑے ہو کر تقریر کرتا ہے۔

"دوستو اور ساتھیو! ہم اس بات پر غور کرنے کے لئے جمع نہیں ہوئے ہیں کہ ہم ریشٹاغ (اسمبلی) میں کیسے جائیں بلکہ ہم کو تو یہ دیکھنا ہے کہ ہم جرمن قوم کے مسائل اسمبلی کے باہر بھی کس طرح حل کریں اور حقائق پر سے کس طرح پردہ اٹھائیں۔ ہم لوگ خیالی پلاؤ پکانے کے لئے اور باتیں بنانے کے لئے جمع نہیں ہوئے ہیں بلکہ ہم کو یہ سوچنا ہے کہ ہم ریشٹاغ سے باہر رہ کر بھی عوام کی بھلائی کے لئے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ صرف مسائل پر روشنی ڈالنا یا حکومت کی غلطیوں اور خرابیوں کو بیان کرنا ہی کافی نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کا کوئی علاج کیا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خود سوشلسٹوں کی صفوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اس کے اصولوں سے منحرف ہیں اور وہ بھی جو مذہب کو سوشلزم سے وابستہ کر کے اپنے مقاصد کی تکمیل چاہتے ہیں ——— (سامعین میں سے ایک آواز۔

"جناب عالی! میں بڑے ادب سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ ریشٹاغ میں سوشلسٹوں کی اکثریت ہے مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کو کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ وہ اس کام کو کماحقہٗ انجام نہیں دیتے جس کے لئے ووٹ دینے والوں نے ان کو ووٹ دئے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ سوشلسٹوں نے طاقت پر قبضہ نہیں کیا ہے بلکہ طاقت نے سوشلسٹوں پر قبضہ کرلیا ہے") ——— ہم انتخابات میں کوئی حصہ نہیں لیں گے اس لئے کہ انتخابات عوامی مسائل کا حل نہیں ہیں۔ انتخابات میں وقت ضائع کرنے سے تو پکنک منانا اچھا ہے۔ صرف رائے کے ذریعہ سے تو احمق بھی برسر اقتدار آسکتے ہیں اور گدھوں پر ذمہ داریاں لادی جاسکتی ہیں۔ اس لئے میرے ساتھیو! (جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھیں) ہم جرمن قوم کی اس طرح تربیت کریں گے کہ ہماری ہڑتالیں اور ہنگامے ختم ہو جائیں۔ یہ دستوری نظام ہمیشہ مزدوروں کے لئے مصائب کا پیغام لاتا ہے۔ اس لئے ہم کو ایک سماجی عدل قائم کرنے کے لئے کام کرنا ہوگا۔ دستوری نظام ایک سماجی اور سیاسی بیہودگی ہے۔ ہمارا نعرہ ہے "آزادئ عمل اور اپنی مدد آپ کرو"

کیسیمیر ایڈشمڈ

"جُذامیوں کا جنگل"

کیسیمیر ایڈشمڈ (۱۸۹۰ء تا ۱۹۶۶ء) اپنے جذبۂ "اظہاریت" کے لئے مشہور ہے اور بڑے رہنماؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے مضامین اس کے ذہنی رجحانات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ نیشنل سوشلزم کے زمانے میں ایڈشمڈ کی تقریروں اور تحریروں پر پابندی لگادی گئی تھی۔ اس کے آخری زمانے کی تحریریں شاعرانہ مبالغہ سے خالی ہیں۔ اس کا مضمون "جذامیوں کا جنگل" جو اس نے ۱۹۱۵ء میں لکھا تھا، اس کی کہانیوں کے مجموعے میں شامل ہے اس مجموعہ کا نام "دی سِکس ریور ماؤتھ" (THE SIX RIVER-MOUTHS) رکھا گیا تھا۔ اس لئے کہ تمام مصائب، پریشانیوں اور خرابیوں کا منبع ایک نہ سہی مگر ان کا نتیجہ ایک ہے۔ اس کے خیال میں ترک دنیا ہی دنیا کو فتح کرنے کا ذریعہ ہے اور اس کے بعد ایک بہتر اور استوار زندگی کی بنیاد پڑجاتی ہے۔ یہی تجسس اسے جذامیوں کے جنگل میں لے جاتا ہے۔

"جُذامیوں کا جنگل"

جیہان بوڈل ایک زرد خچر پر سوار ایک جنگل میں سے گذر رہا تھا اور احتیاط کے طور پر ایک دمشقی چاقو اپنی پیٹی میں لگائے ہوئے تھا اور اس کے باقی ہتھیار اس کی زین کے دونوں طرف لٹک رہے تھے۔ دو گھنٹے کے بعد اس نے ایک خوفناک چیخ سنی اور دیکھا کہ آدمیوں کا ایک غول دھوپ میں اِدھر اُدھر بھاگتا پھر رہا ہے۔ ان میں سے کچھ پہاڑی پر چڑھ رہے ہیں اور

کچھ لٹھ لئے پھر رہے ہیں۔ جو شخص سب سے آگے ہے وہ ناچ رہا ہے۔ ان لوگوں کے جسم پر چیتھڑے لٹک رہے ہیں۔ کچھ لوگ پہاڑی سے اتر رہے ہیں۔ بوڈل نے اپنا چاقو نکال لیا۔ مگر یہ بہت چھوٹا تھا اور یہ لوگ مکڑیوں کی طرح آہستہ آہستہ اس کی طرف آرہے تھے۔ قریب آنے کے بعد وہ اس کے گرد ناچنے لگے۔ بوڈل نے اپنے خچر کو زمین پر بٹھا دیا اور حملہ آوروں میں سے کئی ایک کو قتل کر دیا۔ اس کا خچر بھی زخمی ہو گیا مگر مرا نہیں۔ بہر حال اس پر سواری کرنا ممکن نہیں رہا۔ آخر یہ پیدل کر گنی پہنچا جہاں کچھ دکانیں تھیں۔ جذامیوں کا لشکر اس کے تعاقب میں تھا۔ آخر وہ ایک اونچے چبوترے پر چڑھ گیا اور اس نے جذامیوں کو قتل کرنے کے لئے فی جذامی کچھ رقم کا اعلان کیا۔ اس کے بعد اس نے دو خوفناک کتوں کا انتظام کیا جن کی دُمیں زمین پر لٹک رہی تھیں۔ یہ تمام چیزیں لے کر وہ سرائے میں آیا اور گویوں کو بُلا بھیجا۔ خود کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ عین اس وقت جب وہ ایک پسندیدہ مچھلی کا ٹکڑا کھانے میں مصروف تھا کہ اچانک ایک راہب اس کے کمرے میں داخل ہوا لیکن سرائے کے مالک نے اس کا راستہ روک لیا۔ بوڈل کسی کو اپنے کھانے میں مخل ہونے کی اجازت نہیں دینا چاہتا تھا۔ مگر راہب نے شور مچانا اور قسمیں کھانا شروع کر دیا اور کہا کہ اگر تم میری بات نہیں سنو گے تو بہت پچھتاؤ گے۔ خیر، بوڈل نے اسے اپنے قریب آنے دیا اور اس نے بوڈل کے کان میں کچھ کہا۔ بوڈل نے اس تجویز کو غور طلب پایا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ جب اسے ایک کمرے میں پہنچایا گیا تو وہاں ایک سترہ سالہ حسینہ نے اس کا استقبال کیا۔ وہ اس قدر خوبصورت تھی کہ بوڈل کو یقین ہو گیا کہ وہ اس علاقہ کی لڑکی نہیں ہے۔ جب اس نے اس کا نام پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کا نام "حسینہ" (BEAUTRIX) ہے اور وہ بازنطینی عورت ہے۔ راہب نے آگے بڑھ کر اس حسینہ کا گاؤن اُتارنے کی کوشش کی مگر بوڈل نے اسے منع

کر دیا اور دو ہزار اشرفی میں اس کنیز کو خرید لیا۔ خچر پر سوار اسے لئے ہوئے گاؤں سے نکل گیا۔ باہر سڑک پر ایک ہجوم کا شور و غل سنائی دیا۔ جھانک کر دیکھا تو ننگے مرد اور ننگی عورتوں کا ایک جلوس تھا۔ جو دیوانہ وار گاتے ناچتے اور اُچھلتے کودتے چلے جار ہے تھے۔ یہ جذامی تھے۔ "حسینہ" ان کو نیم عریاں دیکھ کر شرما گئی۔

بوڈل نے ایک نہایت حسین اور شرمیلی لڑکی کا سودا کیا تھا اور وہ اس سودے پر خوش تھا۔ بوڈل نے اسے سہارا دے کر اپنے سامنے خچر پر بٹھایا ہوا تھا۔ بوڈل کے خوفناک کتے آگے آگے دوڑ رہے تھے۔ اب یہ لوگ جذامیوں کے جنگل میں سے گذر رہے تھے۔ بوڈل کو اب جذامیوں کا خیال بھی نہیں تھا وہ محسوس کر رہا تھا کہ حسینہ کا جسم حیا کی وجہ سے بھبک اٹھا ہے۔ وہ اسے بار بار چوم رہا تھا۔ شام کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ اب ایریس شہر کا پھاٹک اور جذامیوں کا جنگل پیچھے رہ گئے تھے۔ اس نے "حسینہ" کو اس حسین منظر کی طرف نہایت شاعرانہ انداز میں متوجہ کیا۔ مگر اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ ریکارڈی کے علاقے کا سب سے اچھا شاعر ہے۔ گھر پہنچ کر اس نے حسینہ کو اپنی آغوش میں لے کر اتارا اور اندر ایک بڑے کمرے میں ایک شاندار پلنگ پر بٹھا کر کہا۔ "یہ پلنگ اور یہ جگہ تمہاری ملکیت ہے۔" پھر اس نے اپنے کپڑے بدلے اور وہ ایک پڑوسن سے ملنے کے لئے باہر چلا گیا۔ پڑوسن گھر میں نہیں تھی۔ اس کی ملازمہ نے بتایا کہ وہ چرچ گئی ہوئی ہے بوڈل گرجا پہنچ گیا۔ وہ عورت عبادت سے فارغ ہو کر گرجا سے باہر آرہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ایک مے خانے میں چلا گیا۔ شراب پی۔ کچھ اور لوگ بھی آ گئے تھے۔ اس عورت نے ایک گانا گایا۔ نشہ کی حالت میں لوگوں نے واقعات دہرانے شروع کئے اور گذشتہ روز کی یہ بات بھی دہرائی گئی کہ ایک پادری نے اس عورت سے یہ کہا تھا کہ وہ اپنے بال کٹوا دے اور کلیسا

میں داخل ہو جائے۔ اس تجویز پر یہ عورت برہم ہو گئی اور اس نے جھک کر اس کا کان کاٹ لیا لیکن اس داستان سے قطع نظر اسے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ یہ عورت (اس کی محبوبہ) بے وفا ہے۔ اس نے اس کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور یہ سوچ کر چھوڑ دیا کہ اس کے علاوہ بھی اور عورتیں ہیں۔ ان میں سے جو اس کا ساتھ دیگی اسے وہ مکان دیدے گا جس میں عورت کو رکھا ہوا ہے۔
اسی اُدھیڑ بن میں رات بیت گئی۔ راستہ میں اس نے ایک تاجر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اس سے کہا کہ وہ بہت نفیس قسم کے کپڑے پہنچا دے۔ پَو پھٹنے کے وقت وہ واپس گھر پہنچا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور اوپر کی منزل پر گیا۔ کمرے کا دروازہ کھولا۔ حسینہ بڑی مسہری پر سو رہی تھی۔ اس کے خوبصورت اعضاء صبح کی دھندلی روشنی میں اور بھی دلکش ہو گئے تھے۔ وہ دوپہر تک سوتا رہا اور دوپہر کو جاگنے کے بعد حسینہ کو کھانے کی میز پر بلانے کے لئے گیا۔ اس کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ حسینہ ابھی تک کل کے میلے اور پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ مگر وہ ان میں بھی ایسی شاندار لگ رہی تھی جیسے اس نے ایرانی قبا پہن رکھی ہو۔ جب وہ اس کے قریب پہنچا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں یہ بند گوبھی نہیں کھا سکتی۔ وہ ہنس کر باہر آگیا جہاں تاجر کپڑے لے کر آیا تھا۔ اگلے دن صبح وہ حسینہ کے لئے سرخ پھول اور قیمتی جواہرات لے کر اس کے کمرہ میں آیا۔ حسینہ نے خوش ہو کر اسے اپنا ایک علاقائی گانا سنایا۔ اس کے اگلے دن اس نے حسینہ کو دو عقاب لا کر دئیے، اس کے پاس ٹھہرا اور اسے پیار کیا۔ وہ بھی اس دن اس سے نہیں شرمائی ۔ اس نے اپنا لباس تبدیل کیا اور اس سے گرجا جانے کی اجازت مانگی۔ وہ اس کے ساتھ گرجا گیا جہاں حسینہ نے تینوں قربان گاہوں کے سامنے دعا مانگی۔ جب یہ دونوں واپس ہوئے تو راستہ میں ایک عورت کو دیکھا جو زمین پر اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر "صلیب"

بنائے ہوئے لیٹی تھی۔ اس کے چاروں طرف چار صلیبیں گڑی ہوئی تھیں، جن پر مشعلیں جل رہی تھیں، بھیڑ لگی ہوئی تھی اور راستہ بند تھا۔ اس نے عورت کو پہچان لیا تھا۔ اسی لئے اس نے حسینہ کو اپنے بازوؤں پر اٹھایا اور اس کے اوپر سے پھلانگ گیا۔ مگر وہ جیسے ہی سڑک پر آگے بڑھا اس نے اپنے پیچھے اسی عورت کی چیخیں سنیں جو اُن کا پیچھا کر رہی تھی۔ دروازہ کے قریب آنے کے بعد اس نے حسینہ کو آوارہ اور بدمعاش کہا۔ مگر بوڈل اس شرمائی ہوئی حسینہ کو لے کر اندر گھس گیا۔ وہ رات اس نے حسینہ کے ساتھ گذاری اور کبھی کبھی ایسی راتیں وہ اس کے ساتھ گذارتا رہا۔ صرف اس وجہ سے کہ راتیں طوفانی تھیں۔ ایک دن شدید طوفان آیا تو حسینہ نے خوف اور وارفتگی کے عالم میں خود کو بوڈل کے سپرد کر دیا۔ وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔ اگلے روز بوڈل ایک کام سے شہر سے باہر گیا۔ واپسی تک حسینہ دروازہ پر اس کی منتظر رہی۔ بوڈل نے اسے انعام کے طور پر ایک خوبصورت طوطا اور اچھی گھوڑی عنایت کی۔ کئی دن بعد وہ شکار کو گئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں دو دو عقاب تھے۔ شکار کے دوران ایک عجیب بات ہوئی اور وہ یہ کہ ایک عقاب آسمان کی طرف بلندیوں میں غائب ہو گیا۔ حسینہ گم سُم تھی۔ بوڈل نے اسے پیار کیا اور اسے لے کر گھر روانہ ہو گیا۔ روانگی کے وقت بوڈل نے حسینہ کا دستانہ اتار کر اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا تھا اور وہ دستانہ وہیں گر گیا تھا۔ راستہ پر چاروں طرف گھوڑ سوار مسافر موجود تھے۔ حسینہ آگے آگے تھی۔ اچانک بوڈل نے دیکھا کہ ایک نوجوان حسینہ کے قریب آ کر اسے اس کا دستانہ دے رہا ہے۔ بوڈل گھوڑا دوڑا کے اس کے قریب پہنچا۔ نوجوان حسینہ کو بڑی محبت سے دیکھ رہا تھا اور اس نے دستانہ واپس کرنے سے پہلے دستانہ کو چوما تھا۔ یہ نوجوان ایک نواب زادہ تھا جس کا نام جیرارڈ تھا۔ بوڈل بھی ساتھ ساتھ چلنے لگا اور اس نے موقع پا کر نواب زادہ کو زخمی کر دیا۔ حسینہ نے وجہ

دریافت کی تو اس نے بتایا کہ اس نے تمہارے دستانہ کو چوما تھا۔ اس بات کا حسینہ پر بڑا اثر ہوا اور اس نے محسوس کیا کہ وہ اسے کس قدر چاہتا ہے۔ آج تک بوڈل ایک کمرے میں سونے کے باوجود اس کے لئے اجنبی تھا مگر آج اس نے غسل کیا، عطر لگایا اور ایک دلہن کی طرح شبِ عروسی منائی۔ سات دن تک وہ رنگ رلیوں میں مصروف رہے۔ ساتویں دن بوڈل نے آئینہ دیکھا تو اپنے آپ کو بے حد بدلا ہوا پایا۔ اس کے جسم پر دھبے پڑ گئے تھے اور وہ اداس ہو کر اپنے خیالات میں غرق ہو گیا۔ دن ڈھلا، شام ہوئی اور رات ہو گئی۔ حسینہ نے لاکھ دروازہ پیٹا مگر اسے خبر نہ ہوئی۔ چنانچہ تھک ہار کر وہ اپنے بڑے پلنگ پر سو گئی۔ آج وہ حیران بھی تھی اور مایوس بھی۔ وہ اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا کر روئی۔

چوبیس گھنٹے تک اسی حالت میں رہنے کے بعد وہ اچانک چونکا اور اس نے غیظ و غضب کے عالم میں تمام سامان کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ تلوار سے تمام پردوں کے ٹکڑے کر دئے اور پھر کمرے میں تنہا لیٹ گیا۔ وہ برابر زمین پر کروٹیں بدلتا رہا اور بوڑھی خادمہ اس کے جسم پر عسقلان کی پیاز کا عرق ملتی رہی۔ آخر وہ پھر اٹھا۔ حواس پر قابو پایا اور کچھ لکھنا شروع کیا۔ حسینہ نے اسے لاکھ مخاطب کیا مگر اس نے ایک نہ سنی۔ حسینہ نے اسے ایک خط لکھا مگر اس نے ہنس کر ٹال دیا اور جواب میں اُسے ایک بند گو بھی بھیج دیا۔ جو اس بات کی علامت تھی کہ اس کی محبت مر چکی ہے۔ اگلے دن وہ اچانک حسینہ کے کمرے میں گیا۔ وہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ بھوک اور غم نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر بوڈل کو دیکھا اور اُٹھ کر اس سے ہم آغوش ہونا چاہا مگر بوڈل نے اسے پرے ڈھکیل دیا اور باہر چلا آیا۔ حسینہ نے غصہ سے اپنے ہونٹ کاٹ لئے۔ اس کے بعد اس نے مردانہ لباس پہنا، ہتھیار لگائے

اور گھر سے نکل گئی۔ ادھر بوڈل پر ایک جنون سوار تھا۔ وہ بار بار اپنے جسم کو دیکھتا تھا اور بیزار ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ اسے جذام کی بیماری ہو گئی تھی۔ اب نہ وہ حسینہ کے قابل تھا نہ شہر میں رہنے کے۔ اس نے آخری بار بھرے گھر پر ایک نظر ڈالی اور اس مسہری پر بھی جہاں اس نے حسینہ کے ساتھ تین مہینے دادِ عیش دی تھی ۔ پھر وہ گھر سے نکل کر "جذامیوں کے جنگل" کی طرف روانہ ہو گیا۔ انہی جذامیوں میں شامل ہونے کے لئے جن کی موت پر اس نے انعام مقرر کیا تھا۔ جب وہ جنگل کے قریب پہنچا تو اس نے اچانک ایک جھاڑی میں سے ایک عورت کی چیخ سنی اور ایک لمحہ کے بعد اس کے سامنے "حسینہ" کھڑی ہوئی اس سے پوچھ رہی تھی۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں؟" بوڈل نے جواب دیا۔ "جذامیوں کے جنگل میں" حسینہ نے کہا۔ "مجھے بھی ساتھ لے لو۔" بوڈل نے اپنا سینہ کھول کر دکھایا جس پر کوڑھ کے داغ تھے۔ حسینہ نے جواب دیا۔ "مجھے ان سے کوئی پریشانی نہیں ہے۔" بوڈل نے کہا۔ "نہیں۔" مگر اس نے بڑھ کر بوڈل کا بازو پکڑ لیا اور کہا۔ "میں چاہتی ہوں مجھے بھی تمہاری طرح کوڑھ ہو جائے۔" بوڈل نے کہا۔ "یہ تم کیا کر رہی ہو؟" حسینہ نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا اور کہا۔ "کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم سب سے پہلے آدمی ہو جس نے مجھ سے پیار کیا۔ میرے ساتھ سوئے اور مجھے لاڈ سے عقاب کہہ کر پکارا۔ اب تم مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو۔ مجھے ساتھ لے چلو۔" یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر لپٹ گئی۔ مگر بوڈل نے اسے "ہٹ جاؤ اے کنیز" کہہ کر دھکا دے دیا۔ حسینہ کے دل اور جسم دونوں کو دکھ پہنچا۔ وہ بڑی روتی رہی، سسکتی رہی اور بوڈل "جذامیوں کے جنگل" میں چلا گیا۔

جارج کیزر

"جنگ ہارنے کے بعد"

جارج کیزر (۱۸۷۸ء تا ۱۹۴۵ء) کا ضخیم کارنامہ اسے جرمن ادب میں بلند مقام دینے کے لئے کافی ہے۔ ۱۹۳۳ء میں اس کے ڈراموں پر پابندی لگادی گئی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں وہ نقل وطن کر کے سوئٹزرلینڈ چلا گیا۔ اس کی تصانیف کا لب لباب یہ تھا کہ اس مشینی دنیا اور سرمایہ دارانہ نظام میں شخصی آزادی کہیں گم ہو گئی ہے۔ اس نے ان بربادیوں کی تصویریں بھی کھینچی تھی، جو پہلی جنگ عظیم کا نتیجہ تھیں۔ وہ ایک انسان دوست مصنف تھا اور ایک پرامن، آزاد اور خوشحال زندگی کا متمنی۔ اس نے ہٹلر کے عروج پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

"جنگ ہارنے کے بعد"

جنگ ہارنے کے بعد پوری قوم افلاس، بھوک اور بربادی کا شکار ہے۔ ہر طرف مایوسیوں کا دور دورہ ہے۔ ایک قومی لیڈر بڑھ کر آگے آتا ہے، وہ لوگوں کو پکارتا ہے اور ان سے اپیل کرتا ہے کہ اگر وہ کھوئی ہوئی تمام خوشیوں کو واپس لانا چاہتے ہیں تو اقتدار اس کے حوالے کر دیں۔ شروع شروع میں لوگ اس کی شیخی کو نظر انداز کر دیتے ہیں مگر جب اس کے دعوے بلند تر اور اس کی آواز موثر بننے لگتی ہے تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور خصوصاً وہ لوگ جن کے پاس کھونے کے لئے اب کچھ نہیں رہا ہے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے اس کا ساتھ دینا شروع کر دیتے ہیں اور ایک نئے دور کا آغاز ہو جاتا ہے اور وہ شخص برسر اقتدار آجاتا ہے لیکن عوام جلد ہی یہ بات

محسوس کر لیتے ہیں کہ اس لیڈر نے ان کے ساتھ کئے ہوئے وعدوں میں سے کوئی وعدہ بھی پورا نہیں کیا۔ مگر اب وہ اس قدر طاقتور ہے کہ اس کے خلاف کھل کر کچھ کہنا تو درکنار سرگوشی کرنا بھی مشکل ہے۔ یہ تو ایسی حالت ہے جیسے کسی ٹرک کے پہیئے نکل جائیں اور اسے روکا نہ جا سکے تو وہ یقیناً کسی دیوار سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتا ہے۔ لوگ اب پھر آزادی کے لئے بے چین ہیں اور محلاتی قوت کو پاش پاش کرنا چاہتے ہیں۔

محلاتی سازشوں کا قلع قمع کرنے والے لوگوں کا وہی لیڈر ایک بار پھر سامنے آتا ہے، جوشیلی تقریریں کرتا ہے اور گرفتار ہو کر جیل چلا جاتا ہے۔ جب وہ رہا ہوتا ہے تو لوگوں کا پسندیدہ ہیرو بن چکا ہوتا ہے اور جب پھر اس کے چہرے سے نقاب اٹھتا ہے تو وہ ایک بار چولا بدلنے کی فکر کرتا ہے۔ کبھی فلم ایکٹر بننے کی سوچتا ہے اور کبھی صوفی بننے کی۔ بہر حال اس دور میں ایک لیڈر چولے بدل بدل کر ہی اپنا مقصد حاصل کرتا ہے۔ وہ وعدے اس لئے نہیں کرتا کہ ان کو پورا کرے۔

تھامس مان

تھامس مان (۱۸۷۵ء تا ۱۹۵۵ء) لوبک کے ایک خوشحال گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ ۱۹۰۰ء تک وہ ایک آزاد مصنف کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ ۱۹۳۳ء میں وہ چیکوسلوویکیہ چلا گیا۔ وہاں سے سوئٹزرلینڈ اور اس کے بعد امریکہ۔ جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد وہ کئی مرتبہ جرمنی گیا اور ۱۹۵۲ء میں سوئٹزرلینڈ میں مقیم ہو گیا۔ اس صدی میں جرمن زبان نے اس سے بڑا ادیب پیدا نہیں کیا۔ اس کے ہاں قصہ اور کہانیوں میں حقائق کی جھلک موجود ہے۔ وہ طنز میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اس کی ابتدائی تصانیف کا بنیادی خیال آرٹسٹ اور درمیانی طبقہ کے درمیان کا تضاد تھا۔ وہ فن اور روحانی ترقی کی ایک نئی تفسیر پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے تمام رجحانات کا جائزہ لے کر اور یورپ کے ثقافتی ورثہ کو سامنے رکھ کر ہی تمام مسائل کا تجزیہ کرتا ہے۔ وہ نیشنل سوشلزم کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ اس کی کتاب "بڈن بروکس" کے علاوہ بھی اس کی کتابیں جن میں "دی میجک ماؤنٹین" (۱۹۲۴ء)، "یوسف اور ان کے بھائی" (۱۹۳۳ء تا ۱۹۴۳ء) اور "ڈاکٹر فوسٹاس" (۱۹۴۷ء) شامل ہیں، بہت اہم تصانیف ہیں۔

"بڈن بروکس"

تھامس مان کے ناول "بڈن بروکس" کا دوسرا نام "ایک کنبہ کی تباہی" بھی ہے۔ اس ناول میں لوبک کے ایک تاجر خاندان کی چار پشتوں کی داستانِ عروج و زوال بیان کی گئی ہے۔ امرار کی نمائندگی "ہنو بڈن بروکس" کے کردار میں پیش کی گئی ہے۔ بروکس بڑا نازک مزاج فنکار ہے اور یہی بات

اس کو معاشرے سے ہم آہنگ نہیں ہونے دیتی۔ ۱۹۵۰ء میں تھامس نے یہ بات کہی تھی کہ میں نے اس ناول میں خود اپنی اور اپنے کنبہ کی داستان کو پیش کیا ہے ۔ مجھے اس وقت اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ میں نے درمیانی طبقہ کی ترجمانی کی ہے اور سماجی تاریخ کے ایک اہم پہلو کی نشان دہی اس ناول میں موجود ہے۔ بہر حال اس ناول میں اس کشمکش کو نہایت خوبی سے پیش کیا کیا گیا ہے اور اس میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ ایک لڑکی کا رشتہ طے کرنے میں کیا کیا دشواریاں صرف سماجی رسم ورواج کی بنا پر پیش آتی ہیں ۔

" ٹونی سیر کر کے واپس آرہی تھی کہ گرونیخ سے ملاقات ہوگئی۔ ٹونی کے ساتھ فرالین بھی تھا۔ گرونیخ، ٹونی کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ میں کئی دن سے تم کو یاد کر رہا تھا اور تمہاری والدہ کو سلام کرنے بھی گیا تھا۔۔ ٹونی اس کو بے رخی سے جواب دیتی ہے۔ جیسے عموماً لڑکیوں کا انداز ہوتا ہے اور بڑے غرور سے چلتی ہوئی اپنے گھر پہنچ کر کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ یہیں اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اتوار کے روز گرونیخ کی دعوت کی گئی ہے۔

گرونیخ کھانے پر آیا۔ وہ معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ مگر اس کی مونچھیں اور مردانہ وقار نے اس کو پُرکشش بنا دیا تھا۔ کھانے کی میز پر بہت سے کھانے چُنے تھے۔ مگر اس نے مچھلی، کرم کلّا اور گھی میں تلے ہوئے آلو پسند کئے۔ اس نے کھاتے کھاتے نظر اٹھائی، برتن پر بنی ہوئی ایک تصویر کو دیکھا اور گویا ہوا۔" خدا معاف کرے آج تو میں نے بہت کچھ کھا لیا۔ مگر یہ حلوہ تو واقعی بہت لذیذ ہے۔ میں اپنی میزبان سے درخواست کروں گا کہ یہ مجھے اور دیں۔ اس نے کھانے کے دوران فلم اور فنیشن پر گفتگو کی اور گھر کے سب آدمیوں کی تعریف کی، یہاں تک کہ بیٹی کلیرا کی بھی تعریف کی۔ ٹونی خاموش رہی اور اس نے اپنی منگنی کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ وہ خاصا مایوس معلوم ہوتی تھی۔ گرونیخ نے ذرا سی دیر میں ٹونی کے سوا سب کے دل

جیت لئے تھے۔ اس کی سہیلی اور اس کی اپنی بہنوں کی رائے میں گردیخ بڑا اچھا نوجوان تھا۔ ٹونی نے سب کو بیزاری سے خدا حافظ کہا اور کمرے میں چلی گئی۔

ایک بار گردیخ صبح کے وقت آیا۔ ناشتہ کی میز پر سب موجود تھے اور الگ الگ اپنی پسند کے رسالے پڑھ رہے تھے۔ گردیخ نے ٹونی سے پوچھا کہ کیا تم کو میری پسند کے رسالے اچھے نہیں معلوم ہوتے؟ اس نے کہا۔ "بالکل نہیں"۔ وہ اسی طرح برابر آتا رہا۔ مگر ٹونی نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور آخر ایک دن وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے کہا کہ "یہ شخص کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ میں تو اسے جانتی نہیں"۔ گھر والوں نے سمجھایا کہ آخر بڑے تمہارے بھلے کی بات کرتے ہیں۔ تم اس قدر بیزار کیوں ہو۔ تم ابھی اسے نہیں سمجھ سکتیں۔ اس لئے کہ تم کم سن ہو اور اگر وہ چار دن کے بجائے بادن روز بھی تمہارے قریب رہے تو تم اس کو نہیں سمجھ سکو گی۔ اس لئے تم کو دوسروں پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ ٹونی نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا "میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ میں کچھ نہیں جانتی کہ آخر وہ کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے"۔ سب نے مل کر اسے ایک بار پھر سمجھایا کہ اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ دنیا میں سب کی شادی ہوتی ہے۔ تم بے وقوف نہ بنو۔ لوگ کیا کہیں گے۔ اس نے ماں سے پوچھا، کیا آپ بھی اس بات پر زور دیتی ہیں؟ اس نے کہا "ہاں"۔ اور تمہارے ابا بھی "تم ہاں کرنے سے پہلے غور کر لو"۔ اس کے رویہ کو نرم پا کر سب نے تیاری شروع کر دی مگر ایک دن جب کسی نے پھر ٹونی کی موجودگی میں اس مسئلہ کو چھیڑا تو وہ بگڑ گئی۔ اس نے کہا "یہ کیا بیہودگی ہے میں آخر اس سے شادی کیوں کروں جس کا میں نے ہمیشہ مذاق اڑایا ہے۔ اور وہ کس طرح میرے چین کا باعث ہو سکتا ہے۔ ہر آدمی میں کوئی وجہ امتیاز تو ہونی چاہئیے"۔ یہ کہہ کر وہ اپنے کھانے میں مصروف ہو گئی۔

"شلر پر آخری مضمون"

۱۹۵۵ء میں اسٹٹ گرٹ کے مقام پر شلر کی ایک سو پچاسویں برسی منائی گئی تھی اور اس سلسلے میں تھامس مان نے اس تقریب کے لئے ایک خطبہ لکھ کر بھیجا تھا جس کے آخری حصہ کا ترجمہ ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔ اس مقالہ میں نہ صرف شلر کی عظمت پر روشنی پڑتی ہے بلکہ خود مصنّف کے نظریات بھی واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ مانؔ خود شلر کے قول کے مطابق انسان دوست ادیب تھا۔ وہ تمام دنیا کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ دو عظیم جنگوں کی بربادی سے سبق لے اور ہوش میں آجائے۔ اب اس دنیا کو امن اور انسانیت کی شدید ضرورت ہے۔ انسان کو خود اس کی اپنی تباہکاری سے بچانا ضروری ہے۔

سات سال کے بعد اس نے اپنی کتاب "دالن اسٹائن" میں دلہیلم (WILHELM VON HUMBOLDT) کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا:

"یہ سچ ہے کہ میں جس راہ پر گامزن ہوں وہ مجھے گوئٹے کی حدود میں لے جائے گی اور مجھے اس کا مدِمقابل بنا دے گی۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کی برتری میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور نہ مجھ سے کچھ چھین سکتی ہے۔ ایک اچھا ناقد نہ مجھے گھٹا سکتا ہے اور نہ گوئٹے کو بڑھا سکتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ زندہ رہ سکتے ہیں اور وجود باہمی ممکن ہے۔"

یہ تھے شلر کے خیالات اور یہ گوئٹے کے خیال سے مطابقت رکھتے تھے۔ گوئٹے نے بھی تقریباً اسی طرح کے الفاظ کہے تھے:

"اہل جرمنی اس بات پر اُلجھے ہوئے ہیں کہ میں افضل تر ہوں یا شلر حالانکہ ان کے لئے تو صرف اسی بات سے خوش ہونا کافی ہے کہ ان کو ہم جیسے نوجوان میسر ہیں۔"

جب شلر کا انتقال ہو گیا تو اس کے کچھ دن بعد گوئٹے کی بہو نے ایک روز شلر کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو شلر کو ہمیشہ بور قسم کا مصنف پایا۔" تو گوئٹے نے ناراضگی سے منہ پھیر کر کہا "تم اس کے لیئے بہت تنگدل ہو۔" اب ہم کو یہ سوچ لینا چاہیئے کہ ہم اس کے لیئے تنگ نظری کا مظاہرہ تو نہیں کر رہے ہیں۔

میں نے جب اس کا مقالہ "ہورن کا عوامی اعلان" پڑھا تو محسوس کیا کہ اس نے زمانہ کے ساتھ بدلتی ہوئی قدروں کے باوجود کس قدر چابکدستی سے پرانی اقدار کو نیئے رنگ میں پیش کر دیا ہے اور اس کو عوام کے لیئے سہل اور مفید بتایا ہے۔ اس کے خیال میں تمام اقوام کے افتراق و اختلاف کا صرف ایک علاج تھا اور وہ یہ کہ سب ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں اور وہ جھنڈا "صداقت اور حسن[1]" کا جھنڈا ہو۔ اس کے نزدیک "نفاست، تنظیم، عدل اور امن" بنیادی ضرورتیں ہیں۔ ہم کو اس موقع پر احتیاط برتنا ضروری ہے کہ ہم اس جمالیاتی نظریہ کو فراریت نہ کہہ دیں۔

کارلائل نے شلر کے متعلق لکھا ہے کہ "اس کے دل میں ساری دنیا کا درد تھا اور نہ صرف موجودہ نسلوں کا بلکہ وہ آنے والی نسلِ انسانی کے لیئے بھی مغموم تھا۔" شلر ہم کو جب جدید کہتا ہے تو وہ یونانیوں کی قدامت کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اس کے خیال میں "وطن پرستی" کا جذبہ سماجی زندگی کے صرف ابتدائی دور کے لیئے مفید تھا۔ اس کے خیال میں صرف ایک قوم کے لیئے کچھ لکھنا ذہنی افلاس تھا اور ایک دانشمند کے لیئے یہ حد بندی ناقابل برداشت ہے۔ "کوئی ایک قوم سب سے اہم قوم نہیں ہے بلکہ وہ عالم انسانیت کا ایک حصہ ہے۔ کسی بھی قوم کی ترقی کا ایک قدم عالم انسانیت کی ترقی کا باعث ہونا چاہیئے۔" کارلائل اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا

---

[1] یہاں "حسن" سے مراد نیکی ہے۔ افلاطون کے خیال میں نیکی اور حسن ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

ہے کہ " ہم کو انفرادیت کی بڑی سخت ضرورت ہے اور یہ ماورائیت غیر مفید ہے۔ شِلر کی تصانیف میں جو ہمہ گیر جذبہ موجود ہے وہ اس قوم کے لئے زیادہ مفید ہوتا بشرطیکہ اس میں علاقائی عنصر موجود ہوتا اور دائرۂ اثر محدود ہوتا۔" کارلائل کا زمانہ "قوم پرستی" کا زمانہ تھا۔ اس کے الفاظ جدید تھے مگر خیالات قدیم تھے۔

آج انسانیت کو جو مسائل درپیش ہیں وہ موت اور زندگی کی الجھن بنے ہوئے ہیں۔ آج ہم کو غور کرنا ہے کہ دنیا کی موجودہ حالت کیا ہے۔ ہمارا مستقبل کیا ہے؟ یہ وطن اور قومیت کے جذبات فرسودہ اور پرانے ہیں۔ اب ہمارے خیالات کی بنیاد "انسانیت" ہونی چاہئے۔ دونوں عظیم جنگوں نے انسانی اخلاق اور ذہانت کو تباہ کر دیا ہے۔ ہر طرف غیظ و غضب، خوف اور نفرت کا راج ہے۔

دنیا کی ترقی کے طریقے بدل گئے ہیں۔ دنیا والے فضا کو مسخر کرنے کی فکر میں ہیں اور خلائی اسٹیشن قائم کرنا چاہتے ہیں۔ سورج کی حرارت کو ہتھیاروں کے طور پر استعمال میں لانا چاہتے ہیں، جو ایک مجرمانہ کوشش ہے اور جس سے دنیا نیست و نابود ہو جائے گی۔

شِلر نے اپنی ایک نظم میں سیریس (CERES) کی زبان سے اس بے راہ روی کا مرثیہ کہا ہے جس میں زور دیا گیا ہے کہ انسانیت کی بھلائی اور بہتری کی خاطر بہتر خیالات، اصول اور اخلاق ضروری ہیں۔ جب ۱۸۶۹ء میں شِلر کی سوسالہ برسی منائی گئی تو پورا جرمنی شِلر کے نام پر متحد تھا اور ہر طرف ایک جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ آج بھی منقسم جرمنی کو شِلر کے نام پر ایک ہو جانا چاہیئے۔ چاہے یہ بات خود شِلر کے مِشن کی وجہ سے کی جائے یا امنِ عالم کے پیش نظر۔ بہرحال ہمارے اندر اس کے پیغام کی خوبیوں کو سرایت کرنے کا موقع ملنا چاہیئے۔ اس شِلر کی خوبیاں جو جمالیات، صداقت، نیکی اور اخلاقی

بلندی کا درس دیتا تھا، جو محبت اور امن کا دلدادہ تھا۔

"وینس میں ایک موت"

تھامس مان کا ایک ناول " وینس میں ایک موت " ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں بھی اس نے ایک فنکار اور سرمایہ دارانہ نظام کے طرفدار کے درمیان جو الجھاؤ ہے، اسے واضح کیا ہے۔ اس میں ایک کردار گستاف اشن بیخ ہے جو ایک مصنف ہے اور وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ درمیانی راستہ اختیار کرے مگر اس کے سب اصول اس وقت دھرے کے دھرے رہ گئے جب اس نے وینس کی رقص گاہ "لیڈو" (LIDO) میں ایک حسین لڑکے ٹیڈزیو (TAD-ZIO) کو دیکھا اور اس پر فریفتہ ہوگیا۔ اب اس کو اپنے جذبات اور خواہشات پر کوئی قابو نہ تھا۔ ہم اس کے ناول کے آخری حصہ سے اس کا خواب بیان کر رہے ہیں۔ جس میں اس کی خواہشات کی پوری طرح عکاسی ہوتی ہے۔ وہ آرٹسٹ جس نے ایک بلند مقام حاصل کر لیا تھا خود اپنی نفسانی خواہشات کا شکار ہوگیا۔

اس رات اس نے ایک خوفناک خواب دیکھا۔ بشرطیکہ ہم اس جسمانی اور روحانی تجربہ کو خواب کہہ سکیں، جو اس کو گہری نیند میں حاصل ہوا تھا۔ اس خواب کا تجزیہ تو یہ بتاتا ہے کہ یہ خواب اس کے اپنے خیالات اور خواہشات کا مظہر تھا۔

اس خواب کی ابتدا خوف اور خواہش نظر آتے ہیں۔ وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ ۔" دُور سے خوفناک آوازیں سنائی دیتی ہیں اور خوفناک گرج اور چمک کی کیفیت ہے۔ یہ خواب میں حیران و سراسیمہ ہے اور اس کو ایسی آواز آئی جیسے کوئی کہہ رہا ہے کہ " ایک اجنبی دیوتا آرہا ہے۔" اور پھر اس

نے دیکھا کہ آسمان سے زمین تک اور میدان سے پہاڑوں تک ہر طرف
عجیب و غریب حلیہ رکھنے والے مرد اور عورتیں موجود ہیں۔ مردوں کے
سر پر سینگ اور بال ہیں اور عورتوں کے بال کھلے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے
سینوں کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے ہیں اور ان میں سے بعض شعلیں
لئے ہوئے ہیں جن میں سے شعلے لپک رہے ہیں۔ عجیب و غریب جانور پیشوائی
کر رہے ہیں۔ نقارے گونج رہے ہیں۔ سانپوں کی زبانیں باہر نکلی ہوئی ہیں
خود یہ بھی خواب میں خوف سے کانپ رہا ہے اور اس فکر میں کہ یہ اپنے
پسندیدہ دیوتا کو اجنبی دیوتا سے کیسے بچائے گا۔ اتنی دیر میں ایک پہاڑ نے اسے
نگل لیا۔

جب وہ خواب سے بیدار ہوا تو دیکھا کہ ہر طرف اسی طرح کی چہل پہل
ہے اور کسی نے اس کی خوابیدہ سراسیمگی کا کوئی اثر قبول نہیں کیا ہے اور تو اور
مہمان خاتون بھی بالکل بے تعلق نظر آ رہی تھی۔ یا تو وہ بہت بہادر تھی یا بہت
بے پروا۔ بہر حال اس نے اپنے آپ کو سنبھالا تا کہ وہ اپنے حسین محبوب ٹیڈزیو
کا سامنا کر سکے۔ جس کا نوخیز حسن اس کے لئے ہوش رُبا تھا۔ اس نے بہترین
لباس اور خوشبو استعمال کرنا صرف اس لئے شروع کیا کہ وہ کسی طرح اپنے
بڑھاپے کو چھپا سکے۔ اس کو اپنا محبوب سر بازار نظر آیا، اس نے اس کا پیچھا
کیا، ہر طرف اس کے ساتھ چلا مگر ایک جگہ وہ بالآخر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔
اس نے گلیاں چھان ماریں۔ پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ مگر اس نے
ہمت نہیں ہاری۔ آخر وہ ایک جگہ بیٹھا ہوا نظر آیا اور اس نے اپنی نظروں
کی پیاس بجھائی۔

کچھ دن بعد ایشن بخ ذرا دیر سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ کسی فرانسیسی
کنبہ کا سامان باہر رکھا ہوا تھا۔ وہ اس کے متعلق پوچھنے کے بعد ساحل سمندر
کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاں اس نے دیکھا کہ اس کا محبوب اپنے کیبن کے سامنے

بیٹھا ہے اور ایک اور لڑکا جس کی آنکھوں میں ریت پڑ گئی ہے! اس کے محبوب سے ناراض ہے۔ آخر ان دونوں کے درمیان مار پیٹ ہوگئی اور اس لڑکے نے اس کے محبوب ٹیڈزیو کو زمین پر دے مارا۔ اس نے آگے بڑھ کر بیچ بچاؤ کیا۔ ٹیڈزیو اُٹھ کر سمندر کے کنارے چلا گیا۔ بیخ اسے محبت سے تکتا رہا۔ آخر اس نے بھی اسے مسکرا کر دیکھا اور مارے خوشی کے بیخ کی جان نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد لوگوں کو بیخ کی موت کا علم ہوا جو بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا تھا۔
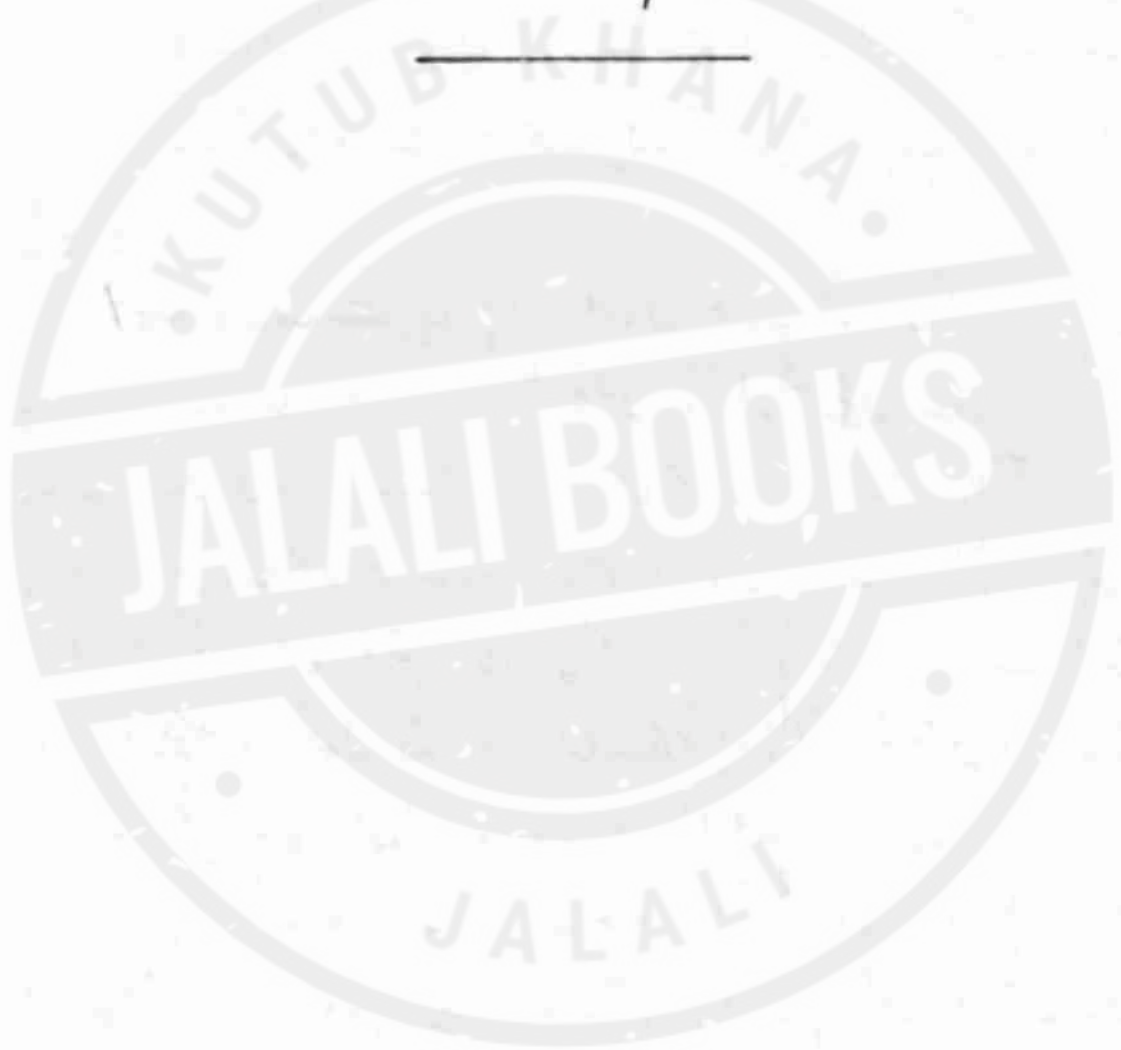
ہینرچ مان

"رعایا"

تھامس مان کا بھائی ہینرچ مان (۱۸۷۱ء تا ۱۹۵۰ء) بھی ایک اعلیٰ درجہ کا مصنف تھا۔ جب اس کی تصانیف پر پابندی لگادی گئی تو وہ ترکِ وطن کر کے جرمنی سے چیکوسلوویکیہ چلا گیا اور وہاں سے کیلیفورنیا۔ اس کے تمام ناول اور افسانے جرمن امراء خصوصاً قیصر کے دور کے امراء اور ویمر کی ری پبلک پر شدید تنقید سے مزین ہیں۔ آخری دور میں اس نے تھرڈ ریش (REICH) کے نازیوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ طنز اس کے اسلوب کی جان تھی۔ وہ انسان دوست سوشلزم کا حامی تھا مگر نیشنل سوشلزم اور ملٹری ازم کا مخالف تھا۔ اس کا ناول "رعایا" (DER UNTERTAN) ۱۹۰۶ء تا ۱۹۱۴ء کے درمیان لکھا گیا تھا اور ۱۹۱۸ء تک مکمل شائع نہیں ہوا تھا۔ اس ناول میں اس نے قیصر ولیم دوئم کے زمانے میں رعایا کی بدحالی کی تصویر کشی کی ہے جس کے ساتھ قیصر اور کلیسا دونوں کا برتاؤ ظالمانہ اور کمزور طاقتور کا شکار بنا ہوا تھا۔ اس نے اس عہد کے آجر اور اجیر کے درمیان تعلقات کی خرابیوں پر روشنی ڈالی ہے۔

"فروری کا زمانہ ہے۔ شدید سردی پڑ رہی ہے اور اس پر طرّہ یہ کہ بارشیں ہو رہی ہیں۔ اِنٹرڈِن لِنڈن اسٹریٹ (جو مشرقی جرمنی میں ہے) پر شمالی علاقوں سے آئے ہوئے بے روزگار غریب لوگ جمع ہیں۔ گھوڑ سوار پولیس پہرہ دے رہی ہے۔ یہ لوگ ننگے سر ننگے پیر تھکے تھکے قدموں سے محل کی طرف رواں ہیں اور سرگوشیوں اور اشاروں میں کچھ فیصلہ کن باتیں کر رہے ہیں۔ اب وہ محل کے سامنے پہنچ گئے ہیں۔ قریب سے گاڑیوں میں امیر مرد اور عورتیں ان کو غور سے دیکھتے ہوئے گذر رہے ہیں۔ یہ لوگ بارش میں منہ اوپر کئے محل کی کھڑکیوں

کوتک رہے ہیں کہ شاید کوئی ان کی فریاد سنے۔ شام ہوتی جارہی ہے اور رات کے سائے پھیل رہے ہیں۔ ڈائڈرچ نے کہا کہ پولیس والے اپنا کام نہ جانے کیوں انجام نہیں دے رہے ہیں۔ دائبل نے جواب دیا۔ "تم فکر نہ کرو پولیس والوں کو معلوم ہے کہ ان کو کیا کرنا ہے۔"

وہ لوگ ایک بار پیچھے ہٹ کر پھر لنڈن اسٹریٹ پر جمع ہو گئے۔ کچھ بچھڑے ہوئے لوگ بھی آملے۔ اور انھوں نے یکجہتی سے کام لے کر اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔ جس پر لکھا تھا "روٹی دو، کام دو" گھوڑ سوار پولیس نے ان پر لاٹھی چارج کیا۔ مگر ان کا نعرہ "روٹی دو۔ کام دو" برابر بلند ہوتا رہا۔

سب لوگوں میں ایک جوش و خروش ہے۔ سرگوشیاں جاری ہیں بحثیں ہورہی ہیں۔ لوگ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں اور اسی دوران وہ دیکھتے ہیں کہ قیصر کی سواری آرہی ہے۔ کچھ لوگ قیصر کا نعرہ لگاتے ہیں اور ڈائڈرچ نے بھی "ہرا" کہا۔ اور برنڈن برگ گیٹ تک پہنچ گیا۔ جہاں قیصر سب کے درمیان سے گذر رہا تھا۔ ڈائڈرچ نے بھی بڑے جوش و خروش سے نعرہ لگایا اور اونچے ہوکر اپنا ہیٹ ہلایا۔ اس وقت وہ تصورات کی دنیا میں کھویا ہوا تھا اور خیالات کے دوش پر سوار اڑ رہا تھا۔ یہ وہ قوت تھی جس کے سامنے غریب جھکتے تھے اور اپنے افلاس و مصائب کو بھول جاتے تھے، اپنی بھوک اور ذلت کو بھول جاتے تھے۔ اس بھیڑ بھاڑ کو قابو میں رکھنے کے لئے پولیس والے نے جو ڈنڈا گھمایا تو وہ ڈائیڈرچ کے سینہ پر لگا۔ اس کا سانس بند ہو گیا لیکن وہ تو قیصر کی فتمندی پر اس طرح خوش تھا گویا خود اسی کو فتح حاصل ہوئی ہو۔ سب چلا رہے تھے "قیصر کی اطاعت کرو۔" سب کے جذبات تقریباً وہی تھے جو ڈائیڈرچ کے تھے۔ مجمع قابو سے باہر تھا۔ پولیس کے انتظام کا بیرونی حلقہ ٹوٹ چکا تھا۔ ڈائیڈرچ پوری قوت سے اگلے حلقے کو توڑ کر قیصر کے گھوڑے کے قریب پہنچ گیا۔

اس کے بال بکھرے ہوئے تھے ۔ پیر گندے تھے ۔ گریبان چاک تھا ۔ وہ قیصر کو دیکھ کر مرعوب ہوگیا اور اوندھا گر پڑا ۔ قیصر ران پر ہاتھ مار کر ہنسا اور اس کو دیکھتا ہوا گذر گیا ۔ ڈائیڈرخ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ۔

ڈائیڈرخ نے شراب کا ایک پیگ پیا اور وہ اپنے بیوی بچوں اور مزدوروں سے ملنے کے لئے فیکٹری کے اسٹور میں گیا جہاں چیتھڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا ۔ مزدور مرد اور عورتیں جمع تھے ۔ اس کے استقبال کے لئے ایک بچی پھولوں کا گلدستہ لئے کھڑی تھی ۔ اس نے گلدستہ قبول کیا اور اپنا گلا صاف کر کے تقریر شروع کی ۔

" حاضرین ! آپ سب لوگ میرے ماتحت کام کرتے ہیں اور میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آئندہ ہم زیادہ تندہی سے کام کریں گے ۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ تجارت کو بڑی تیزی سے ترقی دی جائے ۔ پچھلے دنوں سے کام کی رفتار بہت سست رہی ہے ۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ احتجاج سے کام چلالیں گے مگر یہ بات غلط ہے ۔ میں جانتا ہوں کہ تم میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو میرے باپ کے زمانے سے کام کر رہے ہیں (اس نے یہ کہہ کر سوبیٹر کی طرف دیکھا) اب کام میں نے سنبھال لیا ہے ۔ میرا طریقہ کار بالکل صحیح ہے اور میں تم کو خوشحالی کی طرف لے جاؤں گا ۔ جو لوگ مجھے خوش آمدید کہیں گے میرے ساتھی ہوں گے اور مخالفوں کو تو میں کچل دوں گا ۔ " اس کی آنکھوں میں چمک آئی اور اس کی مونچھیں کچھ اور تاؤ کھانے لگیں ۔ اس نے کہا کہ آخر یہاں کا کوئی مالک ہے اور وہ میں ہوں ۔ میں خدا کے سامنے جوابدہ ہوں اور میں اپنے ضمیر کے تابع ہوں ۔ میں تم سے مشفقانہ برتاؤ کروں گا مگر یاد رکھو کہ تمہاری تمام باغیانہ سرگرمیاں بسود ثابت ہوں گی اور تم ناکام رہو گے ۔ (یہ کہہ کر اس نے اپنی نظریں سیاہ ڈاڑھی والے مشین مین پر گاڑ دیں ۔ جس کے چہرے کی کیفیات مشکوک تھیں)

ہم کو اپنے وطن کی ترقی کے لئے کام کرنا چاہیئے۔ اب تم اپنے کام پر واپس جا سکتے ہو۔"

تقریر ختم کر کے وہ اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے بیوی بچے اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے اور اس نے کمرے میں جا کر شراب نوشی شروع کر دی۔

جوزف روتھ

"ریڈسکی مارش"

جوزف رَوتھ (۱۸۹۴ء تا ۱۹۳۹ء) آسٹریا کا رہنے والا ایک ایسا مصنف تھا جس کے ناولوں میں یاسیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس کے باوجود کہ اس کا انداز ناقدانہ ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ آسٹریا اور ہنگری کی شہنشاہیت کے زوال کی داستان صاف طور پر اثر انداز ہوئی ہے۔ اس کا سب سے مشہور ناول "ریڈسکی مارش" ہے جو اس نے ۱۹۳۲ء میں لکھا تھا۔ جس میں اس نے آسٹریا کے ایک کُنبہ کی داستان لکھی ہے۔ اس کُنبہ کا نام "ٹروٹس" تھا۔ اس کا آخری آدمی جو بے حد دیانتدار تھا جنگ عظیم میں مارا گیا۔ جنگ سے پہلے جو زوال کی علامات آسٹریا میں نمودار ہوئی تھیں ان کو بھی مصنف نے سپردِ قلم کیا ہے۔ اس ناول کا جو حصہ پیش کیا جا رہا ہے وہ شہنشاہ فرانسس جوزف سے تعلق رکھتا ہے۔

"شہنشاہ ایک بوڑھا آدمی تھا اور وہ غالباً دنیا کا سب سے معمر شہنشاہ تھا۔ موت ہمہ وقت اس کے گرد منڈلاتی رہتی تھی۔ اس کے ہم عمر لوگوں سے میدان خالی ہو چکا تھا۔ مگر بوڑھا شہنشاہ ابھی تک اپنی باری کا منتظر تھا، اور خلاؤں میں گھورتا رہتا تھا۔ اس کے سر پر ایک بال بھی نہیں تھا۔ چہرہ پر جھرّیاں تھیں۔ کمر جھک گئی تھی۔ لڑکھڑاتا ہوا چلتا تھا۔ پھر بھی وہ بھرم رکھنے کے لئے اپنے آپ کو سیدھا، چست اور طاقتور ظاہر کرنے کی کوشش ضرور کرتا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں میں چمک اور رعب پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر سچ تو یہی ہے کہ وہ ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح تھا اور اسی کے ساتھ اس کی سلطنت کا سورج بھی غروب ہو رہا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ حقیقت کی

پردہ پوشی کر رہا تھا مگر اپنے وقار کی وجہ سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔

ایک مرتبہ جب اسے بخار ہو گیا اور سب لوگوں نے محسوس کر لیا تب بھی اس کے معالج نے اس سے جھوٹ بولا اور کہا کہ اسے کچھ نہیں ہوا ہے اور شہنشاہ نے کہا کہ "پھر تو سب ٹھیک ہے"۔ اگرچہ خود شہنشاہ کو معلوم تھا کہ اسے بخار ہے۔ مگر وہ معالج کو جھوٹا نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ابھی اس کی موت نہیں آئی ہے۔ بعض اوقات تو اس کی بیماری کا حال کسی کو معلوم ہی نہ ہوتا تھا اور اس کے برخلاف بعض دفعہ وہ تندرست ہوتا مگر بیماری کا بہانہ کرتا تھا۔ لوگ اسے مہربان سمجھتے تھے مگر وہ اس کے برعکس تھا۔ اس نے زندگی کے تجربوں سے یہ سیکھ لیا تھا کہ سچ بولنا بے وقوفی ہے۔ وہ لوگوں کو ان کی غلطیوں سے آگاہ نہیں کرتا تھا۔

●

رُوسی سرحد سے دس میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جسے زیڈ کہہ لو۔ یہاں بادشاہ آج کل مقیم ہے۔ نیچے چاروں طرف سرکاری مکانات ہیں۔ بادشاہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس کی مونچھوں کے بال بھی سفید ہیں۔ وہ شمال کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں کھڑا ہوا اپنے ملک کی وسیع سرحدوں پر غور کر رہا ہے۔ اسے یاد آ رہا ہے کہ آج سے بیس برس پہلے جب اس کے خلاف بغاوت کی گئی تو اس نے اس بغاوت کو کتنی آسانی سے کچل دیا تھا۔ وہ غور سے دیکھ رہا تھا کہ اس کی فوج کے سپاہی سرحدوں پر برابر پہرہ دینے میں مصروف ہیں۔ اس کو گذرا ہوا زمانہ یاد آ رہا تھا۔ اگرچہ وہ دن، تاریخیں اور سال یاد نہیں رکھ سکتا تھا مگر اسے واقعات اچھی طرح یاد تھے۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس کی رعایا میں سے کسی نے اس کی زندگی پر ایک کتاب لکھی تھی اور اس کتاب میں یہ بھی لکھا تھا کہ شہنشاہ رومان پسند نہیں ہے۔ مگر یہ بات بالکل غلط تھی۔ اس نے تو ہمیشہ اچھے مناظر اور خصوصاً سردی، گرمی اور برسات کی صبح سے لطف

حاصل کیا تھا۔ وہ یہ بھی سوچتا رہا کہ آخر لوگ اس کی بات کو کیوں نہیں سمجھتے۔ وہ اس کی مصلحتوں سے کیوں ناواقف رہتے ہیں، اور اسے معاً یہ خیال آیا کہ جس طرح خدا کی مصلحتوں کو انسان نہیں سمجھ سکتا اسی طرح ایک معمولی سپاہی ایک بادشاہ کی مصلحتیں نہیں سمجھ سکتا۔

سحر نمودار ہو رہی تھی اور اسی طرح کے خیالات کا سمندر موجزن تھا۔ شہنشاہ خدا کی قدرت، طاقت و جبروت پر غور کر رہا تھا۔ اس نے بے اختیار اپنے گھٹنے زمین پر ٹکا دئے اور دعا میں مشغول ہو گیا۔

کرٹ ٹکولسکی

"وطن"
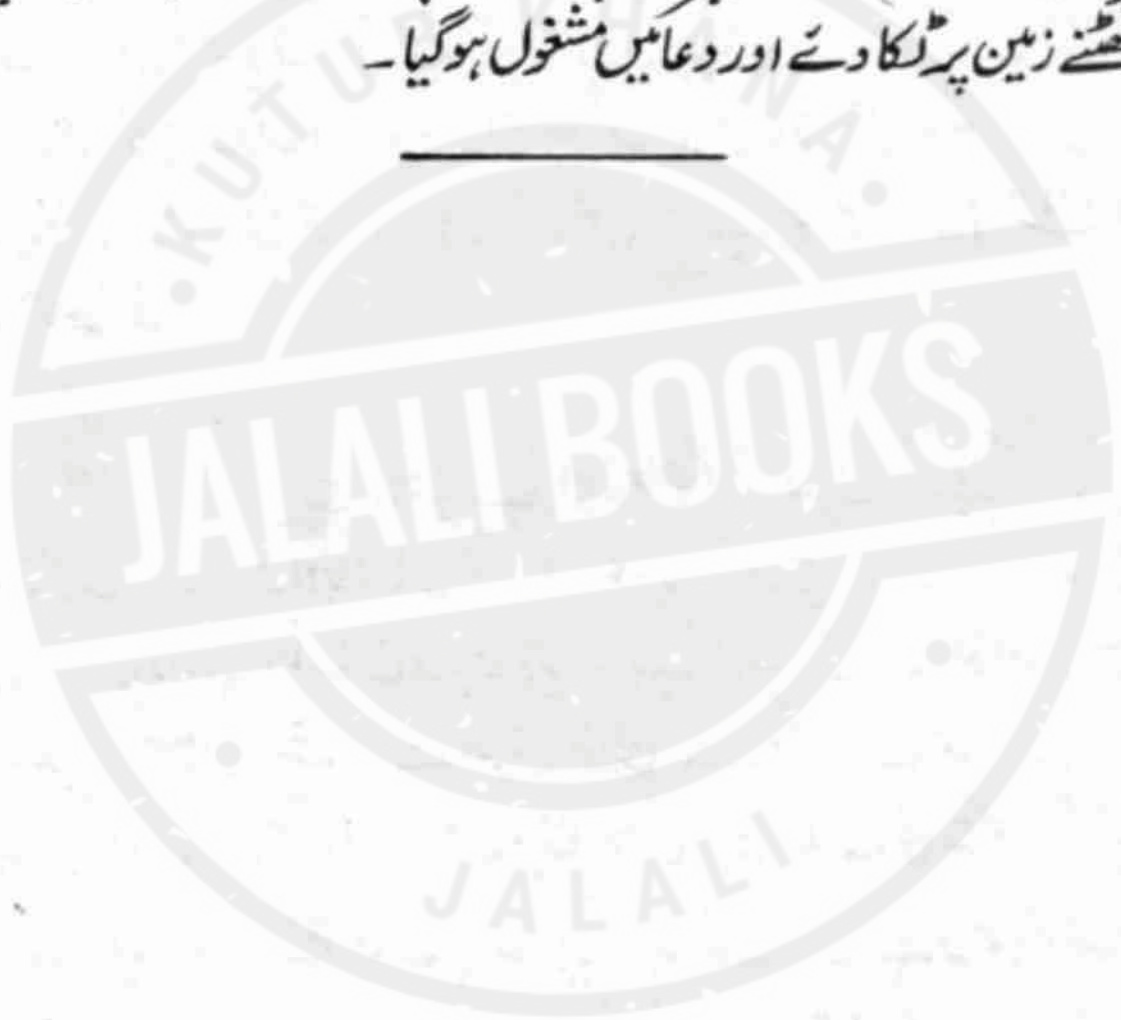
کرٹ ٹکولسکی (۱۸۹۰ء تا ۱۹۳۵ء) ایک بہت ہی ذہین ناقد اور ویمر کی ری پبلک کے زمانے میں سرمایہ داروں کے خلاف لکھنے میں مسلسل مصروف تھا۔ حالات سے پریشان ہوکر اس نے ۱۹۲۹ء میں وطن کو خیر باد کہا اور سوئیڈن چلا گیا جہاں وہ نیشنل سوشلزم کے لئے برابر لکھتا رہا۔ اس کا شاہکار "وطن" ہے جو اس نے ۱۹۲۹ء میں لکھا تھا۔

●

"یہ بات حیرت انگیز ہے کہ آخر لوگ صرف اپنے ملک کی سرزمین، ثقافت اور زبان کو کیوں عزیز رکھتے ہیں اور انہی کی شان میں کیوں رطب اللسان رہتے ہیں۔ جب کہ ساری دنیا خوبصورت مناظر اور حسین اشیاء سے بھری پڑی ہے۔ مگر جب ہم یہ بات کہتے ہیں، ہمارا دل اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ ہمیں اپنے ملک کی سڑکیں، دریا، نہریں، پہاڑ اور چشمے بہت پسند ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کو پہاڑ پسند ہیں تو دوسرے کو دریا اور تیسرے کو کچھ اور۔ وطن کے ہر ذرّہ میں ہمارا دل دھڑکتا ہے لیکن پھر بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو وطن کی محبت کے اعلان سے شرماتے ہیں۔ حالانکہ پورے ملک میں سے اگر ایک چپّہ زمین بھی ہماری ملکیت نہ ہو تب بھی ہم اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں اور فخر کرتے ہیں۔ ہم اس محبت کی سیکڑوں دلیلیں دیتے ہیں۔ اس کے باوجود چند وجوہات ایسی ہیں جو صرف ہمارے تحت الشعور میں

محفوظ ہیں اور ہمارے خون میں رچی بسی ہوئی ہیں۔

ہم اپنے وطن سے اس کی تمام خرابیوں اور نظامِ حکومت کی تمام برائیوں کے باوجود محبّت کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ قصرِ امارت کے چاروں طرف ہزاروں جھونپڑیاں موجود ہیں اور کسان بھوکے مرتے ہیں اور یہ قصر انہی کی مصیبتوں کی یادگار ہیں مگر پھر بھی یہ سب کچھ حسین و دلفریب ہے۔ ہمارے البم میں وہ کان جو وسطِ جرمنی سے شروع ہو کر شمال تک پھیلی ہوئی ہے، کس قدر دل کش اور حسین ہے۔

کیا ہم یہ بھول سکتے ہیں کہ بحیرۂ ردم کا پانی جرمنی کے کناروں پر کس قدر نیلگوں اور شفّاف ہے۔ ہم کو ہر نئے سال کی پہلی صبح کتنی مسرّت بخشتی ہے۔ ہم تو اپنے جنگلوں کے چھوٹے چھوٹے جوہڑ بھی نہیں بھولتے اور درختوں کی دلکشی بھی ذہن سے فراموش نہیں ہوتی۔ یہ صحیح ہے کہ جرمنی دنیا کی تمام سرزمینوں پر فوقیت نہیں رکھتا مگر یہ سرزمین ہماری ہے اور ہمیں اس کا اقرار کرنا چاہئے کہ ہم اس سے محبّت کرتے ہیں۔

اب میں آپ کو ایک اور بات بتاؤں اور وہ یہ ہے کہ صرف یہ قومی لیڈر اور سرمایہ دار جنہوں نے ہر چیز پر قبضہ جمایا ہوا ہے، یہ فوجی جو فولادی خود پہنے پھرتے ہیں اور دوسرے مرد اور عورتیں جو خاص اہمیت رکھتے ہیں، جرمنی نہیں ہیں۔ خود ہم بھی اس ملک کا ایک حصّہ ہیں اور ہم ہی "جرمنی" ہیں۔

وہ قومی لیڈر جو منہ پھاڑے چلاتے رہتے ہیں کہ "ہم قوم کے ہمدرد ہیں۔ ہم اس سرزمین سے محبت کرتے ہیں۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ اگر ہم اپنے ملک سے محبّت کرتے ہیں تو ہم کو

بین الاقوامی سطح پر سوچنا چاہیئے۔

یہ قومی لیڈر اس بات کے اہل نہیں ہیں کہ قوم اور ملک کی محبّت ان کی جاگیر بن جائے ۔ قوم اور ملک کے لئے کیا مفید ہے اور کیا مضر، ہم بھی جانتے ہیں۔ ہم کو بھی اس کا حق ہے۔ ہم ان سے بہتر زبان بولتے ہیں اور ان سے زیادہ جانتے ہیں۔اس ملک کے دریا، پہاڑ، اور جنگلات ایسے ہی ہماری ملکیت ہیں جیسے کہ ان کی ۔ ہم چاہے کمیونسٹ ہوں، سوشلسٹ ہوں یا فاشسٹ مگر ہم اس کا ایک حصّہ ہیں ۔ہمیں جھنڈوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہم تو سرزمین وطن سے محبت کرتے ہیں۔

قائدِ اعظم جناح

جی۔ الانا

مشہور شاعر، مفکّر اور ادیب جی۔ الانا اُن مسلم لیگی لیڈروں میں سے ہیں جنھوں نے قائدِ اعظم کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اُنھوں نے قائدِ اعظم کی اِس سوانح عمری میں اُن کی نجی اور عوامی زندگی کے اُن بے شمار گوشوں کو بے نقاب کیا ہے جن تک تا حال کسی کی رسائی نہ ہوئی تھی۔

قائدِ اعظم جناح — ایک عظیم قائد کی عظیم سوانح حیات ہی نہیں ایک ایسی قوم کی سرگزشت بھی ہے جس نے اپنے لیے ایک منزل متعیّن کی اور اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھی جب تک خود منزل نے آگے بڑھ کر اُسے گلے سے نہ لگا لیا۔

فیروز خان نون

ملک فیروز خان نوُن کی یہ خود نوشت سوانح عمری بیسویں صدی (نصف اول) کے برصغیر پاک و ہند کی ایک زندہ تاریخ ہے۔ جس میں اُنھوں نے اِس عہد کی پوری سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی کو سمو دیا ہے۔ تحریک آزادی اور جدوجہد پاکستان کا مطالعہ اس کتاب کے بغیر مکمل نہیں کہلایا جا سکتا۔ اندازِ بیان شگفتہ اور محاکاتی۔

بارہ نادر تصویریں۔

60۔ شاہراہ قائدِ اعظم لاہور